C E R T I F I C A T E

Certified that Mr. Fida Hussain Ansari

S/o Ronaque Hussain has carried out research on the Topic " NAWAB MAḤABBAT KHAN MAḤABBAT: AḤWAL-O-ĀṢĀR " under my supervision and that his work is original and distinct and his dissertation is worthy of presentation to the University of Sind for award of the degree of Doctor of Philosphy.

26.11.1989.

(Dr.Najmul Islam)
SUPERVISOR

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اب محبتؔ کی غزل سن کر خجالت سے بہت

رنگ اڑ جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

محبت

میر

نواب محبت خان محبت

احوال و آثار

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)

سندھ یونیورسٹی جام شورو ۱۹۸۹ء

نگراں

پروفیسر ڈاکٹر نجم الاسلام

مقالہ نگار

فدا حسین انصاری

(حوالہ نمبر NO,AC-I/522 مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۸۵ء)

ابتدائیہ

روہیل کھنڈ کی علمی و ادبی شخصیتوں میں سے ایک شخصیت نواب محبت خاں محبت کی بھی ہے۔ روہیل کھنڈ کی شاعری کے افق پر ابھرنے والے محبت خاں محبتؔ، اردو، فارسی، پشتو، عربی کے شاعر ہی نہیں بلکہ فارسی پشتو زبان کے لغت نویس بھی تھے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے نواب محبت خاں محبتؔ پر تحقیق کرنے کی ترغیب دلائی تھی۔ میں نے ابتدائی تیاری کے بعد استاد ذی محترم ڈاکٹر پروفیسر نجم الاسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ارادہ ظاہر کیا اور جنوری ۱۹۸۵ء میں میری تحقیق کا موضوع "نواب محبت خاں محبتؔ احوال و آثار" منظور ہوا۔

اس مقالے کے ابتدائی منصوبے سے لے کر تکملے کی منزل تک مجھے استاد گرامی کی جو رہنمائی حاصل رہی، اس سے نہ صرف مجھ میں تحقیقی شعور پیدا ہوا، بلکہ میں نے اور بھی بہت کچھ سیکھا۔ میں استادِ گرامی کا شکر گزار ہوں کہ جنکی علمی قابلیت اور ادبی بصیرت نے میرے موضوع کو تحقیقی اعتبار سے اہم بنا دیا۔

اس مقالے کے لیے سعید حسن قادری کے ذاتی کتب خانے، پشتو اکیڈمی پشاور، انڈیا آفس لائبریری لندن، بوڈلین لائبریری آکسفورڈ، غالب لائبریری کراچی، انجمن ترقی ادب کتب خانہ خاص کراچی، اردو لغت بورڈ کراچی اور قومی عجائب گھر کراچی کے مخطوطات سے استفادہ کیا گیا جسکے لیے ان اداروں کے ذمہ دار افراد کے علاوہ ان احباب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس سلسلے میں مجھ سے تعاون فرمایا۔

فدا انصاری۔ ۹، نومبر ۱۹۸۹ء

فہرست

بابُ اوّل

(۱) سوانح حیات و ابتدائی حالات

(۲) وفات محبت خان

(۳) محبت تذکروں میں

(۴) اساتذہ محبت

(۵) محبت کے مذہبی عقائد

نواب محبت خان محبتؔ

ابتدائی حالات و سوانح حیات

نواب محبت خان نام ۔ مظفر الدولہ شہباز جنگ خطاب اور محبت تخلص کیا کرتے تھے آپ روہ[1] (مضافات پشاور) میں سنہ ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئے آپکے والد حافظ رحمت خان کا جو روہیل کھنڈ کی تاریخ میں حافظ الملک مکرم الدولہ حافظ رحمت خان بہادر نصیر جنگ[2] کے نام سے مشہور ہوئے، سلسلہ نسب قیس عبدالرشید سے ملتا ہے ۔ اس طرح نواب محبت خان قیس عبدالرشید[3] کی اولاد میں سے تھے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں جو بدامنی اور ابتری پیدا ہوئی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کٹھیر[4] کے علاقے میں افغانوں نے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی[5] جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلائی نواب علی محمد خان اور مکرم الدولہ حافظ الملک حافظ رحمت خان نے اپنے مختصر دور میں حکومت روہیل کھنڈ کو استحکام بخشا اور سلطنت دہلی سے اس علاقے کی سندیں حاصل کیں۔ جس قصبے میں نواب محبت خان نے ہوش سنبھالا وہ آنولہ کے نام سے مشہور تھا جو تعلیم و تعلم کا گہوارہ تھا سینکڑوں دینی مدارس آنولہ میں موجود تھے، روہیل کھنڈ میں ۵ ہزار کے قریب علماء درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے دوسری جانب نواب محبت خان کے والد حافظ رحمت خان فتوحات کے سلسلے میں مصروف رہتے تھے لیکن انہوں نے نواب محبت خان اور اپنی دیگر اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا چونکہ وہ خود بھی ایک عالم و فاضل شخص تھے لہذا انہوں نے جہاں روہیل کھنڈ کی رعایا کی تعلیم کا بندوبست کیا وہاں انہوں نے اپنے بیٹوں کے لئے بھی آتالیق مقرر کیے[6]۔

---

[1] ہندی بھگوان داس: "سفینہ ہندی"، مرتبہ عطا کاکوی، پٹنہ، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، ۱۹۵۸، ص ۱۹۱ -

[2] بادشاہ دہلی نے حافظ الملک کی بہادری اور ان کے بادشاہ سے مراسم کی بناء پر خطابات سے نوازا تھا۔

[3] قیس عبدالرشید بنی اسرائیل سے تھے اس خاندان میں یہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے دین باطل کو چھوڑا اور اسلام میں داخل ہوئے انہوں نے دیدار مصطفےٰ کے شوق میں افغانستان سے مدینہ منورہ کا سفر طے کیا آپ کی شادی سارہ بنت خالد ابن ولید سے مدینے میں ہوئی جن کے بطن سے تین فرزند ہوئے ان افغانوں سے افغانی اپنا شجرۂ نسب ملاتے ہیں۔ سڑہ بن کا بیٹا سرغبون ہوا جس کا اسلامی نام شرف الدین تھا اس کا لڑکا بھڑیچ تھا۔ بھڑیچ کی اولاد میں نواب محبت خان ہوئے سلسلہ نسب یہ ہے نواب محبت خان ابن حافظ رحمت خان ابن شاہ عالم خان ابن محمود خان ابن دولت خان ابن بہول خان ابن داؤد خان ابن بھڑیچ خان ابن شرف الدین ابن سڑہ ابن قیس عبدالرشید ۔

[4] کٹھیر نامی راجپوتوں کی ایک قوم قنوج سے نکالے جانے کے بعد ۱۰۰۱ء میں یہاں آکر آباد ہوئی۔

[5] داؤد خان نے ملک روہ سے آکر کٹھیر میں قیام کیا اور یہاں خود مختار علاقہ قائم کیا داؤد خان نواب محبت خان کے دادا شاہ عالم خان کا غلام تھا۔

[6] نواب محبت خان کے بڑے بھائی نواب عنایت خان کے لئے جو اتالیق مقرر کئے گئے ان کا اسم گرامی مولانا حاجی محمد سعید خان تھا، انکے آباؤ اجداد افغانستان سے دہلی آئے تھے۔

محبت خان کی پرورش نازونعم سے ہوئی، ان کی والدہ حبیبہ خان کمال زئی یعنی ملک خداداد خان کی دختر تھیں جبکہ حافظ رحمت خان کی زوجہ ثانیہ تھیں۔ ان کے بطن سے حافظ رحمت خان کے تین صاحبزادے تولد ہوئے یہ عنایت خان، محبت خان اور عظمت خان تھے۔ ابھی یہ تینوں بھائی سن بلوغت کو نہیں پہنچے تھے کہ ان کی والدہ انتقال کر گئیں پھر ان کی پرورش حافظ رحمت خان کی زوجہ کلاں نے کی۔ نواب محبت خان کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جب آپ کی والدہ حقیقی حیات تھیں اس وقت بھی دوسری والدہ انہیں بہت چاہتی تھیں اور محبت کرتی تھیں۔ اس وقت ہی انہوں نے نواب محبت خان کو اپنی فرزندی میں لے لیا تھا اور انہیں انہوں نے فرزند خاص گردانا۔ حافظ رحمت خان کی زوجہ اول خان ابن شہزاد کی دختر تھیں ان کے بطن سے دو لڑکیاں موجود تھیں اس طرح پر دو دختر اور نواب محبت خان حقیقی بہن بھائی کہلاتے تھے۔ وہ نواب محبت خان کو ایک لمحے کیلیے بھی اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ نواب محبت خان کی تعلیم و تربیت میں کبھی مانع نہیں ہوئیں، وہ انہیں حافظ رحمت کی طرح صائب الرائے سردار بہادر اور شجاع جانشین پسند کرتی تھیں وہ خود بھی ایک قوی الجثہ پٹھانی تھیں جنکی بہادری[۲] کے واقعات نے انہیں ایک بہادر سردار کی بیوی ثابت کیا تھا۔ نواب محبت خان کی مادری زبان پشتو تھی انکے والد حافظ رحمت

---

[۲] حیات حافظ رحمت خان کے مطابق دوران سفر رات کے وقت دو چور کسی صورت سے خیمہ کی قنات چاک کر کے اندر آ گئے، ایک پلنگ پر حافظ الملک اور دوسرے پر بیگم صاحبہ آرام فرما رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ کی آنکھ کھل گئی فوراً ان کے پیچھے دوڑ پڑیں ایک چور تو قنات میں سے باہر نکل چکا دوسرا نکلنا چاہتا تھا کہ بیگم صاحبہ نے جھپٹ کر اسکی گردن پکڑ لی ہر چند تڑپا پھڑکا لیکن بھلا ان کی گرفت سے کب آزاد ہو سکتا تھا اسی دار و گیر میں حافظ الملک بھی بیدار ہو گئے یہ تماشہ دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوئے اور بمشکل بے چارے چور کو بیگم صاحبہ کے ہاتھوں چھڑا کر سپاہیوں کے حوالے کیا۔

اور دادا شاہ عالم خان پشاور کے علاقے[1] سے کٹھیر میں وارد ہوئے جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلایا۔ نواب محبت خان کا خاندان عُلماء و فضلاء کا خاندان تھا۔ فارسی ان کے گھر کی زبان بن گئی تھی کیونکہ اس دور میں دینی مدارس میں عربی اور فارسی تعلیم و تعلم کا ذریعہ تھیں۔ خود حافظ رحمت خان نے عربی اور فارسی میں علمائے عصر اور بزرگان دین سے بھرپور فیض حاصل کیا تھا۔ نواب محبت خان نے عربی اور فارسی میں اقتضائے زمانہ کے لحاظ سے بھی خاص طور پر توجہ دی تھی اور عربی اور فارسی میں پوری پوری دسترس حاصل کرلی تذکروں اور دوسرے شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب محبت خان عربی، فارسی پشتو اور اردو کے قادر الکلام شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شاعر گر تھے۔ گلستان رحمت کی یہ تحریر نواب محبت خان کی تعلیمی[2] قابلیت پر روشنی ڈالتی ہے۔

" برادر عینی عنایت خان مرحوم، ہمیں توجہ آنحضرت در علم کوی سبق از عالماں زماں ربودہ و در فارسی استاد استادان و برگزیدہ حلال محاورات عربی و کشاف مشکلات فارسی ذہن ذکا و طبع رسا بحدیست کہ بی شائبہ و رعایت اخوت امین ذرہ حقیر دیچگی از صغیر و کبیر ازین نوع شاہدہ نہ کردہ با وجود عدم توغل کتب عربی خدشہ نیست کہ کسی از ایشان پرسیدہ و جواب شافی نشنیدہ ہموار صاحبان استعداد ذات ازان جامع کمالات اثبات معانی اشعار مشکلہ و قصائد استاداں مثل قصائد عرفی و خاقانی و انوری و کاتبی و عبد الواسع جبلی و غیر آں مینمایند و آن طبع مصور و ذہن مجسم بطریق الہام بی تامل و تسایل معانی متعلقہ را بخوبی بآسانی بیاں می فرماید نجی طبعان و کند سوادان باستماع آن پی بمغز سخن بردہ لذت حلاوت آن بمذاق جان در می یابند۔ از ابتدائی طلوع صبح تمیز طبع موزوں از خصائل فطرت سلیم ایشانست در عربی اشعار بسیار دارند "

---

[1] محبت خان کے آباؤ اجداد " روہ " یعنی پہاڑی علاقے کے رہنے والے تھے ضلع مردان پشاور۔ بس موضع طور شہباف پور ایک تاریخی گاؤں ہے جہاں پر نواب محبت خان کے والد حافظ رحمت خان کی پرورش ہوئی۔

[2] نواب مستجاب خان : " گلستان رحمت " قلمی، ص۔ ۵۱۱

سید الطاف علی بریلوی مرحوم "حیات حافظ رحمت خان" میں رقمطراز ہیں:-

"نواب محبت خان" حافظ رحمت خان کی توجہات سے علوم عربیہ میں بکثرت علماء سے گوئے سبقت لے گئے تھے، فارسی میں استادوں کے استاد تھے نیز سنسکرت میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ذہین وذکا وطبع رسا میں عدیم النظیر تھے اہل استعداد ہمیشہ ان سے اساتذہ متقدمین کا کلام سمجھنے آتے تھے" اردو فارسی اور سنسکرت میں ان کا ماہر ہونا تحیر خیز اس لئے بھی نہیں کہ نواب محبت خان کی پیدائش اس دور او راس علاقے میں ہوئی جب فارسی زبان ذریعہ تعلیم تھی اور اردو زبان ترقی کے مدارج طے کر رہی تھی جبکہ سنسکرت ہندوستان کے علاقے کی قدیم زبان تھی، پشتو ان کی مادری زبان تھی اور وہ اس زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ علاوہ ازیں انکی پشتو دانی اور فارسی دانی کی بہترین مثال "ریاض المحبت"[1] ہے۔ یہ ایک پشتو اور فارسی لغت ہے۔ انھوں نے پشتو اور فارسی دیوان بھی ترتیب دیئے تھے[2] ایک اور اردو "مثنوی "سسی پنوں" بھی ان کی یادگار ہے ان کی ان تخلیقات پر سیر حاصل بحث آئندہ ابواب میں کی جائے گی۔

---

(۱) پشتو کے ۱۲۱۴ الفاظ کی فارسی میں تشریح کی ہے۔

(۲) فارسی دیوان نہیں ملتا۔ چند تذکروں میں فارسی اشعار موجود ہیں۔
پشتو دیوان بوڈلین لائبریری لندن میں موجود ہے۔

احوالِ شادی

خاندان حافظ رحمت خان کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کی شادی دھوم دھام سے کرتے تھے جبکہ اپنی بیٹیوں کی شادیاں خاموشی سے سرانجام دیتے تھے۔ نواب محبت خان کی بیٹیوں کا عقد کبھی دن کے وقت نہیں ہوا اور لڑکیوں کے عقد کے میں چند مخصوص اشخاص اہل خانہ و خاندان کے لوگ شریک ہوتے تھے اور جہیز وغیرہ کی نمود و نمائش کرتے تھے۔ نواب محبت خان کے بڑے بھائی عنایت خان کی شادی کے بارے میں گلستان رحمت میں تفصیلی بیان موجود ہے[1] ارادت خان، حافظ محمد یار خان کی شادیوں کا احوال اسی انداز میں گلستانِ رحمت میں موجود ہے[2]۔ نواب محبت خان اور انکے چھوٹے بھائی محمد دیدار خان عرف منگل خان کی شادیاں ساتھ ہی انجام پائی تھیں۔ گلستان رحمت صفحہ ۲۱۳ پر ہے کہ "در سال

یکہزار و صد و ہشتاد و سہ مطابق بست سیوم سال فرخ فال آنحضرت حیث جشن کدخدائی تازہ نہال حدیقۂ بہجت و کامگاری و نورس ثمرہ حشمت و بختیاری محبت خان و دیدار خان المشہور بہ منگل خان بلند آوازہ گشت ازدواج محبت خان با صبیہ عبدالستار خان ولد صدر خان کمالزئی و کتخدائی محمد دیدار خان با دختر نیک اختر محمد میر خان بابر کہ حقیقت کشتہ شدن او از دست انگریزان در پٹنہ سابق گزارش یافت مقرر شد بطریق سال گزشتہ باحضار سرداران ملک کشمیر حکم عالی شرف صدور یافت و ہمہ ارکان و سرداران حسب الطلب بحضور شتافتہ در بریلی متوقف شدند و آنحضرت بعد اطلاع آن از بریلی بجہت بکوکیہ تمام تشریف ارزانی فرمودند و تخت بجہت انصرام ازدواج محمد دیدار خان از بریلی متوجہ موضع میر گنج کہ دوازدہ کروہ از بریلی مسافت دارد محمد میر خان بابر بنام خود آباد کردہ و در آنجا سکونت اختیار کردہ بود و در انجا قولست شدند و بگونا گوں شکوہ و عظمت بروز دوم ظاہر موضع مذکور محل رایات عالیات گشت صبح آن بموجب حکم عالی کاربرداران سرکار معلی آلات آتشبازی و باغات روشنی از لشکر تا حویلی محمد میر خان مرحوم مرتب ساختند و بعد فراغ نماز عشاء آنحضرت بطریق معمولی با چندی از

---

[1] نواب مستجاب خان ابن حافظ رحمت خان: گلستان رحمت، قلمی، ص - ۱۸۹

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 ص - ۳۰۷، ۳۰۶

شاگرد پیشه و خدمتگاران خاص زینت افزای حویلی محمد میر خان شوند و پسران و سرداران و دیگر رساله داران
خورد و بزرگ در رکاب خداوندزاده خود بآئین تمام و تزک بیرون از احاطهٔ کلام روانه شدند و ارباب نشاط از زن و مرد
فوج فوج و گروه گروه برخی بر تخت رواں و بعض بر اسپان پیش پیش هنگامه آرای نغمه و سرود گشتند صدای مسرت
افزای این جشن طرب پیرا از ولولهٔ نقاره اگر تا بگوش گردون رسیده و گلبانگ تهنیت و مبارکباد این طوبی
بجهت تاثیر از صفیر دلپذیر جلاجل و نفیر در دماغ دوران شمه اکبر از غلبهٔ آتشبازی و افراط روشنی از خامه بنام
درآید مصرع قلم در دست سوز و آتش از دختر شود پیدا بالجمله بدین و شان و شکوه در حویلی میر محمد خان داخل شده
مجلس ازدواج انعقاد یافت علی الصباح آن عروس حجلهٔ بخت را بدایرهٔ دولت رسانیدند و آنحضرت از آنجا معاودت فرموده
بریلی داخل شده برای تقویم شادی محبت خان عازم آنوله که مسکن عبدالستار خان بود شدند و ظاهر شهر مرکز دایرهٔ
دولت گشت ساعت سعید از خیام گردون احتشام شود بنفس اقدس با چندی و مخصوصان بیشتر داخل حویلی
عبدالستار خان گشتند و حکمت در پیش رفتن آنحضرت آن بود که آن ذات معلی صفات زهدیات و ورع تقوی از استماع
سماع نامشروع اجتناب مهبور زیدند و نظر اطهر بر لولیان و طوایف نمی افگندند چون از اطلاع این جشن باکه
مکرر و متواتر گردید از اطراف و اکناف عالم لولیان و رقصان و سازنده و نوازنده جمع آمده بودند آری وجود ایشان
دراین چنین وقت ناگزیر است اگرچه آنحضرت خود متوجه سماع و رقص ایشان نمیشدند لیکن همین دوم رعایت
عنایت خان بهادر و دیگر پسران آنحضرت پسران و سرداران بزم عشرت و نشاط آراسته پیراسته میداشتند و سوای
مجلس بزرگ در هر دیره و خیمه یکیک رساله دار جمعدار جدا جدا بموجب حکم عنایت خان بهادر مجلس سماع و رقص انعقاد
می یافت در وظیفه و انعام لولیان و رقصان و سازنده و نوازنده روزانه سرکار عالی میر سید حاصل کلام بعد تشریف
برون آنحضرت شمع شبستان امارت سرو بوستان عظمت عنایت خان بهادر و جمیع ناموران و سرداران آن نوشه
عروس بخت و دولت را پس از سه روز ایکپاس شب بر فیل نشانده در کمال شوکت و احتشام از خیام فلک
احترام متوجه شهر شدند کوس شادی غلغله در زمین و زمان انداخت و جهان جهانیان را شادمان ساخت
چراغان روشنی بر درش عالی گلگل شگفته روشنی افزایی زمین و آسمان گشت و آتشبازی از نوید شادی

سرفرازی یافتہ پر سرِ سپہر دراز نظارگیان کردید

بیت :- تماشای آتشبازی و دود چراغان —— گل و سنبل ہوا را در گریبان

آبادی علوی و ابیات سفلی زبان بمبارک باد گویا ساختند و خلائق از برنا و پیر بگفتن آمین پرداختند عروس دنیا از حسرت شوہری این نوشہ جوان زن سپہر نا طورہ دولت بتمنائی ہمخوابی آن داماد بیدار طالع درشبگیر بالجملہ بدان شوکت بنیابت در احتشام تمام در حویلی عبدالستار خان داخل شدند و رو بروی آنحضرت قاضی القاضات و علماء و سادات تمہید و قواعد عقد نمودند و قریب جسم ہودج برای عزت و تمتق آرای عفت عظمت سرا داخل شد روز دوم بسزاران خرمی و خرسندی بجانب بریلی بجمعیت منضبط فرمودند باآرام و آہستگی تمام رونق بخش آن شہر کرامت بحر کردیدہ ابواب ایثار و نثار بر روی خلائق مفتوح کردانید جہان را ببذل و احسان و انعام بیکران مالامال ساختند و بطریق معہود و بکام روای خاص و عام و اصاغر و اکابر پرداختند"

۱۱۸۳ھ میں محبت خان محبت کی شادی خانہ آبادی نہایت دھوم دھام سے آنولہ میں انجام پائی۔ بے شمار سرداروں اور احباب کے ساتھ حافظ الملک حافظ رحمت خان محبت خان کی بارات لے کر عبدالستار خان کمالزئی کی حویلی میں داخل ہوئے۔ حافظ رحمت چند مخصوص اشخاص کے ساتھ عبدالستار خان کی حویلی میں بارات سے پہلے پہنچ گئے تھے کیونکہ آپ رقص و سرود کی محفلوں سے اجتناب کرتے تھے، اس لئے آپ اس عام جشن میں شریک نہیں ہوئے جو عنایت خان[1] نے اپنی ریاست میں منعقد کیا تھا۔ اس جشن شادی میں خوبصورت رقاصاؤں نے محفل نغمہ و سرود میں سازندوں کے ساتھ مل کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ عنایت خان اور دیگر سرداروں نے ان مظاہرین فن کو بیش بہا انعامات سے بھی نوازا۔ اس تقریب سعید کے موقع پر پورے شہر بریلی اور آنولہ کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا چراغوں کی روشنی سے رات میں بھی دن کا سماں معلوم ہوتا تھا۔ اس جشن کے موقع پر آتشبازی کا وہ

---

[1] نواب محبت خان کے حقیقی بڑے بھائی جو اس وقت حاکم بریلی تھے۔

مظاہرہ ہوا کہ زمین سے تا آسمان روشنی ہی روشنی پھیل گئی نہایت شوکت واحتشام سے محبت خان کی شادی کی رسومات بخیر اختتام کو پہنچیں ۔

سلہ شادیوں کے موقع پر حافظ رحمت خان کے خاندان میں محل خاص کی بیگمات کی مجالس عموماً نصف شب تک رہا کرتی تھیں اسکے بعد جب بیگمات وہاں سے اٹھ کر آرام کرتی تھیں تو خادمائیں تقسیم کے بعد بچی ہوئی الائچی اور سپاری وغیرہ جمع کر لیتی تھیں یہ سامان اس کثرت سے ان کے پاس جمع ہو جاتا کہ اس کی قیمت سے پختہ عمارتیں اور طلائی زیورات بنواتی تھیں ۔ لڑکوں کی شادی کے مواقع پر ہندو مسلمان غریب وامیر اہل شہر کی دعوت ہوتی سرداروں اہل سپاہ اور ملازموں کی تعداد ایک لاکھ تک ہو جاتی جنھیں ایک ایک ماہ تک مہمان رکھتے ۔

محبت خان کے بھائی ارادت خان کی بارات شاہ پور سے واپس آئی راستے میں کھانے پینے کا سامان لے جانے کی اجازت حافظ رحمت خان نے دے دی اہل لشکر اور تمام اہل شہر نے کھانے پینے کا سامان لیا لیکن اس کے باوجود شام کے وقت پانچ ہزار بھیڑ بکریاں کئی سو من آٹا، چاول، دال، گھی، شکر وغیرہ بچ رہے ۔

دیگر شادیاں و احوال ازدواج

نواب محبت خان کی دوسری شادی عبدالوہاب خان رسالدار کی دختر سے ہوئی اس سلسلے میں نقش سلیمانی کے الفاظ یہ ہیں " الحاصل بریلی میں پہنچ کر پس از چند روز گفتگو عقد ظہور میں آئی عبدالوہاب خان نے یہ کہا کہ رامپور میں تشریف لے چل کر عقد کیجیے میں بغیر نکاح ہوئے اپنی دختر کو ہرگز بریلی نہ لاؤں گا۔ نواب محبت خان نے بوجوہات چند رامپور جانے سے انکار کیا کہ میں وہاں نہیں جا سکتا آخر کار بعد گفت و شنید بسیار یہ بات قرار پائی کہ نواب صاحب کی طرف سے کوئی وکیل تلوار و رومال نواب صاحب کا لے کر جائے وعقد نواب صاحب کے نام پر بند ہوا کر عروس کو رخصت کرا لائے چنانچہ اس امر پر عبدالوہاب خان بھی رضامند ہوئے پس مولوی الطاف رسول صاحب نواب محبت خان کی طرف سے رامپور جا کر صبیہ عبدالوہاب خان کو نکاح بریلی میں رخصت کرا لائے "[1]

ازواجِ محبت خان میں دو محل اور چند ڈیوڑھیاں کسی قدر معزز اور کچھ زنان غیر منکوحہ خواصیں وغیرہ تھیں[1] ۔ محبت خان کی پہلی بیوی دختر عبدالستار خان کمالزئی کے بطن سے ایک فرزند حافظ رحمت خان کی حیات ہی میں تولد ہو کر صغیر سنی میں انتقال کر گیا بعد ازاں انکے بطن سے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی[2] نواب صاحب کی دوسری بیوی دختر عبدالوہاب خان رسالدار والدہ ماجدہ محمد اسحاق خان[3] جن کے گھرانے میں حافظ رحمت خان کے خاندان سے رشتہ داریاں ہوتی چلی آئی تھیں[4] انکے بطن سے بھی ایک فرزند تولد ہوا تھا جس

۱؎ سلیمان خان اسعد نبیرۂ محبت "نقش سلیمانی" مطبوعہ ٹونک ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء ، ص - ۱۲۲

۲؎ زوجہ اول کو محل کلاں اور زوجہ ثانی کو نیا محل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جبکہ ان کے بعد کی ازواج کو سوئم ، چہارم ڈیوڑھی کے نام دیئے جاتے ہیں -

۳؎ نقش سلیمانی کے مولف سلیمان خان اسعد کے والد کا نام محمد موسیٰ خان تھا جو محبت خان کے فرزند تھے .

۴؎ دو دختران خاندان حافظ رحمت خان کی بھی عبدالوہاب خان کے اعزا میں بیاہی گئی تھیں . نواب محبت خان کی ایک دختر امجد حسن خان سے دوم دختر نواب ذوالفقار خان کبیر شاہ خان ابن سیف الدین خان سے بیاہی گئی تھیں -

کا نام عبد اللہ رکھا گیا یہ بھی صغیر سنی میں انتقال کر گیا تھا ان بی زوجہ نیا محل کے بطن سے محمد موسیٰ خان تولد ہوئے۔ بجز ان کے اور کوئی اولاد انکے بطن سے نہیں ہوئی نواب محبت خان کی تیسری بیوی سوم ڈیوڑھی کے نام سے مشہور ہوئیں جو صاحب اولاد تھیں، چہارم ڈیوڑھی فرخ آباد سے تعلق رکھتی تھیں اور پنجم لکھنؤ والی ڈیوڑھی تھیں۔ چہارم و پنجم یعنی فرخ آبادی اور لکھنوی بیوی سے نواب محبت کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ نواب محبت خان کی چھٹی بیوی خانم صاحبہ کے نام سے مشہور ہوئیں، یہ بھی صاحب اولاد تھیں نواب اکبر علی خان[1] خلف کلاں نواب محبت خان انکے ہی بطن سے تولد ہوئے نواب محبت خان کے ان بیگمات سے اٹھارہ فرزند اور ۱۲ دختران یادگار ہیں نواب محبت خان کی ایک اور شادی کے بارے میں خاندان حافظ رحمت خان میں سنا جاتا رہا ہے لیکن تاریخ کی کتب اس سلسلے میں خاموش ہیں "حیات حافظ خان کے حواشی میں درج ہے۔[2] "برقی نامی نہایت خوبصورت طوائف عظیم آباد یا مرشد آباد سے بخیالِ ملازمت نواب وزیر اودھ وارد ہوئی وہابھی تک نواب صاحب تک نہ پہنچی تھی کہ عنایت خان[3] بہادر کی نظر اس پر پڑی طوائف سمجھ کر اس کو طلب کیا تو اس نے حاضر ہونے سے انکار کیا اور کہلا بھیجا کہ میں نواب وزیر اودھ کی ملازمت کے لئے آئی ہوں وہ پٹھان مجھے کیا نوکر رکھے گا لاکھ روپے سے کم پر ملازمت نہ کروں گی یہ جواب سن کر نواب عنایت خان نے فوراً مبلغ ایک لاکھ روپیہ بھجوا کر اپنے ملازموں سے کہا کہ ابھی اس کو اپنے ساتھ لے کر آؤ چنانچہ کار پردازان عنایت خان نے ایسا ہی کیا۔ وہ عورت عنایت خان کی یہ سیر چشمی دیکھ کر نہایت راضی اور خوش ہوئی چونکہ نواب عنایت خان بھی وجیہ و شکیل جوان تھے اس نے پھر ان کی مفارقت گوارا نہ کی، عقد کر کے گھر بیٹھ رہی۔ نواب عنایت خان اور حافظ الملک کی وفات کے بعد محبت خان بہادر نے بہ خیال دور اندیشی اپنا عقد اس نیک بخت سے کر لیا۔ نواب صاحب موصوف کے کوئی اولاد اسکے بطن سے نہیں ہوئی۔"

---

[1] نواب محبت خان کا سلسلہ نسب جو حیات حافظ رحمت خان میں دیا گیا ہے اس میں یہ نام علی اکبر خان تحریر ہے جبکہ نقش سلیمانی صفحہ نمبر ۱۲۳ پر اکبر علی خان اور اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۲ پر علی اکبر خان تحریر ہے۔

[2] حواشی سید الطاف علی بریلوی: "حیات حافظ رحمت خان"، ص۔ ۱۵۹ - ۱۶۰

[3] نواب محبت خان کے حقیقی بڑے بھائی۔

صوبیدار و جاگیردار متعلقات بریلی

نواب محبت خان نواب عنایت خان کے چھوٹے بھائی تھے نواب عنایت خان کو حافظ الملک نے بریلی کا حاکم مقرر کردیا تھا نواب محبت خان اور نواب محمد دیدار خان عرف منگل خان کی شادیوں کے موقع پر جو کہ سالطو انجام پائیں تھیں انکے بڑے بھائی نواب عنایت خان نے اپنی ریاست میں خوب دھوم دھام سے اپنے بھائیوں کی شادیوں کی تقریبات منعقد کی تھیں۔ روہیلکھنڈ کی تیسری تقسیم کے وقت حافظ رحمت خان نے بریلی کو اپنا دارالحکومت مقرر کرکے اپنی ایک بیوی اور بیٹے عنایت خان کو وہاں کے قلعے میں مقیم کر دیا تھا۔ حافظ رحمت خان کی خواہش پر نواب فیض اللہ خان[1] بھی بریلی میں رہتے تھے۔ جنگ پانی پت میں بھاؤ کا قتل نواب عنایت خان سے ہوا تھا۔ اس جنگ میں انھوں نے بہادری کے جوہر دکھائے تھے لہذا احمد شاہ درانی نے خطاب نوابی اور نوبت وعلم دیا تو ایک شہر میں دو نوبت بجنے لگیں۔ نواب عنایت خان سخت جوشیلے شخص تھے انہوں نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ فیض اللہ خان کی نوبت بند کردیں اور نقاروں کو پھاڑ ڈالیں لہذا ان کے ملازمین نے ایسا ہی کیا فیض اللہ خان نے اس توہین آمیز سلوک کی شکایت حافظ الملک سے پیلی بھیت جاکر کی حافظ الملک نے فیض اللہ خان کو آئندہ رام پور رہنے اور نوبت بجوانے کی اجازت مرحمت فرمائی اسطرح وہ رام پور آگئے۔ اس وقت سے وہ اپنی علیحدہ ریاست کی بنا ڈالنے کی فکر میں رہے۔ نواب عنایت خان کے انتقال کے بعد نواب محبت خان ہی صوبیدار بریلی مقرر کئے گئے ہونگے اور بریلی میں انہیں جاگیریں عطا کی گئی ہوں گی۔

نقش سلیمانی صفحہ ۲۸۸ کی تحریر ہے "۱۲۲۳ھ میں جب انتقال نواب محبت خان کا لکھنؤ میں

۱۔ نواب فیض اللہ خان نواب علی محمد خان کے بیٹے تھے جو اپنے بڑے بھائی عبداللہ خان کے ساتھ ضمانت کے طور پر شاہ درانی کے پاس چند سال قید رہے۔ افغانستان میں قید کے دوران ہی ان کے والد نواب علی محمد خان کا انتقال ہو گیا تھا

۲۔ ز شمشیر عنایت خان دوراں جنگ ۔ اجل گفتا سر بھاؤ تراشہ (نقش سلیمانی کے مطابق بھاؤ کا قتل عنایت خان سے ہوا)

۳۔ حافظ الملک نے فیض اللہ خان کی شکایت سن کر کہا "ہاں وہ جوان مرگ ایسا ہی خود سر ہو گیا ہے"

میں ہوا تو والدہ صاحبہ نواب احمد علی خان مرحوم کی کہ وہ دوندے خان بہادر بہرام جنگ کی پوتی تھیں اور دوندے خان بہادر حافظ الملک بہادر کے چچازاد بھائی تھے بہ رسم تعزیت بریلی میں پاس زوجہ کلاں نواب محبت خان کہ وہ بوجہ ناموافقت نواب صاحب مرحوم کے بریلی میں قیام رکھتی تھیں اور چالیس روز تک وہیں رہیں"

اس تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نواب محبت خان لکھنؤ میں تھے اس وقت بھی ان کی زوجہ کلاں بریلی میں رہیں ممکن ہے وہ لکھنؤ نہ جانا چاہتی ہوں البتہ ان کا قیام پہلے ہی سے وہیں یعنی بریلی ہی میں تھا لہذا نواب محبت خان کو بریلی کا حاکم مقرر کیا ہوگا۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ نے بھی اپنے تذکرے گلشن بے خار میں تحریر کیا ہے کہ " نواب محبت خان بریلی اور اسکے متعلقات کے جاگیردار تھے"

سفینۂ ہندی صفحہ ۱۹۱ میں درج ہے " خلف نواب حافظ الملک حافظ رحمت خان بہادر مرحوم اند کہ مالک بریلی وغیرہ بودند"

تذکرہ سراپا سخن کے مطابق " نواب محبت خان شہباز جنگ مرحوم خلف حافظ الملک حافظ رحمت خان صوبیدار باشندہ بریلی مقیم لکھنؤ"

مظفر الدولہ شہباز جنگ کا خطاب

شہزادہ مرزا جہاندار شاہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں کسی ناراضگی کے سبب دہلی سے لکھنؤ[۱] تشریف لائے آصف الدولہ نے انکا استقبال کیا۔ شہزادہ صاحب سید شاہ خواجہ حسین صاحب سے کمالِ اعتقاد و محبت رکھتے تھے سید موصوف بھی شاہزادہ صاحب کی خدمت میں اکثر جایا کرتے تھے اسی سبب سے نواب آصف الدولہ اور سید صاحب کی ملاقات ہوئی۔ نواب آصف الدولہ بھی سید صاحب سے اچھا سلوک کرتے تھے شہزادے نے سید خواجہ حسن صاحب کی معرفت نواب محبت خان کو یاد فرمایا جب نواب محبت خان شاہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئے شہزادے نے دوران ملاقات خوشی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور نواب محبت خان سے بہت متاثر ہوئے انکی تعریف و توصیف کی اور یہ خطاب مظفر الدولہ شہباز جنگ سے نوازا اور نواب محبت خان سے کہا کہ وہ بغرض ملاقات حاضر ہوتے رہیں اسی اجازت کے بعد نواب محبت خان اکثر شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے ایک دن شہزادے نے تخلیئے میں نواب محبت خان سے کہا شاہ عالم نابینا ہو چکے بس میں اب یہ چاہتا ہوں کہ ان کو قید کر کے تخت پر بیٹھ جاؤں تم چار ہزار افغان مہیا کر دو انشاءاللہ بعد کامیابی تمہارے ساتھ اچھا سلوک ہوگا اور وزارت عطا ہوگی لیکن نواب محبت خان اس کمک کیلئے راضی نہ ہوئے[۲]

---

[۱] دہلی دربار کی سازشوں کی وجہ سے شہزادہ جہاندار شاہ اپریل ۱۷۸۴ء میں دہلی سے بھاگ کر عہدِ آصف الدولہ میں لکھنؤ پہنچے۔

[۲] نواب محبت خان نے شہزادے کی بات بازی طفلانہ سمجھی البتہ دوراندیشی کے خیال سے اپنے بھائی نواب دیدار خان سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ دیدار خان ایک بزرگ شاہ جھنڈا صاحب مجذوب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے انہوں نے شاہ صاحب سے اس بات کا ذکر کیا اور رائے لی، شاہ موصوف نے اپنی بڑ میں دو تین مرتبہ کہا "ایں بادشاہ شطرنج است دو اسپ و دو فیل دارد باقی ہیچ نیست" شاہ صاحب سے یہ بات سن کر نواب دیدار خان واپس آئے اور نواب محبت خان سے یہ الفاظ بیان کیے۔ لہذا نواب محبت خان نے شہزادے سے کہا کہ آپ چلیں میں روہیلوں کو حسب الحکم طلب کر کے اور سامان درست کر کے حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن نواب محبت خان ہنس گئے۔ شہزادے نے شاہ عالم کو گرفتار کرنے کیلئے لشکر کشی کی لڑائی ہوئی لیکن شہزادہ شکست کھا کر واپس دربار لکھنؤ آئے تو اس حالت میں کہ "با دو اسپ و دو فیل" پھر لکھنؤ سے بنارس گئے اور وہیں اپنی اولاد کے ساتھ قیام پذیر ہو گئے۔ (نقشِ سلیمانی) ص-۱۲۹

کٹرہ میراں پور کی جنگ میں شمولیت

شاہ جہاں پورہ کے نزدیک کٹرہ میراں پورہ کی جنگ شجاع الدولہ اور انگریزوں کی مشترکہ فوج سے حافظ الملک حافظ رحمت خان روہیلہ کے درمیان اپریل ۱۷۷۴ء میں لڑی گئی اس جنگ میں اپنے دوسرے چند بھائیوں کے ساتھ نواب محبت خاں بھی شریک تھے، نواب عنایت خاں کا انتقال ہو چکا تھا اور روہیلکھنڈ کے حالات تبدیل ہو چکے تھے، شجاع الدولہ جس کا حافظ رحمت خان نے ہمیشہ ساتھ دیا تھا ان سے آنکھیں پھیر چکا تھا اور ان کے خلاف میدان جنگ میں نبرد آزما تھا لیکن حافظ رحمت خان بھی میدان چھوڑنے والے نہیں تھے وسائل کی کمی کے باوجود حافظ رحمت خان اور انکے ساتھیوں نے بہادری کا مظاہرہ کیا۔
جنگ شروع ہونے سے قبل نواب محبت خاں نے اپنے والد کی خدمت میں حاضری دی۔ گلشن رحمت کے مطابق:۔

"بروز جمعہ دہم صفر کہ محبت خاں بشرف سلام مشرف شد فرمودند کہ فکر خود کردیم شما ہا
آنچہ مناسب بنظر درآید بعمل آرید محبت خان کہ از معاملہ آں درویش اطلاعی نداشت دانست
چندی مکر جنگ کردہ اند عرض نمود کہ آنحضرت آنچہ تدبیر بعمل خواہند آورد ہمیں خواب خواہد بود
درہمیں روز صالح محمد توشکچی قبل از نماز ظہر پوشاک خاصہ حاضر ساخت چہ میدانست کہ آنحضرت
بروز جمعہ پس از غسل تبدیل پوشاک میفرمودند ایں طریق معمول آنحضرت بود چوں
آنحضرت از بستر استراحت برخاستند صالح محمد برائے غسل و تبدیل پوشاک عرض نمودند
کہ انشاء اللہ تعالیٰ فردا غسل و تبدیل پوشاک خواہم کرد"

---

۱ حیات حافظ رحمت خان میں گل رحمت، گلستان رحمت، تاریخ سلیمانی اور تاریخ اخبار حسن کے حوالے سے مذکور ہے کہ جنگ سے قبل ایک اجنبی درویش حافظ رحمت خان سے ملا اور اس نے کہا کہ میرے پیر و مرشد اسی جگہ سکونت رکھتے ہیں انہوں نے مجھے آپ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ہندوستان روانگی کے وقت میں نے آپ کو علاقہ روہیل کھنڈ کی حکومت کی خوشخبری سنائی تھی جو عمل میں آگئی اب فتح یا شہادت دونوں میں سے ایک امر کو قبول کر لیجیے تاکہ اس کے واسطے درگاہ حق تعالیٰ میں دعا کی جائے کیونکہ یہ امر ہنوز خدائے تعالیٰ کے حکم سے قضائے معلق کے طور پر ہے، حافظ الملک نے درویش سے دریافت فرمایا، اگر میں فتح مانگوں تو اس کے بعد مجھے شہادت نصیب ہوگی یا نہیں درویش نے جواب دیا نہیں۔ امیر حافظ رحمت خان اپنی اولاد کا معاملہ خدا کے سپرد کرکے شہادت کے خواہاں ہوئے اور انہیں شہادت نصیب ہوئی تفصیل کیلئے دیکھیے حیات حافظ رحمت خان صفحہ ۲۲۱، ۲۳۲ -۲۳۳

حافظ رحمت خان نے محبت خان کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا[1] "ہم تو اپنا بندوبست کر چکے آئندہ تم کو ان سب امور کا کر جو، ہم تم سے اس وقت کہتے ہیں لحاظ رکھنا چاہیے نواب محبت خان نے بچشم پرآب عرض کیا کہ حضور کو بڑے بڑے معرکے جنگ میں پیش آئے لیکن کبھی فدوی نے ایسے کلمات پاس حضور کی زبان سے نہیں سنے حافظ رحمت خان نے نواب فیض اللہ خان کو بھی ایک وصیت کی تھی۔[2]

اس جنگ میں نواب محبت خان کے ساتھ انکے بھائی حافظ محمد یار خان، محمد دیدار خان، اللہ یار خان اور عظمت خان بھی موجود تھے اور انھوں نے بڑی جگری سے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ جب میدان میں حافظ رحمت خان شہید ہوئے تو محبت خان اپنے معہ بھائیوں اور چند ملازموں کے ہمراہ پروانہ وار اپنے پدر والاشان کے گرد جمع تھے جوش انتقام میں لاش کے پاس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چاہتے تھے کہ انگریزی فوج میں گھس پڑیں کہ ایک مصاحب نے اور فوج لانے کے بہانے سے انہیں میدان جنگ سے نکالا اور کافی منت سماجت کر کے انھیں پیلی بھیت روانہ کیا۔[3]

۱۔ سلمان خان اسد نبیرہ محبت : "نقش سلیمانی" ٹونک ۱۳۲۲ھ / ۱۹۵۲ء ص ۱۳۷۔

۲۔ حافظ رحمت خان نے جنگ سے قبل نواب فیض اللہ خان کو بھی وصیت کی تھی کہ اگر ہم کو شکست ہو جائے اور ہم مارا جاؤں تو تم لڑائی نہ کیجیو بلکہ پہاڑوں کی جانب چلے جائیو۔ روہیل کھنڈ میں وہاں سے بہتر کوئی جگہ امن کی نہیں اور جو کوئی میرے بیٹوں میں سے تمھارے ساتھ جانے کا ارادہ کرے تو اسے بھی ہمراہ لے جائیو (تاریخ اودھ ص ۳۲۷)

۳۔ سید الطاف علی بریلوی: حیات حافظ رحمت خان، طبع ثالث، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۸۲، ص ۲۳۸-

سیاسی غلطی اور ایام اسیری

جنگ میں شکست کھانے اور اپنے والد کے شہید ہونے کے بعد نواب محبت خان پیلی بھیت پہنچکر حالات کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ انہوں نے اس موقع پر کم فہمی اور ناتجربہ کاری کا مظاہرہ کیا۔ ان کا یہ خیال خام تھا کہ شجاع الدولہ ان پر اس صورت میں مہربان ہو جائے گا کہ وہ خود اس کے سامنے ایک زیردست اور اطاعت گزار کی حیثیت سے ملتمس ہوں گے۔ لہٰذا محبت خان اپنی خاندانی عظمت اور خودداری کو بالائے طاق رکھکر اپنے باپ کے قاتل سے انتقام لینے کے بجائے یتیم بن کر اظہار اطاعت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔[1] محبت خان کے اس اقدام کو مورخین نے بھی غیر دانشمندانہ قرار دیا، کیونکہ نواب فیض اللہ[2] خان کی طرح وہ بھی میدان جنگ سے نکل کر لال ڈانگ چلے جاتے تو وہ صورتحال پیش نہ آتی جو آگے چل کر پیش آئی اور انہیں الہ آباد میں ایک قیدی کی حیثیت سے نہیں رہنا پڑتا جبکہ محبت خان کے بھائی حرمت خان نے بجائے قیدی بننے کے در در کی ٹھوکریں کھائیں اور اپنا ملک دشمن سے لینے کی تنہا جدوجہد کی۔[3] اخبار الصنادید صفحہ ۵۱۵ کے مطابق ذوالفقار خان حاکم بریلی جنہیں حافظ رحمت خان بریلی کی حفاظت پر مامور کر گئے تھے اور جو محبت خان کے بھائی تھے نے اپنے والد کی شہادت کے بعد شہر کے رئیسوں کو جمع کیا اور شجاع الدولہ کے پاس سفارت بھیجنا چاہی لیکن اس دوران بریلی پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ نواب محبت خان شاہ عبد الفتح کی بیعت میں جن کا شمار اس وقت کے نامی مشائخ میں ہوتا تھا یکشنبہ کی نصف شب کے وقت پیلی بھیت سے نکلے جبکہ ذوالفقار خان دیوان پہاڑ سنگھ کی منشاء کے مطابق شجاع الدولہ کی ملازمت میں آنے کے لئے تیار ہو گئے لہٰذا محبت خان اور ذوالفقار خان کو ڈیرہ ملازمت لیجایا گیا۔[4]

۱۔ سید الطاف علی بریلوی: حیات حافظ رحمت خان، ص-۲۹۸

۲۔ نواب علی محمد خان کے صاحبزادے تھے ریاست و سیاست کے اصولوں سے واقف تھے انہوں نے ہزیمت شدہ فوج کا بڑا حصہ، اہل و عیال، مال و دولت رامپور سے ساتھ لیا اور روہیل کھنڈ سے نکل کر لال ڈانگ میں مورچے بنا لیے۔ لال ڈانگ نجیب آباد سے آٹھ کوس کے فاصلے پر گڑھوال کی ترائی میں گھنے جنگل میں واقع ہے۔ لال ڈانگ میں نواب فیض اللہ کی سرداری میں افغانوں کی بھاری جمعیت موجود تھی اس میں بڑے بڑے سردار موجود تھے جنہوں نے مدافعانہ جنگ کی تیاری کر لی تھی چنانچہ شجاع الدولہ جب وہاں لشکر لے کر پہنچا تو ۱۲ اکتوبر ۱۷۷۴ء تک چار ماہ کا عرصہ جنگل کاٹنے میں لگ گیا افغان درخت کاٹنے نہیں دیتے تھے ایک ایک درخت کے پیچھے دس دس افغان جان دیتے تھے اور برابر حملہ آور ہوتے رہتے غیر ضروری اخراجات نے شجاع الدولہ کو صلح پر مجبور کر دیا۔ البتہ محمد مستقیم خان نے جو یہ شرط رکھی کہ خاندان حافظ رحمت خان کو رہائی دی جائے ورنہ جب تک جسموں میں جان باقی ہے جنگ لڑیں گے۔ فیض اللہ خان بات نہ کر سکے کیونکہ شجاع الدولہ نے مختلف سرداروں کو مختلف تحریریں دے کر اپنے دام میں طمع میں پھنسا لیا۔

۳۔ حرمت خان نے آصف الدولہ پر حملہ کیا تھا، بادشاہ دہلی سے امداد چاہی اس نے وظیفہ تو مقرر کر دیا لیکن فوج کشی کے لیے مددینی کی پھر سندھیا سے مدد چاہی اس نے بھی مدد نہیں کی پھر شاہ افغانستان تیمور شاہ ابن احمد شاہ درانی نے مدد کا اقرار کیا لیکن لیت و لعل میں رکھا اور آخر حرمت خان کو روہیل کھنڈ واپس آنا پڑا۔ رامپور پہنچے تو فیض اللہ خان نے اپنی ایک بیٹی انہیں بیاہ دی اور اپنے پاس ہی رکھ لیا۔

۴۔ خواجہ لطف ذوالفقار خان کو اور مرتضیٰ خان، نواب محبت خان کو ڈیرہ ملازمت نواب شجاع الدولہ لے گئے۔

۱۲ صفر دوشنبے کی صبح کو شجاع الدولہ سے نواب محبت خان اور ذوالفقار خاں کی ملاقات ہوئی۔ شجاع الدولہ نے کہا، خوب ہوا" تم یہاں آگئے۔ پھر مرزا حبیب بیگ بانکے سے کہا کہ ہم میں اور حافظ جیو میں بڑی محبت تھی، یہ دن خوب سامنے آیا ہم اسکا خیال بھی نہ تھا۔ حافظ جی سے بھی کوئی قصور سرزد نہ ہوا جو کچھ کیا بہادر الدولہ، عبداللہ خان کشمیری اور خان محمد خان (حافظ جی کے بھانجے) نے کیا۔ پھر ایک خلعت کو دونوں بھائیوں کے لیے جمع کیا۔ محبت خان نے عرض کی کہ اگر ہماری سرفرازی منظور ہے تو کل آپ کاٹ کر پیلی بھیت پہنچے گا وہاں خاص مرحمت ہو تاکہ یہ حال دیکھ کر سب متوسلین کے دل مطمئن ہو جائیں۔ شجاع الدولہ نے منظور کر لیا اور اسی وقت محبت خان کو پیلی بھیت بھیج دیا اور ذوالفقار خان کو اپنے پاس رکھ کر پیلی بھیت روانگی کا ارادہ ظاہر کیا۔ محبت خان کو روانہ کرنے کے بعد شجاع الدولہ نے یہ کارروائی کی کہ شیدی غلام حبشی کو جو پیلی بھیت کے قریب ڈیرے ڈالے ہوئے تھا تحریر کیا کہ " محبت خان پیلی بھیت جاتا ہے اسکو حیلے سے رات اپنے پاس ٹھیرا کر صبح کو اپنے ساتھ پیلی بھیت کو لے جائے اور اپنی فوج کو شہر پناہ کے دروازوں پر متعین کر کے اس طرح کا انتظام کر دیا جائے کہ کوئی شخص بھی پیلی بھیت سے نہ نکل سکے" شیدی بشیر نے شجاع الدولہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ۲۶ اپریل ۱۷۷۴ء کو پیلی بھیت کا محاصرہ کر لیا۔ پیلی بھیت کے محاصرے سے قبل جو لوگ اس علاقے سے نکل گئے تھے ان کا مال و دولت محفوظ رہا اور وہ دور دراز علاقوں کی جانب چلے گئے لیکن جو لوگ نواب محبت خاں اور ان کے دیگر بھائیوں کے حکم کے منتظر رہے وہ دامِ بلا میں گرفتار ہوئے۔

اہالیٔ شہر کی لوٹ مار اور قتل و غارت کے بعد شجاع الدولہ نے محبت خان کو کیلا بھیجا کہ اپنے والد کے خزانوں اور دفینوں کو ظاہر کرے۔ محبت خان نے شجاع الدولہ کے ایسے احکامات سنے تو انھیں اب اپنی سابقہ غلطی اور سوچ کا از حد افسوس ہوا وہ سمجھتے تھے کہ شجاع الدولہ انکے اور انکے اہل خاندان کے ساتھ بہتر سلوک کرے گا کیونکہ شجاع الدولہ پر حافظ رحمت خان اور ان کے بڑے صاحبزادے عنایت خان کے بڑے احسانات تھے۔ لواب محبت خان نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "بجز یادِ پدر ہمارے پاس کوئی دولت نہیں ہے اگر خزانے اور دفینے ہوتے تو آج یہ نوبت نہ پہنچتی، اسباب اور عورتوں کے زیورات ضرور موجود ہیں جو آپ لے سکتے ہیں"[1] انکے بعد شجاع الدولہ کا ایک اور حکم پہنچا کہ ایک دو روز کے واسطے محلسرا کو خالی کر کے مع متعلقین لشکر میں چلے آئیے کل اسباب اور مستورات کے زیورات اسی طرح وہیں چھوڑ دیجیے تاکہ خزانے اور دفینے تلاش کر لیے جائیں۔ بعد تلاش آپ کو دوبارہ گوناگوں مراحم و عنایت کے ساتھ محلسرا کو واپس کر دیا جائے گا۔ نواب محبت خان نے جب یہ حکم سنا تو اپنی والدہ محترمہ اور ان تمام بھائیوں اور متعلقین کو ہمراہ لے کر جو حویلی بھیت میں موجود تھے ہر قسم کا سامان محلسرا میں چھوڑ کر صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ اپنے گھروں سے نکل آئے۔ ۱۸ صفر کو نواب محبت خان نے تمام بچوں عورتوں اور بھائیوں کا زر و زیور مع اسباب شیدی بشیر کے حوالے کیا اور صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر تسبیح ہاتھ میں لیے شیدی بشیر کے آدمیوں کے ہمراہ شجاع الدولہ کے کیمپ میں چلے گئے۔[2] اس کے بعد روہیل کھنڈ میں خوب لوٹ مار ہوئی اور یہ حکم ہوا کہ ہتھیار مال و متاع، چھوڑ کر سب شہر سے نکل جائیں۔ اس طرح لوگوں کو مع زن و فرزند مفلس و کنگال کر کے "بہ یک بینی و دو گوش" شہر بدر کر دیا۔ جن لوگوں نے تعمیل حکم میں ذرا میل و حجت کی انہیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

---

[1] سید الطاف علی بریلوی: "حیات حافظ رحمت خان"، طبع ثالث، ۱۹۸۰، کراچی، ص ۲۴۹ -

[2] نجم الغنی خان رامپوری: "اخبار الصنادید"، جلد اول، لکھنؤ، نولکشور، ۱۹۱۸ء، ص ۵۱۸ -

محبت خاں کو ایک ڈیرے میں ٹھہرا دیا گیا جبکہ بسنت علی خواجہ سرا نے اپنی فوج کے ایک دستے کے ذریعے نواب محبت خان کے ڈیرے کو گھیرے میں لے لیا۔ ابھی کچھ دیر اس حراست میں گزری تھی کہ حسن رضا خان نے محبت خان کو شجاع الدولہ کا یہ پیغام پہنچایا کہ " وزیر الملک نے بعد دعا ارشاد فرمایا کہ میں چاہتا تھا کہ تم کو آج اپنے پاس بلا کر خلعت سرفرازی عطا کروں لیکن گزشتہ رات سے ایک دنبل نکل آیا ہے درد کی شدت کے باعث آپ کو نہیں بلا سکتا جونہی دو ایک روز میں افاقہ ہوا ایفائے عہد کروں گا"۔ شجاع الدولہ کی علالت کے بارے میں جب محبت خان نے سنا تو انھیں اس فقیر کی پیش گوئی یاد آئی جو اس نے حافظ الملک سے ان کی شہادت سے ایک روز قبل کی تھی[1]۔ نواب محبت خان کو ایک شخص کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ شجاع الدولہ کے خیمے کے نزدیک سنبل کا درخت ہے اس لیے نواب محبت خان اور انکے لواحقین کو یقین ہو گیا کہ اب شجاع الدولہ تم روہیل کھنڈ کی بہار نہ دیکھ سکے گا۔ پیلی بھیت کی لوٹ مار میں کرنل چیمپین کو کم از کم ۵۰ لاکھ روپیہ کے جواہرات ہاتھی گھوڑے اونٹ اور دوسری قیمتی اشیاء ہاتھ لگیں اس دولت پر شجاع الدولہ قابض ہو گیا اس طرح شجاع الدولہ اور انگریز فوج میں ناچاقی ہوئی[2]۔ شجاع الدولہ نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا اسکے ہمراہ نواب محبت خان اور ان کے دیگر بھائی نواب محبت خان کی والدہ[3] نواب عنایت خان کی بیوہ دوسری بیگم اور بچوں کو شیدی بشیر کی تحویل میں سخت بے حرمتی کے ساتھ پا پیادہ اور کبھی بار برداری کے چھکڑوں پر سوار کرا کے چلا۔ اس سفر کی صعوبت کا تصور کیجیے کہ مئی کا مہینہ تھا جو روہیل کھنڈ میں ان دنوں سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ کا موسم ہوتا ہے۔ ان نازپروردوں کو بیسیوں کوس چٹیل میدانوں میں دن بھر سفر کرایا جاتا تھا۔ تمام قیدی ایکدوسرے کے ساتھ رسیوں سے جکڑے ہوئے جسموں پر میلے اور کثیف کپڑے گرمی میں پسینے سے جل گئے تھے ان مسافروں کو کئی کئی وقت نہ روٹی کا ٹکڑا ملتا اور نہ پانی

---

[1] درویش کی پیش گوئی کا کچھ حصہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کے علاوہ بھی فقیر نے کہا تھا کہ اولاد کی طرف سے آپ خاطر جمع رکھیں آپ کی اولاد کو ڈیڑھ سال سے زیادہ تکلیف نہ پہنچے گی اور آپ کا دشمن پیلی بھیت پہنچ کر دریائے دیوہا کے کنارے خیمہ انداز ہوگا اور سنبل کا درخت اس کے خیمے میں ہوگا اسی روز پیک اجل اس سے ملاقات کرے گا۔

[2] شجاع الدولہ نے بغاوت کے خوف سے دس لاکھ روپیہ انگریزوں کو دے کر جان چھڑائی۔

[3] حافظ الملک کی زوجہ کلاں جنہوں نے نواب محبت خان کو اپنا حقیقی بیٹا بنایا ہوا تھا۔

[4] نواب علی محمد خان کی بیٹی اور نواب فیض اللہ خان کی حقیقی بہن تھیں۔

اس سلسلے میں انھیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا البتہ یہ لوگ فوجیوں کو کھاتے پیتے دیکھتے تو ان سے خود مانگتے اس کے جواب میں لشکر کے وحشی سپاہی ان پر قہقہے لگاتے اور انھیں جھڑک دیتے تھے۔[1] نواب محبت خاں نے ان ناپسران زوپیل کھنڈ کے ساتھ کئی ہفتے کوچ در کوچ کرنے کے بعد انگریز اور شجاع الدولہ کے لشکر کے ساتھ بریلی اور آنولہ کا منہ دیکھا اس لشکر نے پیلی بھیت کی طرح وہاں بھی دل کھول کر لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ بسولی پہنچ کر نواب دوندے خاں کی حویلی کی تلاشی لی دفینے اور خزانے تلاش کیے یہاں تک کہ بیگمات کی جامہ تلاشی لی گئی۔ پسران نواب دوندے خاں مرحوم سے شجاع الدولہ نے کچھ معاہدات پہلے ہی کر رکھے تھے علاوہ ازیں وہ یہ سمجھتے تھے کہ شجاع الدولہ انہیں خلعت سرفرازی عنایت فرمائیں گے لیکن شجاع الدولہ نے ان پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ شجاع الدولہ نے سیاست کے ذریعے مختلف لوگوں کو مختلف مضمون کے خطوط تحریر کیے اور یہ ظاہر کیا کہ آپ نہ آئیں گے تو میں فلاں کو خلعت فاخرہ سے سرفراز کر دوں گا۔[2] اس سلسلے میں نواب محبت خاں کو بلانے کے لیے ایک شقہ الٰہ آباد کے قلعہ دار کے نام شجاع الدولہ نے لکھا۔ اس شقہ کے پاتے ہی قلعہ دار نے نواب محبت خاں کو اپنے آدمیوں کے ہمراہ لال ڈانگ کی طرف روانہ بھی کر دیا۔[3] نواب فیض اللہ خاں انگریزوں اور شجاع الدولہ کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے اس سلسلے میں ایک معاہدہ بھی ہوا جس میں کرنل چیمپین، شجاع الدولہ اور نواب فیض اللہ خاں شامل تھے ۵ء۲ لاکھ روپے آمدنی کا علاقہ نواب فیض اللہ خاں کے حوالے کر دیا اس طرح ریاست رامپور معرض وجود میں آ گئی نواب فیض اللہ خاں نے اپنی سیاسی اہلیت اور تدبر کی بناء پر ریاست رامپور کے آگے چل کر خوب ترقی دی۔ اور یہ علاقہ ایک کروڑ روپیہ آمدنی کا علاقہ ہو گیا۔[4] نواب فیض اللہ خاں پر یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ پانچ ہزار سے زیادہ فوج ملازم نہیں رکھ سکتے اور شجاع الدولہ کی امداد کے لیے تین ہزار فوج بروقت ضرورت دینی پڑے گی۔ باقی سپاہیوں کو جن کی تعداد ۲۰ ہزار تھی ملک سے گنگا پار نکال دینا طے ہوا شجاع الدولہ کو ۱۵ لاکھ روپیہ بھی دیا گیا۔

۱؎ سید الطاف علی بریلوی: "حیات حافظ رحمت خاں" ص ۲۵۱۔

۲؎ مستقیم خاں نے شجاع الدولہ کا اعتبار نہ کیا اور کہا پہلے خاندان حافظ رحمت خاں کو قید سے رہا کر کے سرفراز فرمایا جائے شجاع الدولہ نے فیض اللہ کو لکھا، اگر آپ فوراً میرے پاس حاضر ہوں تو آپ کو جاگیر قدیمی میں کچھ اضافہ کر دیا جائے گا نہیں تو میں نواب محبت خاں کو الٰہ آباد سے بلا کر سرفراز کر دوں گا اس وقت اس کے رسالدار جو بالفعل آپ سے متفق ہیں ایکے شریک ہو جائیں گے

۳؎ سید الطاف علی بریلوی: "حیات حافظ رحمت خاں" ص ۲۵۶۔

۴؎ " " " ص ۲۵۷۔

شرائط کے طے ہوتے وقت کرنل چیمپین نے حافظ الملک کی اولاد کے مستقبل کے بارے میں تصفیہ کرنے کے لیے کہا لیکن نواب فیض اللہ خان نے یہ معاملہ شجاع الدولہ کے سپرد کر دیا۔ اس معاہدے کے تحت ۲۰ ہزار روہیلے فوجی بھیڑ بکریوں کی طرح نکال دیئے گئے جو انتہائی بے کسی کے عالم میں مدتوں خانماں برباد رہے ان میں سے کسی نے ضابطہ خان کی ریاست میں داخل ہو کر نوکری کر لی کسی نے اسکے بیٹے غلام قادر روہیلے کی سرکار میں ملازمت اختیار کی بہت سے ریاست ٹونک، بھوپال اور جاورہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔

نواب شجاع الدولہ جب اس معاہدے کے بعد الہ آباد اور سنبھل پہنچے تو راہ میں انہیں نواب محبت خان ملے جو ان کے حسب الطلب قلعہ الہ آباد میں ان کی خدمت میں لائے جا رہے تھے نواب محبت خان کو شجاع الدولہ نے بار بار تسلی دی اور وعدہ کیا کہ فیض آباد پہنچ کر ان کی بہتری کے لیے امور خاطر خواہ تجویز کیے جائیں گے۔ شجاع الدولہ نے وعدہ ایفا نہ کیا وہ دراصل نواب محبت خان اور انکے لواحقین سے دل میں کدورت رکھتا تھا، اور حد درجہ محتاط رہنا چاہتا تھا اس نے اپنے مرض کی شدت کا بہانہ بنا کر محبت خان سے معذوری ظاہر کی، اور کہا کہ میں آپ کا وظیفہ ایک ہزار روپے ماہانہ مقرر کرتا ہوں آپ صرف اپنے اہل خانہ کو الہ آباد قلعے سے بلا لیجیے وہ جب آئیں گے تو ایک ہزار کا رسالہ آپکو عنایت کیا جائے گا لیکن نواب محبت خان نے اس عنایت کو مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنی والدہ بہنوں اور دوسرے بھائیوں کو قید میں چھوڑ کر صرف اپنے اہل خانہ کے ساتھ کس طرح سکون سے رہ سکتے تھے۔ الہ آباد کے قلعے میں نواب محبت خان اور ان کے اہل خاندان

۱؎ شجاع الدولہ ان شرائط سے بہت خوش ہوا جو معاہدہ میں طے کی گئی تھیں۔ نواب فیض اللہ خان اگر اس وقت خاندان حافظ رحمت خان کے بارے میں بھی کچھ اقدام کرتے تو اسیران روہیل کھنڈ با آسانی رہا ہو جاتے۔

۲؎ تاریخ ہند، جیمس گرنیڈ کے تحت پانچ لاکھ آدمی روہیل کھنڈ سے نکالے گئے۔ ۱۸ ہزار افراد کے پاس ہتھیار موجود تھے۔

۳؎ کرہ میران پور کی جنگ کے فوراً بعد شجاع الدولہ کی ران میں ایک دنبل نکل آیا۔ بعض مورخین کے مطابق فتح کے بعد شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان کی ایک بیٹی کو بستر پر بلایا جس نے زہر میں بجھا ہوا نشتر اس کی ران میں پیوست کر دیا ایک روایت کے مطابق شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان کو خواب میں دیکھا جنہوں نے اسکے نیزہ مارا اور وہ بستر مرگ تک پہنچ گیا۔

کو مقید کرنے کے بعد ان اسیران کی گزر بسر کیلیے نہایت قلیل رقوم مختص کی گئیں[۱] ـ نواب محبت خان، عظمت خان منگل خان، حرمت خان، محمد یار خان، غلام مصطفیٰ خان اور اکبر خان کیلیے ۴۰ روپیہ ماہوار مقرر کیئے ـ اسکے علاوہ ایک طرف تو شیدی بشیر کی زیادتیاں اور دوسری جانب شجاع الدولہ نے وہ رسد جو چالیس پچاس افراد کے لیے ہوتی تھی اور پہاڑ کی جانب سے آتی تھی اسے روک دی حکام ضلع اور تحصیلداروں کو پروانے لکھ دیے کہ پٹھانوں کے پاس لال ڈانگ سے غلہ نہ پہنچنے پائے لیکن ہردوار کے گھاٹ سے گنگا عبور کر کے بیوپاری اور بنجارے غلہ لانے لگے ورنہ لال ڈانگ میں ایک روپیہ سیر غلہ ہو گیا تھا[۲] ـ اس اسیری کے دوران نواب محبت خان انکے اہل خاندان اور دیگر بکثرت علماء وفضلاء اور شرفاء روہیل کھنڈ نے اذیت میں دن بسر کیے ـ شیدی بشیر جو شجاع الدولہ کا زر خرید غلام تھا

اسیران روہیل کھنڈ کے ساتھ جو زیادتیاں کیں وہ ایک علیحدہ باب ہے مجموعی طور پر نواب محبت خان انکے بھائیوں اور بیگمات پر جو مظالم ڈھائے گئے اسکی نشاندہی نواب محبت خان کی والدہ یعنی حافظ رحمت خان کی زوجہ کلاں کا ایک خط کرتا ہے یہ خط کرنل چیمپین کے توسط سے گورنر ہیسٹنگز کے پاس کلکتہ بھجوایا گیا خط کے متن کا ترجمہ ـ "حافظ رحمت خان نے چالیس سال تک اس ملک پر حکومت کی اور ان کی بہادری سے جنگل کے درندے تک کانپتے تھے، حکم الٰہی سے کون سرتابی کر سکتا ہے وہ شہید ہو گئے اور ان کے بچوں کے پاس کوئی رتی بھر چیز نہیں رہی ہے یہی نہیں بلکہ ننگا کر کے انہیں خانہ بدر کیا گیا ہے دھوپ اور جلتی ہوئی ریت کی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں ہم تھوڑے سے چاولوں اور پانی کے لیے تڑپ رہے ہیں اور ہلاک ہو رہے ہیں اپنا حال کیا بیان کروں اور کیسے لکھوں، میری آہ سوزاں روشنائی کو خشک کیے دیتی ہے اور کاغذ کو جلائے ڈالتی ہے کل میں ایک لاکھ آدمیوں کی ملکہ تھی . . . .

---

[۱] عنایت خان کے اہل وعیال کے لیے ۱۰ روپیہ ماہوار مختص کیے گئے ـ

[۲] نواب فیض اللہ خان نے اس موقع پر روپیے اور اشرفیاں ملازمین میں تقسیم کیں یہانتک کہ ۲۰ روپے کی اشرفی ۱۲ روپے کی ہو گئی ـ پٹھان امروہہ، پیلی بھیت، بریلی، آنولہ، بسولی اور جیبانی اس حالت میں پہنچے کہ بدن پر لباس تک نہ تھا۔

آج ایک پیالہ پانی کو ترستی ہوں کل میں حکومت کرتی تھی۔ آج بھیک مانگ رہی ہوں۔ اے فلک کج رفتار تو بے وفا ہے تو بلند کو پست اور پست کو بلند کرتا ہے لیکن میں تو بے خطا ہوں، اگر کوئی خطا تھی تو حافظ کی تھی یہ بچے کیوں ستائے جا رہے ہیں۔ باپ کی خطا پر بچوں کو سزا! آہ ایک جانور کی طرح پھندا ڈال کر مجھے لے جایا جا رہا ہے۔ نہ رات کو قیام میسر ہے اور نہ دن کو سایہ نصیب ہوتا ہے جو ذرا آرام کر لوں۔ صرف آپ سے رحم و انصاف کی امید باقی ہے۔ میں ایک پرندے کی مانند محبوسِ قفس ہوں بھوک و پیاس کی تکلیف اٹھانے سے تو بہتر ہے کہ چھری مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری حالتِ زار پر توجہ فرمائیں گے اور میری حیثیت دو چند ہو جائے گی۔ اب کاغذ ختم ہو گیا میری اس تحریر کو معاف فرمائیے۔[1]" نواب محبت خان کو شجاع الدولہ نے معاہدہ لال ڈانگ کے موقع پر قلعہ الہ آباد سے طلب کر لیا تھا اور وہ شجاع الدولہ کے لشکر کے ساتھ نظر بندی کے ایام بسر کر رہے تھے[2] کہ اسی اثناء میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔

جب شجاع الدولہ کا مرض اشدت اختیار کر گیا تو اسکی ماں نے اسیرانِ روہیل کھنڈ کی رہائی کیلئے شجاع الدولہ سے کہا کہ وہ عورتیں اور بچے رات دن نالہ و فریاد کرتے ہیں اور بد دعائیں کرتے ہیں انہیں رہا کر دینا چاہیئے لیکن شجاع الدولہ راضی نہ ہوا بالآخر بروز پنجشنبہ ٢٣ ذی قعدہ ١١٨٨ھ مطابق ٢٦ جنوری ١٧٧٥ء کو بعمر ٤٤ سال وفات پائی۔[3]

---

[1] کرنل چیمپئن نے اس سلسلے میں ہیسٹنگز کو حافظ رحمت خاں کے خاندان کی مشکلات اور ان کی نجات کی کوشش کی. اور ہیسٹنگز کو بہت کچھ لکھا لیکن اس نے جواب میں یہی کہا کہ مشرقی جنگ و جدال میں یہ معمولی باتیں ہیں. اس سلسلے میں رپورٹ بنیم ہیسٹنگز اینڈ دی روہیلا وار میں تفصیل درج ہے۔ (حیات حافظ رحمت خاں)

[2] حیات حافظ رحمت خاں کے مطابق محبت خان ذوالفقار خان اور ارادت خان قلعہ الہ آباد سے باہر لشکر شجاع الدولہ میں نظر بند رہے۔

[3] شجاع الدولہ ٢٢ سال کی عمر میں مسند نشین ہوا ٢١ برس حکومت کی۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، اور اودھ اور نوابان اودھ کے مطابق ١١٦٧ھ / ١٧٥٢ء تا ١١٨٨ھ / ١٧٧٥ء —

احوالِ رہائی اور گورنر سے استغاثہ

شجاع الدولہ کی وفات کے بعد جب آصف الدولہ مسند نشین ہوا تو اس نے روہیل کھنڈ کے کچھ قیدیوں کو بطور تصدیق قید سے رہا کر دیا مگر نواب محبت خان کے اہل خاندان اور نواب دوندے خان مرحوم کے لواحقین کو بدستور قید و بند کی صعوبتوں میں رہنا پڑا۔ اپنے جلوس کے چند ماہ بعد آصف الدولہ نے نواب محبت خان کو بھی الہ آباد بھیج دینا چاہا لیکن سالار جنگ کے بھائی مرزا علی خان نے سفارش کی اور کہا۔

"بادشاہ اور امیر لوگ جلوس کے وقت قیدیوں کو رہا کرتے ہیں بیگناہوں کو قید نہیں کرتے اگر آپ کو اپنے والد مرحوم کے مواعید کے مطابق محبت خان کے ساتھ نیک سلوک منظور نہیں ہے تو کم از کم بدسلوکی ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔"[1]

مرزا علی خان کا یہ استدلال موثر رہا لیکن اس کے باوجود آصف الدولہ کو ایک خوف لاحق رہتا تھا لہٰذا وہ خاندان محبت خان کو مختلف انداز سے ایذا رسانی کرتے رہے یہاں تک کہ محبت خان کا جو ماہانہ وظیفہ مقرر تھا وہ بھی بند کر دیا۔ اسیران روہیل کھنڈ پر سختیاں اور پابندیاں اور زیادہ بڑھ گئیں لیکن اس حال میں کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ قدرت نے اسیران روہیل کھنڈ کی رہائی کا خود بخود انتظام کر دیا اور اودھ کی حکومت کی حلیف انگریز سرکار اپنے مخصوص مصالح کی بناء پر اسیرانِ روہیل کھنڈ کی ہمدردی پر آمادہ ہو گئی اور جو لوگ کل تک دشمن تھے وہ آج دوست نظر آنے لگے۔[2] انگریزوں کی اس غیر متوقع عنایت کی وجہ یہ ہوئی کہ روہیل کھنڈ فتح ہو جانے کے بعد ان کی باریک بین نگاہوں کو انڈیا کے نقشے پر ریاست اودھ ایک بدنما داغ معلوم ہونے لگی تھی لہٰذا شجاع الدولہ کے انتقال کے فوراً بعد انگریز حکومت نے حکومت اودھ سے اپنے تمام سابقہ معاہدات کالعدم قرار دے دیئے۔ نواب آصف الدولہ کو انگریزوں کی تمام شرائط تسلیم کرنا پڑیں ان شرائط میں اسیران روہیل کھنڈ کی رہائی بھی شامل تھی[3] البتہ یہ ضرور ہے کہ آصف الدولہ نے اسیران روہیل کھنڈ کی رہائی کو چاروناچار تسلیم کیا تھا ورنہ وہ دل سے نہیں چاہتا تھا کہ روہیل کھنڈ کے پٹھانوں کو آزاد چھوڑ دے۔

---

[1] حیات حافظ رحمت خان صفحہ ۳۵۶ بحوالہ گل رحمت

[2] روہیل کھنڈ کے قیدیوں کو اس قدر ایذائیں پہنچائی گئیں کہ ۲۵ سے زیادہ قیدی جاں بحق ہو گئے۔

[3] انگریز حکومت نے اس سلسلے میں کہا کہ تمام سابقہ قرضے وصول کئے جائیں گے (ii) ریاست بنارس نواب وزیر کے بجائے انگریزوں کی سرپرستی میں رہے گی (iii) راجہ بنارس سے ۲۲ لاکھ روپیہ نواب وزیر کی بجائے انگریز حکومت وصول کرے گی۔

اسکے ذہن میں جو کچھ بھی تھا اس کا نفسیاتی پہلو یہ تھا کہ پٹھانوں کو اگر آزاد چھوڑ دیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسکے باپ شجاع الدولہ اور دادا صفدر جنگ کی احسان فراموشی اور مظالم کا بدلہ لیں۔ خود آصف الدولہ کے خمیر میں بھی چالبازی کا وہ عنصر موجود تھا۔ وہ اپنے باپ دادا سے کس طرح پیچھے رہ سکتا تھا؟ اس نے وزارت کا عہدہ سنبھالتے ہی اسیرانِ روہیل کھنڈ کو سخت تکالیف میں مبتلا کیا۔ بالآخر آصف الدولہ ایک بڑی رقم کے عوض اسیرانِ روہیل کھنڈ کی رہائی پر راضی ہوا۔

اخبار الصناد ید جلد اوّل کے مطابق :-

مہدی گھاٹ کے مقام پر جان برسٹو صاحب ریزیڈنٹ کے نام کلکتہ سے گورنر جنرل کا مراسلہ آیا اور اس نے منشی محمد ذاکر کی زبانی محبت خاں اور ذوالفقار خاں کا یہاں بے سرو سامانی کے عالم میں موجود ہونا سنا تو ان کے پاس ہرکارے بھیج کر انھیں اپنے پاس بلایا مگر انھوں نے علانیہ ریزیڈنٹ کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا اس لیے خفیہ رات کے وقت ملے۔ اس نے ان کی تسلی و تشفی کی اور ان کی بہبود میں کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور ان کے ڈیرے اپنے ڈیروں کے پاس ایستادہ کرائے اور ان کی عسرت کی خبر سن کر اپنے پاس سے پانچ ہزار روپیہ ان کو دیئے اور کہا کہ تم بے اندیشہ اپنے حالات ہم سے بیان کرتے رہا کرو[1]

ایک اور تاریخ کے مطابق :-

لاچار ہو کر بوسید صاحب ریزیڈنٹ عرضی عفو جرائم جناب عالی کو بھیجی جناب وزارت مآب از راہ ہمت جوانمردی ان پر رحم کھا کر معرفت ریزیڈنٹ اور ان کی سفارش سے بھی ایک لاکھ روپیہ سالانہ عیالِ حافظ رحمت خاں کے واسطے مقرر فرمایا۔ اسکی صورت یہ ہوئی کہ جناب عالی حافظ الملک کے بڑے بیٹے نواب محبت خاں کو اپنے ساتھ قید کر کے لائے اور قلعہ الہ آباد میں بھیج دیا اور اس کے نو ماہ بعد جناب عالی نے انتقال کیا۔ نواب آصف الدولہ

---

[1] نواب محبت خاں کو ۵۰۰۰ روپیہ کے علاوہ ایک گھوڑا بھی عنایت کیا۔

[2] اس تحریر کی ابتدا سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے نواب آصف الدولہ نواب محبت خاں کو زیادہ سے زیادہ سہولت دینا چاہتے تھے حالانکہ ایسا نہیں تھا یہ تمام سہولتیں انگریز حکومت کے ایما پر دی گئیں {منتخب التواریخ صفحہ ۸۷ از کمال الدین حیدر حسینی}

نے چاہا کہ نواب محبت خاں کے واسطے دس ہزار روپیہ ماہوار مقرر فرمائیں مانا نہ مانا بلکہ جناب عالی سے خائف و ترساں تھے آخر کسی حکمت سے قید خانے سے بھاگ کر کلکتہ پہنچے۔ نواب گورنر جنرل سے ملاقات کی حال عرض کیا نواب محتشم الیہ نے بہت خاطر اور دلجوئی فرمائی۔ پانچ ہزار روپیہ دعوت کے، ایک گھوڑا عنایت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ نواب محبت خاں کی تنخواہ خزانہ جناب عالی سے آکر ہمارے خزانہ ریزیڈنسی سے ملا کرے اور اگر احیاناً سرکار سے کوئی عذر اسکے دینے میں ہوگا ہم دلوا دیا کریں گے۔"

اس اعلان کے بعد ہی نواب محبت خاں سرکار انگریز کے توسل کو اپنا حامی و دستگیر سمجھ کر صاحب ریزیڈنٹ کے دربار جایا کرتے تھے۔ اور نواب آصف الدولہ کے دربار میں خلعتِ سرفرازی پاکر حاضر رہتے تھے، وہی صورت ان کی اولاد کے واسطے باقی رہی۔ چنانچہ جب جنت آرام گاہ کے عہد دولت میں تقسیم ممالک محروسہ ہوئی، وہی لاکھ روپیہ سالانہ انکی بھی تنخواہ کا محسوب حساب ہوا۔

اسیرانِ روہیل کھنڈ کی رہائی کے لیے دوندے خاں اور حافظ رحمت خاں کی اولاد، علماء، فضلاء، شرفاء نے جو قیدی بنے ہوئے تھے نواب سید فیض اللہ خاں کی خدمت میں متواتر عرضیاں ارسال کیں اور استدعا کی کہ اس قیدِ سخت سے ہم کو رہا کرا دیجیے۔ نواب موصوف نے رحم کھا کر مسٹر جان بر سٹو لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کو ان کی رہائی کے لیے کوشش کرنے کی درخواست کی۔ ریزیڈنٹ نے آصف الدولہ سے سفارش کی اور اس سلسلے میں بہت دباؤ ڈالا، آصف الدولہ نے تین لاکھ روپیہ ان محبوسوں کی رہائی کے لیے عوض میں طلب کیے اور یہ رقم اس طرح ادا کی گئی کہ ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ نواب سید فیض اللہ خاں نے عطا کیے اور ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ نواب سید سعد اللہ خاں کی بیگم نے ادا کیے[1]

---

[1] نواب سید سعد اللہ خاں کی بیگم فیض آباد میں رہتی تھیں اپنا اسباب بیچ کر گزارا کرتی تھیں۔ نواب سعد اللہ خاں نے شجاع الدولہ کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا اس کا صلہ یہ ملا کہ آنولہ سے ان کی بیگم کو حراست میں رکھ کر فیض آباد پہنچایا اور قید کر دیا نواب آصف الدولہ نے مسند نشین ہونے کے بعد بیگم کا تمام اسباب ضبط کر لیا۔ نواب فیض اللہ خاں نے احترام الدولہ کالون صاحب کو اس بارے میں بہت کچھ لکھا اور ان خطوں کا بھی حوالہ دیا جو بیگم صاحبہ کو شجاع الدولہ نے تحریر کیے تھے، جن میں بیگم صاحبہ کی پنشن کے حقوق بحال کرنے کا وعدہ تھا۔ بعد ازاں بیگم صاحبہ فیض آباد سے رام پور چلی آئی تھیں نواب فیض اللہ خاں نے ان کا معقول درماہہ مقرر کر دیا تھا۔

آصف الدولہ سے قیدیوں کی رہائی کا حکم سید معزز خان قلعہ دار کے نام لے کر جان برسٹو نے بھیجا لیکن اس نے ایک مہینے تک سامان کی تیاری کے بہانے تاخیر کی۔ آخر کار، ۷ شعبان ۱۱۸۹ھ بروز شنبہ جان برسٹو کے ہرکاروں اور اپنے آدمیوں کے ساتھ قیدیوں کا یہ قافلہ لکھنؤ روانہ کیا۔ یہ لوگ کڑا مانک پور کے راستے سے ۲۹، شعبان ۱۱۸۹ھ کو لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کچھ دنوں خواجہ یاقوت کے باغ میں خیموں کے اندر رہے، پھر کرایہ کی حویلیوں میں قیام کیا۔[۱] نواب محبت خان اور دوندے خان کے اہلِ خاندان کی پنشن ایک لاکھ روپیہ مقرر ہوئی۔ ایک سال کی تنخواہ دینے کا حکم میر علی رضا فوجدار خیر آباد کے نام حاصل کر کے اس میں سے چھیاسٹھ[۲] ہزار روپیہ حافظ رحمت خان کے اہل و عیال اور تینتس ہزار روپیہ دوندے خان کے بیٹوں میں تقسیم کر دیئے۔ اس رقم کی تقسیم پہلے اس طرح ہوئی کہ پینسٹھ[۲] ہزار روپیہ نواب محبت خان کے خاندان کے لیے اور پینتیس[۳] ہزار روپیہ نواب دوندے خان کی اولاد کے لیے، لیکن دوندے خان کے بیٹوں نے رقم کی قلت کی وجہ سے یہ روپیہ منظور نہیں کیے۔ جبکہ نواب محبت خان کے بھائیوں میں سے حرمت خان، اکبر خان اور عظمت خان نے بھی جان برسٹو کے درماہے کو قبول نہ کیا اور روہیل کھنڈ چلے آئے۔ لہذا ان کی تنخواہ پینسٹھ ہزار میں سے منہا کر کے اکسٹھ ہزار پانچ سو پینسٹھ روپیہ سالانہ مقرر ہوئے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو حافظ رحمت خان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نقشِ سلیمانی میں خاندان حافظ رحمت خان کا وظیفہ یہی لکھا ہوا ہے، لیکن نواب دوندے خان کی اولاد کے لیے مختص رقم پچیس ہزار روپے تحریر ہے جو انھوں نے منظور نہ کیے اور نواب فیض اللہ خان کے پاس رامپور چلے آئے،[۳،۴] جہاں نواب نے ان کے وظیفے مقرر کرائے۔

---

[۱] نواب فیض اللہ خان نے عنایت خان کی بی بی کو جو ان کی حقیقی بہن تھیں اور فتح خانساماں کے عیال و اطفال کو رام پور بھیج دیا اور اپنی بہن کا وظیفہ ۰۰ روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا۔

[۲] فرخ بخش کے حوالے سے اخبار الصنادید میں یہی لکھا ہے جب کہ گلستانِ رحمت میں ۶۵۰۰۰ پینسٹھ ہزار روپیہ حافظ رحمت خان کے خاندان کے لیے اور ۳۵۰۰۰ ہزار روپیہ دوندے خان کی اولاد کے لیے تحریر ہے۔

[۳] اخبار الصنادید جلد اول کے تحت اولاد نواب دوندے خان نجف خان کے پاس دہلی گئی، پھر نواب فیض اللہ کے پاس رام پور چلی آئی جہاں بر بیل بھیت اور آنولہ سے آ کر اور بہت سے روہیلے جمع ہو رہے تھے۔

[۴] اخبار الصنادید میں اخبار حسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ نواب فیض اللہ خان نے ہر ایک بھائی کا دو ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دیا ان میں سے ایک بھائی اپنی ایک دختر نواب محمد علی خان فرزند کلاں نواب فیض اللہ خان سے بیاہ دی تھی۔ اس طرح نواب فیض اللہ خان نے اپنی ایک دختر نواب اکبر خان سے بیاہ دی کیونکہ وہ اپنے بھائی حرمت خان سے علیحدہ ہو کر رام پور آ گئے تھے۔ فیض اللہ خان نے ۰۰ روپیہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔

گورنر جنرل سے استغاثہ

نواب محبت خان ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے اپنے دن گزار رہے تھے ایک روز نواب محبت خان بہادر برائے ملاقات مختار الدولہ جو آن دنوں نواب آصف الدولہ کے نائب کی حیثیت رکھتے تھے، تشریف لے گئے۔ مختار الدولہ نے نواب صاحب کا استقبال اعزاز و اکرام کے ساتھ نہیں کیا۔ نواب محبت خان آزردہ ہو کر واپس لوٹے۔ نواب صاحب نے اس بات کی شکایت جان برسٹو سے کی، جان برسٹو نے بھی اس بات کو محسوس کیا، کیونکہ نواب محبت خان کا بہت احترام رکھتے تھے۔ انھوں نے نواب آصف الدولہ سے اس امر کی شکایت کی اور نواب آصف الدولہ بھی مختار الدولہ سے ناراض ہوئے۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب محبت خان کی لیاقت و شائستگی سے نہ صرف جان برسٹو متاثر تھا بلکہ نواب آصف الدولہ بھی ان کی شخصیت سے مرعوب رہتا تھا اور ان پر کڑی نگرانی بھی رکھتا تھا۔

جب جان برسٹو ۱۷۸۱ء ~~۱۱۹۵ھ~~ میں اپنے عہدے سے سبک دوش ہوئے اور ان کی جگہ مڈلٹن تعینات ہوئے تو لکھنؤ کے اہل کاروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور محبت خان کی تنخواہ میں تساہل کیا جانے لگا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر نواب محبت خان نے گورنر جنرل سے ملاقات کا ارادہ کیا تاکہ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ ہو سکے۔

~~۱۲۰۱ھ~~[1] جبکہ اس وقت لارڈ کارن والس صاحب گورنر جنرل کے عہدے پر فائز تھے، نواب محبت خان کو لکھنؤ سے نکلنے کا موقع اس طرح ملا، کہ نواب آصف الدولہ سیر و شکار کی خاطر بہرائچ وغیرہ کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ نواب وزیر اکثر نواب محبت خان کو ایسے مواقع پر اپنے ہی ساتھ رکھتے تھے[2] لیکن اس مرتبہ دورانِ سفر نواب محبت خان نواب وزیر آصف الدولہ کے ساتھ نہیں گئے۔ نواب محبت خان نے یہ وقت اسی لیے نکالا تھا جسے آصف الدولہ سمجھ نہ سکا جب محبت خان کلکتے کی جانب روانہ ہوئے[3]، آصف الدولہ کے ہرکاروں نے نواب وزیر کو اس امر کی فوراً اطلاع کر دی، کہ نواب محبت خان آپکی شکایت کرنے گورنر کے پاس جاتے ہیں۔ نواب آصف الدولہ نے فوراً مرزا باقر بیگ خان ایک پٹھہ رسالدار کو روانہ

---

[1] سلیمان خاں اسد نبیرہ محبت خان: "نقش سلیمانی"، ص - ۱۱۱

[2] نواب آصف الدولہ اور ان کے اہلِ سلطنت نواب محبت خان کی کڑی نگرانی کرتے تھے اسی لیے آصف الدولہ سفر میں بھی محبت خان کو ساتھ رکھتے تھے۔

[3] جب نواب محبت خان کلکتے گئے تو ان کی جدائی میں جعفر علی حسرت نے ایک قصیدہ لکھا جو حسرت کے دیوان اول میں شامل ہے۔ اس میں ۱۵۱ اشعار ہیں اسکی تفصیل آئندہ ابواب میں بیان کریں گے۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے ؎ اے صبا یار کے کوچے تو لائے لو
تو خدا تجھ پہ سہوں پیغام میرا لے جا تو

کیا اور یہ حکم دیا کہ جس طرح ممکن ہو نواب محبت خان کو واپس لاؤ۔ یہ رسالدار تعاقب میں تیزی سے روانہ ہوا تاکہ نواب محبت خان کو راستے ہی میں روک لے، لیکن جب یہ بنارس پہنچا تو پالکی ڈاک نواب محبت خان دریائے گنگا کے پار عملداری سرکار انگریز پہنچ چکی تھی[1]۔ ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ مرزا باقر بیگ خان رسالدار نے بپاس خاطر نواب محبت خان بہادر دانستہ تساہل کیا تاکہ نواب موصوف انگریز سرکار تک پہنچ جائیں۔ آصف الدولہ نے حیدر بیگ خان کو کلکتے روانہ کیا اور تفضل حسین خان کو ایک رقعہ بھی لکھا۔ اس میں یہ تحریر کیا کہ نواب محبت خان ابن حافظ رحمت خان بہادر مرحوم خدمتِ عالی میں آتے ہیں ان کی کوئی بات گورنر جنرل تک نہ پہنچے اور ان کی ملاقات گورنر جنرل سے نہ کرائی جائے۔ ان دنوں تفضل حسین خان بہادر جو کہ نواب محبت خان کے قدیم دوست تھے، نواب وزیر آصف الدولہ کی جانب سے کلکتے میں عہدہ وکالت پر مامور تھے۔ جب آصف الدولہ کی تحریر ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے انھیں سمجھایا کہ نواب وزیر کی شکایت گورنر سے کرنا کسی صورت میں بھی مناسب نہیں۔ اسی اثنا میں آصف الدولہ کی جانب سے بھیجے ہوئے امیر الدولہ بھی پہنچ گئے، جنکے بارے میں نواب وزیر نے اپنی تحریر میں پہلے بتا دیا تھا کہ اس سلسلے میں امیر الدولہ کی بات سنی جائے۔ علامہ تفضل حسین خان نے بھی مرزا حیدر بیگ خان سے نواب محبت خان سے دوستی کی بناء پر بہت کچھ طرفداری کے بعد کہا اور امیر الدولہ سے یہ وعدہ لیا کہ نواب آصف الدولہ اور نواب محبت خان کے مابین صلح صفائی کرادی جائے گی اور آئندہ نواب محبت خان کا مشاہرہ ماہ در ماہ ریزیڈنٹ کی معرفت پہنچتا رہے گا۔ نواب امیر الدولہ نے تمام طے شدہ امور کا وعدہ کیا[2]۔

---

1. سلیمان خان اسد نبیرہ محبت: "نقش سلیمانی"، مطبع محمدی ٹونک ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۶ء، ص ۱۳۰۔
2. ایضاً، ص ۱۲۱۔

محبت خاں کو اس امر کا بھی خدشہ تھا کہ اگر یہ مشن ناکام ہو گیا تو لکھنؤ واپس جانے میں خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ جبکہ انکے اہل و عیال لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ علامہ تفضل حسین خان اور امیر الدولہ نے دور اندیشی سے کام لیا انھوں نے نواب محبت خاں کو تسلی و تشفی دی اور دوسری جانب انفیس گورنر جنرل سے آصف الدولہ کی شکایت نہیں کرنے دی، البتہ انھوں نے گورنر جنرل سے ملاقات ضرور کی۔ نواب محبت خاں گورنر جنرل سے ملے[1] تو گورنر جنرل نواب موصوف سے بکمال اعزاز پیش آئے تعظیم دے کر انفیس اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور ان کی نہایت دلجوئی اور خاطر داری کی۔ بعد ازاں امیر الدولہ نواب محبت خاں کو اپنے ساتھ لکھنؤ واپس لائے اور نواب وزیر سے ان کی صلح کرادی۔ جب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کلکتے گئے تھے تو انھوں نے بھی گورنر سے نواب محبت خاں کی سفارش فرمائی اور جب نواب گورنر جنرل بنفس نفیس لکھنؤ تشریف لائے تو حکم فرمایا کہ نواب محبت خاں کی تنخواہ خزانہ نواب وزیر سے آکر ہمارے خزانے ریزیڈنسی سے ملا کرے اور اگر سرکار سے کوئی عذر اسکی ادائیگی میں ہوگا تو ہم خود دلوا دیا کریں گے"۔

---

[1] طلسم ہند کے حوالے سے اخبار الصنادید میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ سلطنت اودھ کی جانب سے گورنر جنرل کے پاس محبت خاں سے ملاقات نہ کرنے کے باب میں تحریر پہنچ جانے کی وجہ سے گورنر جنرل نے محبت خاں سے ملاقات نہ کی، جبکہ گلستان رحمت اور نقش سلیمانی میں یہ تحریر ہے کہ نواب محبت خاں سے گورنر کی ملاقات ہوئی اور وہ بکمال اعزاز پیش آئے، پانچ ہزار روپیہ اور ایک گھوڑا عنایت کیا -

قیصر التواریخ جلد اول از کمال الدین حیدر صفحہ ۸۷ پر مرقوم ہے :-

قید خانے سے بھاگ کر محبت خاں کلکتے پہنچے نواب نے گورنر جنرل سے ملاقات کی ماحال عرض کیا، نواب محتشم الیہ نے بہت خاطر اور دلجوئی فرمائی، پانچ ہزار روپیہ دعوت کے اور ایک گھوڑا عنایت فرمایا اور کہا ہم جناب عالی سے تمھاری سفارش کریں گے "

ان تحریروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نواب محبت خاں نے گورنر سے ملاقات کی - بلا واسطہ طور پر آصف الدولہ کے خلاف یہ استغاثہ ہی تھا، کیونکہ گورنر موصوف کا یہ فرمانا کہ ہم جناب عالی سے تمھاری سفارش کریں گے، یہی ظاہر کرتا ہے -

نواب مرزا علی خاں کا حقِ دوستی نبھانا

آصف الدولہ کے جانشین مقرر ہونے کے بعد نواب محبت خاں اور انکے اہلِ خاندان کو مالی پریشانیوں کا خاص طور پر سامنا کرنا پڑا۔ سرکار نواب وزیر سے نہایت دشواری کے ساتھ مشاہرہ مقرر وصول ہوتا تھا۔ ایک ایک سال تاخیر ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی یہ مدت دو سال تک پہنچ جاتی۔[۱] اسطرح خاندان نواب محبت خاں کی گزر اوقات بھی مشکل سے ہونے لگی یہاں تک کہ احتیاجِ ضروریہ میں بھی فرق آتا تھا، اس پر ستم ظریفی یہ کہ نواب وزیر کے سفر کے دوران بھی آپکو ساتھ رہنا پڑتا جو نواب محبت خاں کے مزاج اور شان کے خلاف تھا۔[۲] ان ہی حالات کے پیش نظر نواب محبت خاں نے گورنر جنرل سے ملاقات کا قصد کیا تھا لیکن اس وقت نواب محبت خاں کے پاس اسقدر رقم نہیں تھی کہ وہ کلکتے جاتے اور اپنے پیچھے اتنی رقم بھی چھوڑ جاتے جس سے ان کے اہلِ خانہ کا گزارہ ہو جاتا۔ لیکن اس وقت تک خاندان حافظ رحمت خاں کے بہی خواہ موجود تھے۔ نواب محبت خاں کے سابقہ تعلقات بھی چند افراد سے اب تک مستحکم تھے، لہذا انھوں نے نواب مرزا علی خاں دلاور جنگ سے یکصد اشرفیاں بطور قرض، خفیہ طور پر برائے اخراجات سفر طلب کیں۔ نواب موصوف نے اس موقع پر رقم فراہم کرکے اپنی وفاشعاری کا ثبوت دیا۔ جیسے ہی نواب محبت خاں کی تنخواہ کی ادائیگی بحال ہوئی نواب محبت خاں نے اظہارِ تشکر کے ساتھ ان کی یہ رقم لوٹا دی اور نواب محبت خاں اس آڑے وقت میں دلاور جنگ کی اس مہربانی کے ہمیشہ شکر گزار رہے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ نواب مرزا علی خاں نے بہت تنگ وقت میں دوستی کا حق میرے ساتھ ادا کیا۔[۳]

---

[۱] سلیمان خاں اسد: نقشِ سلیمانی، ص ۱۲۱۔

[۲] نواب آصف الدولہ محبت خاں کے لیے بظاہر نیک خواہشات کا اظہار کرتے تھے لیکن دوسری جانب انھیں نواب محبت خاں سے خطرہ بھی لاحق رہتا تھا، کیونکہ یہ دل کا چور تھا۔ آصف الدولہ محبت خاں کو مالی اور سیاسی طور پر مضبوط نہیں دیکھنا چاہتے تھے انھیں یہ خیال رہتا کہ مبادا یہ اپنی شکست اور شجاع الدولہ کے مظالم کا بدلہ لینے کے بارے میں نہ سوچیں اسی لیے دورانِ سفر محبت خاں کو اپنے ساتھ رکھتے اور ان کی نگرانی بھی کی جاتی تھی۔

[۳] سلیمان خاں اسد: "نقشِ سلیمانی"، ص ۱۲۱۔

نواب محبت خان کی کلکتے سے واپسی پر انگریز سرکار نے نواب وزیر سے ایک عہد نامہ طے کیا جسکے تحت نواب محبت خان کی تنخواہ کی ادائیگی اور اس کا طریقہ کار طے پایا۔ بموجب عہد نامہ مورخہ ۱۵ اپریل انگریز سرکار نے نواب وزیر آصف الدولہ سے تنخواہ خاندان روہیلہ مبلغ ۵۰ لاکھ روپیہ لینا منظور کیا اس رقم میں تنخواہ کیمپ مقیم کانپور اور فتح گڑھ بھی شامل تھیں البتہ ان کے علاوہ رقم کی ادائیگی انگریز سرکار نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔

اب نواب محبت خان کی تنخواہ لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کی معرفت ملنے لگی اور آپ کمپنی کے متوسلین میں شمار ہونے لگے۔ محبت خان انگریزوں کو اپنا حامی سمجھ کر ریذیڈنٹ کے دربار میں جایا کرتے اور نواب آصف الدولہ کے دربار میں بھی تشریف لے جاتے تھے۔ جب اس معاہدہ کے بعد نواب اودھ سے محبت خان کی صلح صفائی ہو گئی تو نواب محبت خان کی دربار اودھ میں نواب وزیر نے اس طرح پذیرائی کی اور شرف ملاقات بخشا۔

نواب محبت خان کو دربار میں خلعت فاخرہ سے نوازا اور خلعت سترہ پارچہ معہ بیغہ و سرپیچ مرصع و مالائے مروارید و سپر شمشیر و پالکی و اسپ و فیل وغیرہ عنایت فرمایا۔[۲] دربار اودھ

---

[۱] سعادت علی خان کے دور میں جب سرکار کمپنی نے روہیل کھنڈ لے لیا تو کمپنی کے اہل کاروں نے حافظ الملک کی اولاد کی آمدنی کی قلت اور مصارف کی کثرت پر خیال کر کے ان کے وظائف میں اضافہ کرنا چاہا۔ چنانچہ ۱۲۲۰ ھ میں مسٹر سکسن نے اس خاندان کا اضافہ تجویز کر کے گورنر جنرل کو رپورٹ بھیجی جہاں سے ۳۰ ہزار پانچ سو تیرہ روپیہ سالانہ اضافہ منظور ہوا اور یہ حکم ہوا کہ یہ اضافہ سب بھائیوں پر تقسیم ہو اس وظیفے میں حرمت خان، عظمت خان اور اکبر خان بھی شامل ہو گئے جو سابقہ وظیفے سے محروم ہو گئے تھے اسلیئے حالیہ اور سابقہ وظیفہ ملا کر نوے ہزار دو سو اٹھتر روپیہ سالانہ نواب محبت خان کے ۱۱ بھائیوں اور ایک بہن پر تقسیم ہو گیا۔ (بحوالہ اخبار الصنادید صفحہ ۲ ۷ ۵ نجم الغنی خان رامپوری)

[۲] سلیمان خان اسد: "نقش سلیمانی"، ص ۱۲۱۔

اور ریذیڈنسی میں نواب محبت خان کے اعزازات بحال ہونے کے بعد نواب موصوف نے نواب وزیر اودھ اور سرکار انگریز سے روہیل کھنڈ جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور اجازت حاصل کرکے بریلی کی جانب روانہ ہوئے۔ اپنے اس ملک کو دیکھنے کا اشتیاق کیوں نہ ہوگا کہ جس میں انکے والد حافظ الملک انکے بڑے بھائی نواب عنایت خان اور دیگر روہیلے سرداروں نے اپنی بہادری اور سخاوت کے جھنڈے گاڑے تھے۔ جہاں نواب محبت خان کا بچپن گزرا تھا جہاں انہوں نے شہزادگی کے ایام بسر کئے تھے۔ روہیل کھنڈ میں جب یہ اطلاع پہنچی کہ نواب محبت خان کے دربار اودھ میں سرکار انگریز میں اعزازات بحال ہوگئے ہیں اور وہ بریلی تشریف لارہے ہیں تو ساتھ ہی ایک افواہ بھی پھیلی کہ نواب وزیر اودھ نے روہیل کھنڈ نواب محبت خان کے حوالے کردیا ہے۔ یہ جان کر عوام الناس میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی کہ اب نواب موصوف کا مستقل طور پر قیام بریلی میں رہے گا۔ اس خبر پر لوگ جوق در جوق بریلی کی جانب استقبال کی خاطر شاداں فرحاں روانہ ہوئے جب نواب محبت خان بریلی کے قریب پہنچے تو ہزاروں افراد بریلی سے چار کوس کے فاصلے پر جمع ہوگئے تھے۔

نواب محبت خان کا نواب وزیر اودھ کے دربار میں ملاقات کا یہ طریقہ رہا کہ آپ آٹھویں روز جمعے کے دن ملاقات کو جاتے تھے۔ نواب وزیر تعظیم دے کر اپنے پاس بٹھاتے اور برادر کہکر گفتگو کرتے تھے، اور جب عیدین کا موقع آتا تو محبت خان نواب وزیر پر... نچھاور کرتے اور نذر بھی دیتے تھے۔ شادی اور غمی کی تقریبات میں نواب وزیر اودھ خود محبت خان کے دولت خانے پر تشریف لاتے تھے یا اپنے ولی عہد کو شرکت کی غرض سے بھیجتے تھے[1] نواب محبت خان نواب وزیر اودھ کو "نواب صاحب عالی مناصب والامناقب قدرداں نیازمنداں منبع الوجود والاحسان دام اقبالہ بعد ادائے آداب آنکہ رقم کرتے تھے۔ جبکہ دربار اودھ سے نواب محبت خان کو ان القابات سے مخاطب کیا جاتا تھا " بعد سلام آنکہ نواب صاحب مشفق مہربان مخلصان حافظ الملک محبت خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ"[2]

آصف الدولہ نواب وزیر اودھ کے انتقال کے بعد وزیر علی صرف چار ماہ کے لیے مسندِ وزارت اودھ پر فائز رہے[3]۔ انکے بعد نواب سعادت علی خان نواب وزیر اودھ منتخب ہوئے، انکے عہد کا ابتدائی زمانہ تھا کہ نواب محبت خاں کے بھائی نواب ذوالفقار خان بہادر کا انتقال ہو گیا تو نواب سعادت علی خان نے نواب محبت خان سے تعزیت کی، خود ملنے آئے اور جب لکھنؤ میں اس سلسلے میں فاتحہ خوانی کا انعقاد ہوا تو نواب سعادت علی خان نے اپنے بڑے فرزند مرزا غازی الدین حیدر کو فاتحہ میں شرکت کے لیے بھیجا۔ علاوہ ازیں نواب سعادت علی خان نے وزیر اودھ کئی بار دولت خانہ نواب محبت خان تشریف لائے۔ گورنر جنرل سرکار کمپنی سے بھی طریقۂ تحریر و تخاطب یہی رہا[4]

---

[1] سلیمان خاں اسد: "نقشِ سلیمانی"، ص ۱۵۲۔

[2] " " ایضاً ص ۱۶۲۔

[3] نواب سعادت علی خاں وزیر اودھ کے انتقال کے بعد غازی الدین حیدر مسندِ وزارت پر متمکن ہوئے .....

۱۲۲۹ھ تا ۱۲۴۳ھ -
۱۸۱۴ء ۱۸۲۷ء

نواب سعادت علی خاں وزیر اودھ سے ناچاقی

نواب سعادت علی خاں ابن آصف الدولہ نواب وزیر اودھ مقرر ہوئے تو انھوں نے نواب محبت خاں سے تعلقات صرف بحال ہی نہیں رکھے بلکہ اور زیادہ وسعت دینے کی کوشش کی، اور ایک معتمد کے ذریعے محبت خاں کو کہلا بھیجا کہ ہماری مرضی یہ ہے کہ باہم ہماری اور تمھاری کچھ رشتہ داری بھی ہو جائے[1] یعنی اپنی لڑکیاں ہمارے فرزندوں کو اور ہماری لڑکیاں آپ کے فرزندوں کے نکاح میں آجائیں۔ لیکن نواب محبت خاں کو بھلا یہ بات کب گوارا ہو سکتی تھی انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ نواب صاحب والیِ ملک ہیں اور میں ایک قیدی[2]، لہٰذا اس قسم کی نسبتیں نہیں ہو سکتیں۔ میرے اور ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ نواب سعادت علی خاں کے لیے یہ جواب غیر متوقع تھا انھیں یہ جواب ناگوار گزرا، البتہ خاموش رہے۔

حسبِ دستورِ سابقہ نواب محبت خاں بروز جمعہ نواب سعادت علی خاں سے ملاقات کی غرض سے دولت خانے پر پہنچے تو دروازے پر موجود ایک مردھے نے کہا نواب صاحب اس وقت تخلیے میں ہیں، حضور ذرا توقف کریں تاکہ میں اطلاع کرادوں۔ نواب محبت خاں کو یہ بات ناگوار گزری اور سمجھ گئے کہ نواب سعادت علی خاں ناراض ہیں، ورنہ یہ بات خلافِ دستور کیا معنی رکھتی ہے۔ آپ اپنی سواری مع بنگھا و چھاتہ[3] سعادت علی خاں کے در دولت سے پھیر لائے اور اپنے دولت خانے پہنچے۔ اسکے بعد تاحیات ان کی ملاقات کو نہیں گئے۔ اس ناراضگی کا سلسلہ زنانے میں بھی اسی سبب سے ہوا کیونکہ سعادت علی خاں دو ایک مرتبہ محبت خاں کے مکان پر بھی آئے اور انکے ارادوں کا خواتین کو بھی علم ہو گیا تھا اور وہ بھی اس امر کے خلاف تھیں۔ نواب محبت خاں کا سعادت علی خاں کا اس حد تک اختلاف بڑھا کہ ۱۲۱۹ھ میں نواب سعادت علی خاں نے محبت خاں کی رہائش گاہ محلہ رستم نگر متصل کٹرہ نواب محبت خاں، درگاہ جناب حضرتِ عباس تعمیر کروائی۔ محبت خاں کی اصطبل کی زمین درگاہ میں شامل کرنے کے لیے نواب موصوف سے طلب کی

---

[1] سلیمان خاں اسعد نبیرہ محبت: "نقشِ سلیمانی"، ص ۱۵۲۔

[2] نواب علی محمد خاں نے حافظ رحمت خاں سے ملک روہ سے مستقل طور پر ہندوستان آنے کی درخواست کی تھی تو اس وقت حافظ الملک نے فرمایا تھا "چند پشت سے ہم نے کسی کی نوکری نہیں کی ہے اور نہ اپنی بیٹیاں اپنی قوم کے علاوہ کہیں بیاہی ہیں لہٰذا ان باتوں پر ہمیں مجبور نہ کیا جائے تو ہم آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتے ہیں"۔

[3] محبت خاں کی خاص سواری ہاتھی، بنگھا اور چھاتہ کے ساتھ ہوتی تھی

لیکن نواب محبت خاں نے صاف انکار کردیا اور فرمایا میرے اپنے قیام کے لیے مکانات کی قلت ہے، میں مزید زمین اس سلسلے میں حاصل کرنا چاہتا ہوں، زمین کا دینا کیسا۔[1] نواب محبت خاں کے انکار پر نواب وزیر نے ریذیڈنٹ لکھنؤ سے بھی سفارش کروائی، لیکن محبت خاں نے انکار کردیا۔ آخر نواب وزیر نے مجبور ہو کر سید خواجہ حسن[2] سے کہا کہ میاں صاحب اصطبل کی یہ زمین تم محبت خاں سے دلادو۔ نواب محبت خاں اور سید خواجہ حسن میں اتحاد و دوستی مشہور اور مثالی تھی وہ دونوں ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ نواب محبت خاں کے پیرزادوں میں سے تھے۔ سید خواجہ حسن نے نواب محبت خاں سے وہ زمین اپنے لیے طلب کی اور پھر حاصل کر کے نواب سعادت علی خاں کو دے دی اور اسطرح درگاہ کی مشرقی عمارت اسی زمین پر تعمیر کی گئی۔

---

[1] سلیمان خاں اسعد: نقش سلیمانی ص ۱۵۲۔

[2] خواجہ حسن چشتی ایک سید زادے تھے۔ محبت خاں کی مصاحبت میں رہتے تھے آصف الدولہ اور سعادت علی خاں بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سعادت علی خاں راجہ ٹیکیت رائے کے باغ میں ناچ دیکھ رہے تھے ایک اجاگر نامی طوائف مجرا کر رہی تھی سید خواجہ حسن چشتی بھی موجود تھے۔ نواب موصوف اس وقت نشے کی حالت میں تھے۔ اس رنڈی سے فرمایا "اجاگر میاں صاحب کی گود میں بیٹھ جا" اس نے قصد کیا تو میاں صاحب نے اشارہ سے روک دیا چند ساعت کے بعد پھر نواب صاحب نے اس طوائف سے یہی کہا اس نے پھر قصد کیا، میاں صاحب نے اسکو جھڑکا تو وہ الگ ہو گئی، میاں صاحب کو بات ناگوار گزری اور خیال کیا نواب صاحب خلاف عادت اس وقت مجھ سے مذاق کرتے ہیں نواب صاحب نے تیسری مرتبہ برہم ہو کر اس سے فرمایا کہ ہم تجھ سے چند مرتبہ کہہ چکے تو میاں صاحب کی گود میں نہیں بیٹھ جاتی۔" اس وقت وہ رنڈی خوف حاکم سے مجبور ہو کر قریب میاں صاحب کے آگئی اور قصد گود میں بیٹھ جانے کا کیا، میاں صاحب نے اسکو ہاتھ سے ڈھکیل کر فرمایا "دور ہو یہاں سے یہ گود سالزادوں کے بیٹھنے کی نہیں اسمیں وزیر زادیاں اور شہزادیاں بیٹھیں تو کیا مضائقہ ہے۔" یہ بات نشے کی حالت میں بھی سعادت علی خاں کو ناگوار گزری اور بجائے تم کے تو کے لفظ سے میاں صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا یہ کیا بات بیہودہ کہی۔ اس وقت میاں صاحب کو غصہ ضبط کرنے کی تاب نہ رہی اور خنجر پر ہاتھ ڈال کر فرمایا اے دختر شجاع الدولہ خاموش اگر دوبارہ ایسا کلمہ زبان سے نکالا تو اسی وقت اپنی جان اور تمہاری جان ایک کر دونگا اور سینہ پر چڑھ کر لہو پیا چاہتا تھا۔ اس سخن پر نواب نے گردن جھکا لی۔ اس دن سے نواب اور میاں صاحب میں رنجش ہو گئی۔ میاں صاحب کا وظیفہ بھی بند کر دیا گیا۔ نواب محبت خاں نے میاں صاحب کی منت سماجت کر کے انکو نواب صاحب سے ملنے پر راضی کیا۔ نواب سعادت علی خاں شکار پر گئے تھے۔ نواب محبت خاں میاں صاحب کو وہیں ملاقات کرانے لے گئے۔ اتفاقاً نواب سعادت علی خاں کے ساتھ راستے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ ایک تلنگہ نواب سعادت علی خاں پر حملہ آور ہوا۔ خواجہ حسن چشتی نے نواب کی جان بچائی اور پھر ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی۔

خواجہ حسن کے بارے میں قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ خواجہ حسن دہلوی ولد خواجہ محمد ابراہیم ابن غیاث الدین ابن محمد شریف ابن ابراہیم جو کہ [illegible] موجود ہی اور نیا خواجہ حسن مشہور ہے یہ سید حسینی ہے آبا و اجداد اسکے شاہجہاں آباد میں پہاڑی پر رہتے تھے۔ چند سال اول تذکرہ لکھنے، علی خواجہ ابراہیم حسن کے آ کر لکھنؤ میں رہا پسر کار نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے افسروں میں منسلک ہوا۔ بیشتر بریلی میں رہتا تھا۔ علم موسیقی اور ریاضی میں اسکی شہرت تھی علم ہیئت میں بھی محنت کرتا تھا۔ خصوصاً تعرف بہت جانتا تھا۔ صاحب دیوان ہے۔ جرأت سے ابتدا میں اصلاح لی خوش طبع اور تماشا بین آدمی تھا۔ جفر نجوم وغیرہ علوم طلسمات میں معروف رہتا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے (تاریخ اودھ جلد چہارم۔ نقش سلیمانی ص ۹۸۔ طبقات الشعراء۔ اردو کی منظوم داستانیں ص ۳۲۷۔)

لیکن نواب محبت خاں نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا میرے اپنے قیام کے لیے مکانات کی قلت ہے، میں مزید زمین اس سلسلے میں حاصل کرنا چاہتا ہوں، زمین کا دینا کیسا۔[1] نواب محبت خان کے انکار پر نواب وزیر نے ریذیڈنٹ لکھنؤ سے بھی سفارش کروائی، لیکن محبت خان نے انکار کر دیا۔ آخر نواب وزیر نے مجبور ہو کر سید خواجہ حسن[2] سے کہا کہ میاں صاحب اصطبل کی یہ زمین تم محبت خان سے دلا دو۔ نواب محبت خان اور سید خواجہ حسن میں اتحاد و دوستی مشہور اور مثالی تھی وہ دونوں ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ نواب محبت خان کے پیرزادوں میں سے تھے۔ سید خواجہ حسن نے نواب محبت خان سے وہ زمین اپنے لیے طلب کی اور پھر حاصل کر کے نواب سعادت علی خاں کو دے دی اور اسطرح درگاہ کی مشرقی عمارت اسی زمین پر تعمیر کی گئی۔

---

[1] سلیمان خان اسد: نقش سلیمانی ص ۱۵۲۔

[2] خواجہ حسن چشتی ایک سید زادے تھے۔ محبت خاں کی مصاحبت میں رہتے تھے آصف الدولہ اور سعادت علی خان بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سعادت علی خان راجہ ٹیکیت رائے کے باغ میں ناچ دیکھ رہے تھے ایک اجاگر نامی طوائف مجرا کر رہی تھی سید خواجہ حسن چشتی بھی موجود تھے۔ نواب موصوف اس وقت نشے کی حالت میں تھے۔ اس رنڈی سے فرمایا "اجاگر میاں صاحب کی گود میں بیٹھ جا اس نے قصد کیا تو میاں صاحب نے اشارہ سے روک دیا چند ساعت کے بعد پھر نواب صاحب نے اس طوائف سے یہی کہا اس نے پھر قصد کیا، میاں صاحب نے اسکو جھڑکا تو وہ الگ ہو گئی میاں صاحب کو بات ناگوار گزری اور خیال کیا نواب صاحب خلاف عادت اس وقت مجھ سے مذاق کرتے ہیں نواب صاحب نے تیسری مرتبہ برہم ہو کر اس سے فرمایا کہ ہم تجھ سے چند مرتبہ کہہ چکے تو میاں صاحب کی گود میں نہیں بیٹھ جاتی"۔ اس وقت وہ رنڈی خوف حاکم سے مجبور ہو کر بہت قریب میاں صاحب کے آ گئی اور قصد گود میں بیٹھ جانے کا کیا، میاں صاحب نے اسکو ہاتھ سے ڈھکیل کر فرمایا "دور ہو یہاں سے یہ گود سالزادوں کے بیٹھنے کی نہیں اسمیں وزیر زادیاں اور شہزادیاں بیٹھیں تو کیا مضائقہ ہے"۔ یہ بات نشے کی حالت میں بھی سعادت علی خاں کو ناگوار گزری اور بجائے تم کے تو کے لفظ سے میاں صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کیا بات بیہودہ کہی۔ اس وقت میاں صاحب کو غصہ ضبط کرنے کی تاب نہ رہی اور چہرے پر ہاتھ ڈال کر فرمایا اے دختر شجاع الدولہ خاموش اگر دوبارہ ایسا کلمہ زبان سے نکالا تو اسی وقت اپنی جان اور تمہاری جان ایک کر دوں گا اور سینہ پر چڑھ کر لہو پی جاؤں گا۔ اس سختی پر نواب نے گردن جھکا لی۔ اس دن سے نواب اور میاں صاحب میں رنجش ہو گئی۔ میاں صاحب کا وظیفہ بھی بند کر دیا گیا۔ نواب محبت خان نے میاں صاحب کی منت سماجت کر کے انکو نواب صاحب سے ملنے پر راضی کیا۔ نواب سعادت علی خاں شکار پر گئے ہوئے تھے۔ نواب محبت خاں میاں صاحب کو وہیں ملاقات کرانے لے گئے۔ اتفاقاً نواب سعادت علی خاں کے ساتھ راستے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ ایک تلنگا نواب سعادت علی خاں پر حملہ آور ہوا۔ خواجہ حسن چشتی نے نواب کی جان بچائی اور پھر ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی۔

خواجہ حسن کے بارے میں قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ خواجہ حسن دہلوی ولد خواجہ محمد ابراہیم ابن عنایت اللہ ابن محمد شریف ابن ابراہیم چونکہ بخاری موجود ہیں اور بنام خواجہ حسن مشہور ہے یہ سید حسینی ہے آبا و اجداد انکے شاہجہاں آباد میں پہاڑی پر رہتے تھے۔ چند سال اول تذکرہ لکھے، علی خواجہ ابراہیم حسن کے آ کر لکھنؤ میں رہا پسر کلاں نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے افسروں میں نوکری ہوا۔ بیشتر بریلی میں رہتا تھا۔ علم موسیقی اور رمالی میں اسکی شہرت تھی، علم ہیئت میں بھی محنت کرتا تھا۔ خصوصاً تعرف بہت جانتا تھا۔ صاحب دیوان ہے۔ جعفر علی حسرت سے ابتدا میں اصلاح لی۔ خوش طبع اور تماشا بین آدمی تھا۔ جنتر منتر وغیرہ علم طلسمات میں مصروف رہتا تھا۔ توضیح کے لیے دیکھیے (تاریخ اودھ جلد چہارم) ص ۹۸ – ۱۔ نقش سلیمانی

طبقات الشعراء – اردو کی منظوم داستانیں)

ص – ۳۲۷ –

وجاہت، لیاقت اور فیاضی

نواب محبت خان روہیلہ قوم میں وجیہہ وشکیل اور بالیاقت وصلاحیت انسان تھے

ایک مرتبہ جہاندار شاہ کسی ناراضگی کے سبب دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے۔ شہزادہ جہاندار شاہ نے خواجہ حسن کی معرفت نواب محبت خان کو بلوایا[1] شہزادہ موصوف نواب موصوف کی وجاہت دیکھ کر دنگ رہ گئے بہت تعریف وتوصیف فرمائی انکی نشست وبرخاست اور گفتگو سے نہایت محظوظ ہوئے اور خطاب نواب مظفر الدولہ شہباز جنگ سے سرفراز فرمایا ایک روز تخلیے میں چار ہزار روہیلوں سے مدد چاہی تاکہ دہلی کے تخت پر قابض ہو سکیں کیونکہ بادشاہ دہلی اس وقت نابینا ہو چکے تھے اس مدد کے صلے میں شہزادے نے نواب صاحب کو کامیابی کے بعد حسب حیثیت نوازنے کا وعدہ بھی کیا لیکن محبت خان نے سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا اور بادشاہ دہلی کے خلاف بغاوت میں شریک نہیں ہوئے جب شہزادے نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تو وہ ناکام و نامراد لوٹا اور دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔

مؤلف سیر المتاخرین کے مطابق "میں نے شجاع الدولہ کی وفات کے بعد آصف الدولہ کی حکومت کے آغاز میں حافظ رحمت خان اور دوندے خاں کی اولاد کو اکثر لکھنؤ میں دیکھا اور انکی کیفیت خود شاہدہ کی اور لوگوں کی زبانی بھی سنی، اس جماعت میں سب سے بہتر محبت خان ابن حافظ رحمت خان ہے جو عنایت خان کا چھوٹا بھائی ہے یہ شخص صورت وسیرت دونوں کے لحاظ سے حکومت اور سرداری کی لیاقت رکھتا ہے لیکن اس سفلہ پرور زمانے میں اسکے لیے بہت تھوڑی معاش کھونگ وعار کا موجب ہے مقرر کی گئی ہے۔ اور نواب فیض اللہ خان کو ۲۰ لاکھ روپیہ کی آمدنی کا ملک دیا ہے۔ حالانکہ روہیلوں کے اقتدار کے زمانے میں انکے پاس . . . .

---

[1] حیات حافظ رحمت خان کے مطابق نواب آصف الدولہ نے محبت خان کو بھی ان سے ملاقات کرنے کا موقع دیا جبکہ نقش سلیمانی کے مطابق خواجہ حسن کی معرفت شہزادے نے محبت خان کو بلوایا اور تخلیے میں اپنا عندیہ بیان کیا یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ نواب صاحب کو شہزادے نے خود بلوایا ہوگا اور خواجہ حسن کے ذریعے ہی یہ پیغام بھجوایا ہوگا کیونکہ خواجہ حسن کے محبت خان سے تعلقات کسی سے پوشیدہ نہ تھے ورنہ آصف الدولہ ایسا موقع کیوں فراہم کرتے گے۔

پانچ لاکھ روپیہ کی آمدنی سے زیادہ کا ملک نہ تھا۔ اس چرخ جفاکار کی سفلہ پروری کا بیان حیطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے[1]۔ مؤلف عماد السعادت بھی رقم طراز ہے کہ "نواب محبت جیسا باغیرت اور صاحب لیاقت رئیس بہت کم نظر سے گزرا ہے[2]۔" حیات حافظ رحمت خاں کے مطابق " میر محسن صاحب نے جن کا انتقال غدر سے دو تین سال قبل ہوا تھا، مؤلف تاریخ سلطانی خاں اسد نبیرۂ محبت سے بقسم کہا تھا کہ میں نے از عہد آصف الدولہ تا ایں دم محبت خاں سا خوبصورت آدمی نہیں دیکھا"۔ قدرت اللہ شوق طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں۔

"جوانے ست نازک طبع خوش قماش و خوبصورت، مجمع استعداد و قابلیت، معدنِ محبت، مخزنِ مروت حافظ رحمت الٰہی متبدا فیض نامتناہی مورد عنایت ربانی مصدرِ ارادت کامرانی صاحب عظمت و حشمت و کرش بے پایاں و حرمتش جاوداں من کل الوجوہ باذہنش رسا مجموعۂ نغز میں حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم فرماتے ہیں۔

"نواب محبت اللہ خاں سلمہ الرحمٰن خلف الصدق حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید غفرہ اللہ المجید شکوہ و ثروۃ و عمدگی و شوکت الشان بنابر غایت وضوح و نہایت شیوع محتاج تسطیر و مفتقر تحریر نیست گویند کہ بسیار صاحب مروۃ و ہوشیار و جواد و باوقار صاحب حلم و بامیا خلیق و مودۃ آماواقع شدہ"۔

مرزا لطف علی گلشن ہند میں بیان کرتے ہیں " جوان خوش ظاہر خوش رو ہیں اور خوش اختلاط و خوش ضو حسن خلق سے معمور اور مروت و جواں مردی کے ساتھ مشہور"۔

---

[1] نجم الغنی رامپوری نے اخبار الصنادید میں نواب محبت خان کے اس عمل پر کہ شجاع الدولہ کے کرائے کے سپاہی ہوئے بڑی نادانی اور بزدلی پر محمول کیا ہے اور یہ درست بھی ہے کہ اگر نواب محبت خان اپنے دوسرے بھائیوں کو ساتھ لے کر نواب فیض اللہ خان کی طرح لال ڈانگ نکل جاتے تو ان کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا اور شجاع الدولہ کو ایسا ہی رویہ محبت خان کے لیے بھی اختیار کرنا پڑتا جیسا کہ اس نے فیض اللہ خان کے لیے کیا۔ شجاع الدولہ کی طاقت دو حصوں میں بٹ سکتی تھی۔ نواب حرمت خان نے اپنے تئیں بہت کوشش کی وہ اکیلے افغانستان تک گئے لیکن کسی نے ان کی مدد نہیں کی۔ اگر محبت خان تمام بچے کھچے روہیلوں کے ساتھ یکجا ہوتے تو مدد بھی کہیں نہ کہیں سے ملتی اور روہیل کھنڈ کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔

[2] اسمیں غیرت و حمیت کا پہلو یہ تھا کہ جب نواب وزیر اودھ سعادت علی خان نے نواب محبت خان کے خاندان میں لڑکے اور لڑکیوں کی شادیاں کرکے باہم رشتہ داریاں قائم کرنی چاہیں تو آپ نے انکار کر دیا۔ اس پر نواب وزیر برافروختہ بھی ہوئے۔

بیشتر تذکروں نگاروں نے نواب محبت خان کو خوش شکل خوش وضع اور پُر شکوہ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ بامروت نواب لکھا ہے۔ وہ خوش شکل اور بذلہ سنج شخصیت کے مالک تھے حلم وحیا سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مصاحبین کے ساتھ مالی سلوک بھی کرتے تھے [1]۔ جرأت تو انکی سرکار میں نوکر بھی تھے جبکہ جعفر علی حسرت کی بھوان کے استاد تھے، مالی اعانت کرتے رہتے تھے۔ آپ زیادہ بلند آواز سے گفتگو نہیں فرماتے تھے، اور نہ تیز رفتاری کی عادت تھی بلکہ خراماں خراماں چلنے کے عادی تھے۔ اکثر نواب آصف الدولہ ان کو دور ہی سے دیکھ کر فرماتے تھے کہ آؤ برادر آؤ لیکن نواب محبت خان اس پر بھی اپنی معمولی رفتار کو قائم رکھتے اور اپنا قدم جلد جلد نہ اٹھاتے، ایک روز آصف الدولہ نے سید خواجہ حسن سے شکایت کی کہ میں نواب محبت خان کو دیکھکر دور سے پکارتا ہوں لیکن عجب آدمی ہیں کہ اپنا قدم تیز نہیں اٹھاتے، سید صاحب نے جواب دیا کہ "آپ دونوں وضعدار ہیں آپ ان کو ہمیشہ دور ہی سے دیکھ کر آواز دیتے ہیں اور وہ ہر حال میں اپنی ایک سی رفتار رکھتے ہیں" [2] نواب محبت خان کی وضعداری اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ جب نواب آصف الدولہ نے نواب محبت خان اور ان کے دیگر اہل خاندان کے مشاہرے کے بارے میں تساہل برتا جس سے خاندان حافظ رحمت خان پریشانیوں کا شکار ہوا تو نواب موصوف نے آصف الدولہ سے استغاثہ نہیں کیا بلکہ آصف الدولہ کی شکایت کرنے کلکتہ روانہ ہوئے تاکہ گورنر جنرل سے نواب وزیر اودھ کی شکایت کرسکیں۔

---

[1] نواب محبت خان کے مختار نے ایک دفعہ جاڑے میں معمولی پوشاک دینے میں کچھ دیر کی جرأت نے یہ رباعی لکھکر خلعت حاصل کیا۔

مختار ہیں آپ کیجیے گا نہ گھمنڈ ۔ کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیج ارنڈ
سرما کی دلائیے ہماری ورنہ ۔ تم کھاؤ گے گالیاں ہم کھائیں گے ٹھنڈ

[2] نواب محبت خان وزیر اودھ آصف الدولہ کی حکمرانی میں رہتے تھے لیکن نواب محبت خان کا اپنا ایک مقام تھا لہذا اس دور میں بھی ان کی وضعداری کا وہی انداز رہا جو کہ روہیل کھنڈ کی شہزادگی کے دوران تھا۔

علمِ سپہ گری

علم و ادب میں فضیلت رکھنے کے علاوہ نواب محبت خاں فنِ سپہ گری و حرب سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ فنِ سپہ گری کے ماہر تھے انھوں نے کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ حافظ رحمت خاں کا پورا خاندان برسوں میدانِ کارزار میں رہا۔ حافظ رحمت خاں نے اس ضمن میں بھی اپنے بیٹوں کو کسی سے پیچھے نہیں رہنے دیا۔ اس دور میں ایک سردار کے لیے شاعری اور سپہ گری لازم سمجھے جاتے تھے اور ایک سردار کی قابلیت کا معیار دیکھنے کے لیے ان باتوں کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ ۱۷۷۰ء میں چند مخالفین نے حافظ رحمت خاں اور ان کے بڑے بیٹے عنایت خاں کے درمیان اتنی بڑی خلیج پیدا کر دی کہ عنایت خاں اپنے والدِ محترم حافظ الملک کے خلاف میدان جنگ میں اتر آئے۔ اس چھوٹے معرکے میں محبت خاں اپنے دوسرے چند بھائیوں کے ساتھ اپنے والد کی فوج میں شامل تھے اور اپنے بڑے بھائی کے خلاف میدانِ جنگ میں موجود تھے[۱]۔ کٹرہ میراں پور کی جنگ میں شجاع الدولہ اور انگریزوں کی مشترکہ فوج کے مقابلے میں آپ اپنے دوسرے بھائیوں اور والد حافظ رحمت خاں کے ساتھ دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ جب حافظ رحمت خاں اس جنگ میں شہید ہو گئے تو نواب محبت خاں غیظ و غضب کے عالم میں اپنے گھوڑوں پر سوار فوجِ غنیم کے قلب میں بڑھنے لگے تاکہ دشمن سے اپنے والد کی موت کا بدلہ لیں یہاں تک خود بھی شہید ہو جائیں۔ لیکن ایک مصاحب نے یہ کہکر "پہلے بکھری ہوئی فوج جمع کر لیں پھر مقابلہ کریں گے" مصلحت اندیشی سے کام لے کر میدانِ کارزار سے محبت خاں کو نکال لیا۔ اس سلسلے میں جعفر علی حسرت کے قصیدے کے چند اشعار دیکھیے۔ ۱۵۱ اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ حسرت کے دیوان اول میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں؛[۲]

یا تیرا جاہ و حشم رشک ہے اسکندر کا
یا تیرا اگزرا ہے رستم سے بھی زورِ بازو

یا تیری تیغ کا جوہر ہے یہ جوں ابرِ غضب
جس طرف رو کرے برسا دے دو عالم میں لہو

یا کہ ہے اسمیں یہ کچھ کاٹ کہ ہر کوہ کے تئیں
سایہ اس کا کرے دو ٹکڑے بہ مثلِ کدو

اس دور میں ملک گیری سیف و قلم کے ساتھ چلتی تھی، ریاست و سیاست لازم و ملزوم سمجھی جاتی تھی۔ کسی بہادر کا فنونِ سپہ گری سے واقف ہونا ضروری تھا، اسی طرح شاعری فہم و فراست کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔

۱- اپنے والد حافظ رحمت خاں کے ساتھ ارادت خاں، محبت خاں، حافظ محمد یار خاں، عظمت خاں اور حرمت خاں میدانِ جنگ میں تھے۔ جبکہ عنایت خاں کے ساتھ محمد دیدار خاں اور اللہ یار خاں تھے۔ ۲- دیوانِ حسرت قلمی نیشنل میوزیم، کراچی، دیوانِ اول ص ۳۷

موسیقی سے دل چسپی

جہاں تک موسیقی کی تاریخ کا تعلق ہے تو یہ دنیا کے ہر علاقے میں ساز و آواز کے مختلف انداز میں موجود رہی ہے نواب محبت خان کے والد حافظ رحمت خان سلسلہ عالیہ قادریہ سے بیعت تھے اور وہ خود بھی ایک بہت متقی و پرہیزگار بزرگ تھے لہذا رقص موسیقی سے دور رہتے تھے لیکن اس دور میں نوجوانوں کو رقص و موسیقی سے دور رکھنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ سلطنت مغلیہ کے دربار کے عیش و عشرت کے افسانے دور تک مشہور تھے اور رقص و سرود کی یہ محفلیں موسیقی کے بغیر ناممکن تھیں۔ نواب محبت خان ہندوستان کی اس سرزمین پر پلے بڑھے تھے جو اس براعظم میں داخل ہونے والی ترقی یافتہ قوموں کی آماجگاہ بنا رہا ہے اسکی گود میں عظیم تہذیبیں پلی اور بڑھتی رہی ہیں فنون لطیفہ میں برصغیر کا علاقہ ہمیشہ پیش پیش رہا ہے کہ خیبر ایران اور توران سے آنے والے لوگ اس علاقے کے مختلف حصوں میں پھیل گئے علوم و فنون میں مسلمان بادشاہوں نے سرپرستی اور مسلمان فنکاروں کی ذہانت نے نئے نئے راستے دکھائے۔ اختراعات و ایجادات ہوتی رہیں جبکہ موسیقی کے باب میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے صدیاں بیت گئی کہ موسیقی روحانی غذا ہے موسیقی کا ذکر جب چھڑتا ہے رقص پر ضرور بحث ہوتی ہے۔

شاہد احمد دہلوی[1] فرماتے ہیں کہ رقص جسم کی شاعری ہے اور شعر کی طرح رقص بھی کسی نہ کسی بیش قیمت تجربے یا کیفیت کا متحمل ہوتا ہے[2] مغلیہ سلطنت میں بادشاہوں اور شہزادوں کے حضور رقص و سرود کی محفلیں عام تھیں روہیل کھنڈ میں ان رقص و سرود کی محفلوں کا انعقاد نواب وزیر کے زمانے میں باقاعدہ شروع ہو گیا تھا کیونکہ نواب شجاع الدولہ کے والد صفدر جنگ سلطنت کے وزیر تھے اور پھر مغلیہ شہزادوں کے عیش و عشرت اور بے فکری کی داستانیں ہندوستان کے پورے علاقے میں عام تھیں۔ جہاں تک خاندان حافظ رحمت خان کا تعلق ہے تو ان کے یہاں وہ صورت حال تو نظر نہیں آتی لیکن نواب عنایت خان شجاع الدولہ کے دربار سے اپنے دربار کو کمتر نہیں سمجھتے تھے خاندان حافظ رحمت خان میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بہت سی روایات سے بغاوت کی۔ روہیل کھنڈ میں قیام کے دوران خاندان حافظ رحمت خان میں رقص و موسیقی کا کوئی ذکر نہیں ملتا

۱؎ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پوتے جو موسیقی کے ماہر بھی تھے۔

۲؎ "ساقی" شاہد احمد دہلوی نمبر صفحہ ۵۹۶ - مصنفہ شاہد احمد دہلوی "رقص"

البتہ عنایت خان بہادر، نواب محبت خان اور انکے دیگر بھائیوں[1] کی شادیوں کے مواقع پر رقص وسرود کی جو محفلیں منعقد ہوئیں ان کا ذکر قدرے تفصیل سے گلستان رحمت میں موجود ہے۔ شادی حافظ محمد یار خان خلف حافظ رحمت خان کے موقع پر تصویر کشی کرتے ہوئے نواب مستجاب خان لکھتے ہیں۔

"ترانہ ارباب نشاط وزمزمہ اصحاب انبساط در ریلیل ونہار صلای عام ابتہاج وشادمانی بلند آوزہ کردانیدہ غم معمزنان ازلی را بشادی مبدل میکردو آہنگ وبربط وچنگ ونغمہ راگ در رنگ در رحباح ومسادلوعشرت وکامرانی دادہ منغصاں روز الست را فرحاں وشاداں میساخت"[2]

نواب محبت خان اور ان کے چھوٹے بھائی نواب دیدار خان عرف منگل خاں کی شادی کے مواقع پر بھی رقص وموسیقی کی جو تقاریب منعقد ہوئیں ان کا اہتمام محبت خان کے بڑے بھائی نواب عنایت خان نے نہایت دھوم دھام سے کیا تھا۔ نواب عنایت خان اس وقت حاکم بریلی تھے ان تقریبات پر عنایت خان نے دل کھول کر دولت خرچ کی۔ گلستان رحمت میں تحریر ہے[3] "چوں از اطلاع ایں جشن ہا کہ مکرر ومتواتر گردید از اطراف واکناف عالم لولیاں ورقاصاں سازندہ ولنوازندہ جمع آمدہ بودند آری وجود ایشاں در انجمن وقت ناگزیر است" آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"بموجب حکم عنایت خاں بہادر مجلسِ سماع ورقص انعقاد می یافت در وظیفہ وانعام لولیاں ورقاصاں وسازندہ نواز ولنوازندہ روزانہ از سرکار عالی میرسد"

مندرجہ بالا تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب محبت خاں کے بھائیوں اور خود نواب محبت خاں کی شادی کے موقع پر رقص وسرود کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ جہاں تک مختلف سازوں

---

[1] نواب عنایت خان، حافظ محمد یار خان، نواب محبت خان، نواب دیدار خان عرف منگل خان کی شادیوں کے بارے میں گلستان رحمت میں تحریریں ملتی ہیں۔

[2] گلستان رحمت صفحہ ۳۰۸ از نواب مستجاب خان "فارسی قلمی"

[3] گلستان رحمت صفحہ ۳۱۵ " " " "

کا تعلق ہے تو کوہستانی علاقوں کے سازوں کو بھی یہ روہیلے ہندوستانی علاقے میں متعارف کراتے رہے اور ہندوستانی سازوں کے سنگم سے نئے نئے آہنگ کا اضافہ ہوا۔ حافظ رحمت خان نے روہیل کھنڈ کے علاقے کو تین مرتبہ اپنے اور نواب علی محمد خان کے بیٹوں میں تقسیم کیا۔ محمد یار خان امیر جو نواب فیض اللہ خان کے چھوٹے بھائی تھے انھوں نے آنولہ کے قریب ایک بستی ٹانڈہ اپنا مستقر بنایا۔ موصوف موسیقی میں یکتائے روزگار تھے[1] مصحفی نے نواب محمد یار خان امیر کے متعلق لکھا ہے "در علم موسیقی و ستار زدن یگانۂ روزگار در غنائی و زیبائی جوانے بود باغ و بہار۔" اسی طرح خواجہ حسن سلسلہ خواجہ کیاری چشتی مودودی سے تعلق رکھتے تھے[2] دہلی کے معروف درویش تھے، خاندان روہیلہ میں ان کی قدر و منزلت تھی نواب محبت خان سے ان کے نہایت قریبی تعلقات تھے یہ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ وہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، موسیقی اور درویشی میں مشہور تھے۔[3] جہاں تک نواب محبت خان کی موسیقی سے دلچسپی کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ نواب موصوف کو موسیقی کا شوق تو قیام روہیل کھنڈ کے زمانے سے ہوگا لیکن لکھنؤ آنے کے بعد اس میں اضافہ ہوا، کیونکہ جرأت و خواجہ حسن جیسے ساتھی لکھنؤ میں مستقل دوستوں اور مصاحبوں کی شکل میں ملے بلکہ جرأت تو ان کی سرکار میں ملازم تھے اور لکھنؤ میں جہاں نواب محبت خان نے شعراء کی سرپرستی کی وہاں انکی سرکار میں موسیقار مالی امداد پاتے تھے۔ لکھنؤ کے بعض گویے آپکے پاس نوکر بھی تھے[4] خواجہ حسن اور جرأت کو بھی موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔

---

[1] محمد امیر خان امیر روہیلہ حکومت سے سالانہ پچاس ہزار روپیہ وظیفہ پاتے تھے۔ شاعری، موسیقی اور سیر و شکار میں بسر ہوتی تھی۔ موسیقی میں یکتائے روزگار تھے (بحوالہ رامپور کا ماحول شعر و سخن صفحہ ۴۰ نگار اگست ۱۹۵۸ء)

[2] خواجہ حسن کا مکان محلہ پہاڑ گنج دلی میں تھا بعد میں وہ ترک سکونت کر کے بریلی آگئے تھے۔

[3] خواجہ حسن چشتی تصوف کے رموز سے آشنا اور علم نجوم سے بھی واقف تھے تذکرہ ہندی کے مطابق "صوفی مشرب اکثر مسائل صوفیہ یارا کہ مراد از وحدت وجود باشد بدلائل و براہین چنانکہ شیوہ صوفیاں باافضل و کمال است از روئے نص و حدیث باثبات رسانید"

[4] سید الطاف علی بریلوی: "حیات حافظ رحمت خان"، ص ۳۲۴ –

قیامِ لکھنؤ

نواب محبت خان کے والد حافظ رحمت خان کٹرہ میران پور کی جنگ میں شہید کر دیئے گئے۔ اس وقت شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر بنا رکھا تھا۔ اس جنگ سے ایک سال کے اندر ہی شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور پھر آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ نواب محبت خان ان کے ساتھ ہی وظیفہ خوار کی حیثیت سے فیض آباد میں رہے لیکن جب آصف الدولہ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے تو انکے ساتھ ہی نواب محبت خان بھی لکھنؤ منتقل ہو گئے[1] اور مستقل قیام لکھنؤ میں اختیار کیا۔ مؤلف نقشِ سلیمانی کے مطابق :-

> نواب محبت خان نے حسب الحکم نواب آصف الدولہ بہادر کے شہر لکھنؤ محلہ رستم نگر میں مکانات لال بی ہرکارہ کو جو عہد نواب صفدر جنگ و شجاع الدولہ میں بہت اقتدار رکھتا تھا اور ایک چاہ تعمیر کردہ اس کا محلہ مذکورہ میں جانب شرق زیر دلوا باغ آغا مرزا ابتک موجود ہے، لبعد ازاں بہ سبب کثرتِ اولاد وغیرہ کے اور مکانات بھی گرد و پیش اس کے خرید کئے۔ یہ سب اس وقت تک بنام کٹرہ نواب محبت خان مشہور رہے۔ ابتداء میں یہ جگہ نواب محبت خان کی کثیر اولاد اور اہلِ خاندان کی وجہ سے تنگ تھی لیکن آہستہ آہستہ نواب محبت خان نے انکی رہائش گاہ کے قریب کے کچھ مکانات خرید لیے تھے[2]۔

---

[1] ۱۱۹۶ھ۔

[2] نواب سعادت علی خاں سے نواب محبت خان کی ناچاقی ہو گئی تھی، اسلیے پہلے تو انھوں نے اپنے اصطبل کی جگہ درگاہ کے لیے دینے سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں خواجہ حسن کے کہنے سے زمین دے دی تھی۔

تاریخ لکھنؤ کا ایک اور اقتباس دیکھیے۔

ظہور ہوا کہ اولاد نواب محبت خان جو پہلوئے درگاہ رہتے ہیں، یہ سب وزیر باغ جو قریب ہے اس میں جا کر رہیں اور اکثر محرم میں فساد ہوا کرتا ہے۔ اور اس جگہ عباس گنج[1] آباد کیا جائے۔ اولاد نواب محبت خان نے نواب معتمد الدولہ سے عرض کیا نواب صاحب عالی کو کچھ سمجھا کر اس تجویز کو برہم کر دیا[2]۔ اب جہاں تک نواب محبت خان کے رہائشی محلے کے نام کا تعلق ہے تو اسکے بارے میں تاریخ لکھنؤ میں تحریر ہے[3]۔

تاریخ میں صراحت نہیں ملتی کہ رستم نگر کس کا بسایا ہوا ہے۔ عہد نصیر الدین حیدر میں رستم خان قاسم خان کا کہیں کہیں ذکر آتا ہے جو شیخ مراد بنارس کی نسل سے تھے، ماں کا نام جمیل النساء اور باپ بیگ تھے اور کچھ تعجب نہیں اگر یہ محلہ ان کی یادگار ہو۔ رستم نگر میں معززین لکھنؤ آباد تھے اور جگہ جگہ اہل دول کی ڈیوڑھیاں تھیں ایک قبرستان کا بھی ذکر ہے جو کھیتوں کے حصے میں ہے۔ اس محلے کے بہتیرے آثار قدیمہ مٹ گئے ہیں اور کچھ اب بھی باقی ہیں۔

---

[1] درگاہ حضرت عباس کی مناسبت سے عباس گنج نام رکھنے کی تجویز ہوئی۔

[2] یہ واقعہ نواب محبت خاں کے انتقال کے بعد کا ہے۔ اولاد محبت خان ویسے بھی اتنی آسانی سے وہاں سے منتقل نہیں ہو سکتی تھی، نواب محبت خان نے خواجہ حسن کی سفارش پر اپنے اصطبل کی جگہ درگاہ حضرت عباس کے لیے دی تھی۔

[3] سید آغا مہدی: "تاریخ لکھنؤ"، طبع اول، کراچی، جمعیت خدام عزاء، ۱۹۷۶، ص ۱۱۳۔

اٹاوہ اور فرخ آباد کا سفر

نواب محبت خان کو اپنے والد کی شہادت کے بعد شجاع الدولہ کے ساتھ فیض آباد میں رہنا پڑا۔ اس وقت نواب وزیر اودھ کا دارالسلطنت فیض آباد تھا لیکن ماہ جنوری ۱۱۸۸ھ میں نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ نواب وزیر اودھ کی مسند پر فائز کیے گئے۔ انھوں نے یہ جان لیا کہ فیض آباد میں وہ اپنی والدہ اور دادی کے ہوتے ہوئے کھلے بندوں عیش و عشرت کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ صلاح ٹھہرائی کہ فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ آباد کرنا چاہیئے[1]۔ اس دوران نواب محبت خاں فیض آباد سے اٹاوہ گئے[2]، اور وہاں سکونت اختیار کرنا چاہی لیکن پھر اٹاوہ میں ان کا دل نہیں لگا، حالانکہ اس سفر میں نواب محبت خان کے ساتھ خواجہ حسن اور جرأت بھی تھے۔ بالآخر یہ لوگ واپس آئے۔ لکھنؤ میں سکونت اختیار کی کیونکہ اٹاوہ میں فیض آباد جیسی رنگین صحبتیں میسر نہیں آئیں۔

علاوہ ازیں نواب محبت خان نے فرخ آباد کے بھی دو تین دورے کیے کیونکہ ان کی ایک ڈیوڑھی فرخ آباد سے تعلق رکھتی تھیں[3]۔ نواب محبت خان جب فرخ آباد گئے ہونگے تو ان کا یہ سفر نجی ہونے کے علاوہ ادبی نوعیت کا بھی رہا ہوگا، کیونکہ تاریخ عہد بنگش میں شعراء کے باب میں نواب محبت خان کے فرخ آباد آنے کا ذکر ہے[4]۔

---

[1] محمد احد علی: "مرقع اودھ"، لکھنؤ، الناظر پریس، ص ۲۳۔

[2] فرمان فتح پوری: "اردو کی منظوم داستانیں"، طبع اول، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳۹۔

[3] نواب محبت خان کی چوتھی بیوی فرخ آباد کی تھیں جو چہارم ڈیوڑھی کہلاتی تھیں، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

[4] "نواب محبت خان محبت حافظ رحمت خاں کے فرزند ہیں، دو تین مرتبہ فرخ آباد آئے ہیں" بحوالہ (تاریخ بنگش مؤلفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی (اردو ترجمہ) کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۵ء، ص ۲۱۳۔)

علمی قابلیت

نواب محبت خان فارسی، پشتو، اردو اور عربی کے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے علماء سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ نواب مستجاب خان انکے بارے میں رقمطراز ہیں کہ[1]

برادر عینی عنایت خاں مرحوم ہمیں توجہ آنحضرت در علم عربی کوی سبق از عالمان زماں ربودہ و در فارسی استادِ استادان دہر گردیدہ حلال محاوراتِ عربی و کشاف مشکلاتِ فارسی ذہن ذکا و طبع رسا بحد لیست کہ بی شائبہ تکلف و رعایت اخوت ایں ذرہ حقیر در ہیچیکی از صغیر و کبیر از بنی نوع مشاہدہ نہ کردہ باوجود عدم توغل کتب عربی خدشہ نیست کہ کسی از ایشاں پرسیدہ وجواب شافی نہ شنیدہ ہموارہ صاحبانِ استعدادات ازاں جامع کمالات اثبات معانی اشعار مشکلہ و قصائد استاداں مثل قصائد عرفی و خاقانی و انوری و کاتبی و عبد الواسع جبلی وغیر آں مینمایند و آں طبع مصور ذہن مجسم بطریق الہام بی تامل و تساہل معانی متعلقہ بخوبی بآسانی بیان مینمایند کہ عجمی طبعاں و کنہ سواداں باستماع آں پی بمغز سخن بردہ لذت حلاوت آں ہمنداق جان دری یابندا ازابتدای طلوع صبح تمیز طبع موزون از خصائل فطرت سلیم الیثانست در عربی اشعار بسیار دارند۔

نواب محبت خان عربی اور فارسی زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ پشتو ان کی مادری زبان تھی جبکہ فارسی زبان ان کے اہل خانہ عام طور پر بولتے تھے۔ فارسی زبان اس زمانے میں ذریعہ تعلیم تھی اور مغل دور میں سرکاری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ نواب محبت خاں کے والد حافظ رحمت خان نے انھیں علماء عصر کے حوالے کیا تھا کیونکہ وہ خود ایک ذی علم شخص تھے۔ انکے دور میں علماء و مشائخ کی جو قدر و منزلت کی گئی، اس سے روہیل کھنڈ کی تاریخ جگمگا رہی ہے۔ حافظ الملک نے دور دراز کے علاقوں سے علماء و فضلاء اور مشائخ کو بلوا کر ان کی قدر دانی کی۔ روہیل کھنڈ میں تقریباً پانچ ہزار علماء مشرقی علوم کی تعلیم مختلف مدارس میں دے رہے تھے۔ غیر ملکی طلباء بھی یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

---

[1] نواب مستجاب خان، گلستانِ رحمت، فارسی (قلمی) ص ۵۱۱۔

نواب محبت خاں کے بڑے بھائی عنایت خاں کی تعلیم محمد سعید خاں[1] کے ہاتھوں مکمل ہوئی جو ایک متبحر عالم تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب محبت خاں کی تعلیم بھی علمائے عصر کے زیر نگرانی مکمل ہوئی بہ ندا ان کی عربی دانی اور عربی اشعار کہنے کی استعداد کو اس حقیقت کی دلیل جاننا چاہیئے کہ نواب محبت خاں عربی زبان کے ماہر تھے۔ ۱۷۷۴ء مطابق ۱۱۸۸ھ میں جب انکے والد حافظ رحمت خاں شہید کر دیئے گئے۔ اس وقت انکے انتقال پر مختلف اہل علم حضرات نے قطعات تاریخ تحریر کیے۔ ان میں نواب محبت خاں کا عربی میں قطعہ بھی موجود ہے۔ اس وقت محبت خاں کی عمر ۲۳ برس کی تھی۔ قطعہ تاریخ وفات از نواب محبت خاں محبت:۔

اذا مات خان النصیر الکبیر   سئلنا من اللہ تاریخہ
علی سنۃ المصطفٰی عاملٌ   فقد قال فی جنتی داخلٌ
۱۱۸۸ھ

بعہد نواب آصف الدولہ مرزا جہاندار شاہ ہندوستان آئے تو نواب محبت خان نے ایک رباعی پیش کی۔ شہزادہ کی خواہش پر نواب محبت خان نے ان سے ملاقات کی، اسکی تفصیل گزشتہ ابواب میں آچکی۔ رباعی ملاحظہ فرمائیے:۔

اذا لم یبق فی لاسلام آثار ۔ جری من مقلتی دمعٌ کانہارٌ
فقلتُ لطائفٍ من یظہر الدین ۔ فجاء الصوتُ سلطان الجہاندار

ترجمہ:۔ جب اسلام کی کوئی نشانی باقی نہیں رہی میری آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری ہوا تو میں نے کہا اب دین کو کون ظاہر کرے گا پس آواز آئی کہ سلطان جہاندار

---

[1] نجم الغنی خاں رامپوری مؤلف اخبار الصنادید و تاریخ اودھ وغیرہ، انہی محمد سعید خاں کی اولاد میں سے ہیں۔ مولوی نجم الغنی خاں رامپوری نے یہ صراحت تاریخ اودھ حصہ اول میں ص ۱۰ پر یوں کی ہے! "محمد نجم الغنی خاں ساکن رامپور ملک روہیل کھنڈ بن مولوی محمد عبد الغنی خاں بن مولوی عبد العلی خاں بن مولوی عبد الرحمٰن خاں بن مولانا حاجی محمد سعید صاحب محدث شاگرد شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی"۔

مولانا حاجی محمد سعید خان شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے تفسیر و حدیث میں فارغ التحصیل تھے جب شاہ ولی اللہ کا انتقال ہو گیا تو محمد سعید خاں روہیل کھنڈ چلے آئے اور حافظ رحمت خاں کے صاحبزادے نواب عنایت خاں کی تعلیم و تربیت پر [illegible] مامور ہوئے (بحوالہ فارسی گو شعرائے اردو ص ۲۳۶)۔

مندرجہ بالا عربی کے دو قطعات سے نواب محبت خان کی علمی استعداد کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ ان کا عربی کلام اور بھی ہوگا ۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ محبت خان کا عربی ، فارسی کلام ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہوگیا۔ مختلف تذکروں میں ان کا فارسی کلام ملتا ہے ۔ انکے فارسی اور اردو[1] کلام پر آئندہ ابواب میں تبصرہ کیا جائے گا ۔ نواب محبت خان حافظ رحمت خاں کی یُمن توجہات سے علومِ عربیہ میں بکثرت علماء سے گوئے سبقت لے گئے تھے[2] ۔ فارسی میں استادوں کے استاد اور سنسکرت زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے ۔ اہل استعداد ہمیشہ ان سے اساتذہ متقدمین کا کلام سمجھنے آیا کرتے تھے ۔ نواب محبت خاں کی مادری زبان پشتو تھی جبکہ فارسی بھی ان کی خاندانی زبان کہلاتی تھی ۔ نواب صاحب نے فارسی ، اردو اور پشتو دیوان ترتیب دیے تھے ۔ ان کے پشتو اور اردو دیوان موجود ہیں جبکہ فارسی کے اشعار مختلف تذکروں میں غزلوں کی صورت میں مل جاتے ہیں ، ان فارسی اشعار کو دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی یہ شاعری شاعرگر کی شاعری معلوم ہوتی ہے ۔ فارسی شاعری میں وہ مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے ۔ ان کے فارسی دیوان کے بارے میں نواب مستجاب خان گلستانِ رحمت میں رقمطراز ہیں :

> دیوان فارسی ہم مرتب است چگویم کہ چہا مضامین رنگین و معانی عالی کہ در اشعار شعرای متاخرین بل متقدمین کم بہم میرسد در ہر بیت آں میراست بجہت شادابی سخن گلی ازاں گلشن و گوہری ازاں معدن دریں مخزن درآوردن مناسب افتاد تا بیش ظاہر بر ستان اثبات دعویٰ خود کردد ۔

ایک فارسی گو شاعر کی حیثیت سے بھی محبت خاں کا رتبہ بلند ہے ۔ انکی فارسی کی چند غزلیں انکے بلند پایہ شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں ۔ اسکے علاوہ محبت خاں کی "ریاض المحبت" فارسی پشتو لغت ہے جو ان کی فارسی پشتو دانی کا بین ثبوت ہے ۔ اسکے علاوہ فارسی قواعد نامہ بھی اس کتاب کا حصہ ہے ۔

---

[1] نواب محبت خاں کے اردو دیوان کی عکسی نقل اردو ڈکشنری بورڈ سے راقم نے حاصل کی ہے ۔ ان کا پشتو دیوان لندن میں موجود ہے ۔ [2] مؤلف حیات حافظ رحمت خاں نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں پشتو اور فارسی دیوان تلف ہو گئے لیکن پشتو دیوان بوڈلین لائبریری لندن (آکسفورڈ) میں موجود ہے ۔ [3] پشتو فارسی لغت جس میں ۱۲۱۰ پشتو الفاظ کے فارسی میں معنی لکھے گئے ہیں ۔ اس کے فوٹو اسٹیٹ صفحات راقم نے انڈیا آفس لائبریری سے حاصل کیے ہیں ۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کی تین کاپیاں موجود ہیں جن کے سائز مختلف ہیں ۔

میر ضیاء الدین عبرت (وفات ۱۲۰۷ھ کے لگ بھگ) مؤلف پدماوت اردو (نامکمل)، محبت خان کے شاگرد رشید تھے انھوں نے اپنی مشہور مثنوی پدماوت میں اپنے استاد نواب محبت خان کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

کہوں کیا نواب زماں ہے — قلم آسا سراسر نکتہ داں ہے
اصول منطق ہیں اسکی زباں پر — ہے فن شعر اسکا ادنیٰ جوہر
سخن کے سقم کا ہے وہ فلاطون — کہ اس کے ہاتھ میں ہے نبض مضمون
دل استادوں کے ہوں ہر چند عالی — ہیں اسکے آگے جیوں مینائے خالی
ہر اک مضمونِ رنگیں بیش و کم ہے — وہ لکھتا ہے رگِ جاں کے قلم سے
خدا رکھے اسے دل شاد دائم — بہ حق پنجتن پاکِ معظم

مندرجہ بالا اشعار اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ نواب محبت خان ایک ذی علم انسان تھے اور شاعری میں نئے نئے مضامین نکالنے کی کامیاب کوشش کرتے تھے۔ اصول و منطق اور فن شاعری سے پوری طرح واقف تھے۔ فن شاعری میں اپنے دور کے شعراء کی فہرست میں نمایاں تھے۔ عربی و فارسی شاعری، اردو یا پشتو شاعری ہو یا "ریاض المحبت" ہو انکی عربی فارسی، اردو و پشتو مہارت پیش کرتی ہیں۔ نواب محبت خان کی علمی قابلیت مسلم ہے۔ روہیل کھنڈ میں ہزاروں علماء درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ نواب محبت خان نے بھی اپنی عربی و فارسی کی تعلیم کسی عالمِ وقت کی زیر نگرانی مکمل کی۔ گو کہ ان کے استاد محترم کا اس ضمن میں نام نہیں ملتا البتہ حاجی محمد سعید خان ان کے بڑے بھائی عنایت خان کے استاد تھے۔ ممکن ہے نواب محبت خان نے بھی عربی اور فارسی کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی ہو۔

انتقال

نقش سلیمانی میں سلیمان خان اسد رقمطراز ہیں:

"نواب محبت خان کو اکثر دورہ درد گردہ ہوا کرتا تھا جسکے باعث انہیں سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ اسی درد گردہ میں مبتلا تھے کہ حضرت سید شاہ علی اکبر مغفور یعنی پیر نواب محبت خان برائے مزاج پرسی تشریف لائے اس وقت نواب صاحب کو سخت تکلیف تھی۔ شاہ صاحب نے فرمایا محبت خان مزاج کیسا ہے نواب محبت خان نے عرض کیا کہ پیر و مرشد نہایت تکلیف ہے پس میاں صاحب نے اسی وقت ازراہ شفقت [illegible] فرمایا کہ یہ مرض سلب کر لیا اور فرمایا کہ آج سے درد گردہ کا دورہ نہ ہوگا کہ یہ درد ہم نے لے لیا، چنانچہ اسی وقت سے پھر یہ تکلیف نواب محبت خان کو تاحیات نہ ہوئی۔ البتہ شاہ صاحب مغفور کو درد گردہ ہونے لگا حتی کہ اس درد کے دورے میں شاہ صاحب نے چند سال ہی بعد انتقال فرمایا۔" (بدر ہرضمی)

نواب محبت خان کو درد گردہ ختم ہونے کے بعد کس قدر تمنہ کی شکایت تھی کہ دردِ شکم ہوا طبیبوں کی رائے یہ ہوئی کہ استفراغ کرانا چاہیئے نواب محبت خان نے انکار کیا اور فرمایا کہ مجھکو تمام عمر کبھی استفراغ نہیں ہوا مجھے اس سے سخت تکلیف ہوگی لیکن اطباء کی رائے قرار پائی مجبوراً استفراغ کرانا پڑا۔ دوسرے روز ہی چہرے پر ورم آ گیا۔ وہی ورم روز بروز تیزی پکڑ کر استسقا ہو گیا۔ کسی علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ آخر ۶۳ برس کی عمر میں ۱۲۲۳ھ[1] ۱۸ ماہ صفر المظفر روز جمعہ بعہد نواب سعادت علی خان انتقال کیا۔ آپ کا مقبرہ جانب غرب شہر لکھنؤ (برزین الیا ہو)

---

[1] تاریخ وفات کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے، سید الطاف علی بریلوی نے حیات حافظ رحمت خان میں ۱۲۲۴ھ لکھی ہے۔ تذکرہ سخن شعراء میں مولوی عبد الغفور نساخ نے صفحہ ۴۱ پر ۱۲۲۲ھ تاریخ وفات نواب مذکور ہے۔ تذکرہ شمیم سخن ۲۰۲ صفحہ پر محبت خان کی تاریخ وفات ۱۲۲۲ تحریر ہے لیکن نقش سلیمانی میں سلیمان خان اسد نبیرۂ محبت نے تاریخ وفات ۱۲۲۳ھ لکھکر چند قطعات اسکی سند میں تحریر کیے ہیں جن سے تاریخ وفات ۱۲۲۳ھ نکلتی ہے ان قطعات میں نواب محبت خان کے بیٹے اکبر خان حسرت، غلام ہمدانی مصحفی اور دیگر اشخاص کی تاریخیں ہیں لہذا یہی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ نواب محبت کا انتقال ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء لکھنؤ میں ہوا۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے آپ کی تاریخ وفات ۱۲ صفر ۱۲۲۴ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۸۰۹ء میں تحریر کی ہے

متصل وزیر باغ کشور گنج واقع ہے۔ نواب محبت خاں کی تاریخِ وفات ان کے فرزندِ کلاں علی اکبر خاں نے یوں کہی ہے :۔

چو نواب محبت خاں بہادر حافظ الملکم
بمہد رحمت ایزد ازیں دار فنا خفتہ
سروشِ پردۂ غیب از برائے سال تاریخش
"بفردوس بریں نواب شد محفل فزا" گفتہ [1]

قطعہ تاریخ دیگر :۔ کرد نواب محبت خاں چو سفر ۔ از جہاں کہ خوش سفر است
ماہ و تاریخ و یوم دخل بخلد ۔ ہژدہم روز جمعہ صفر است

قطعہ تاریخ سوم :۔ نواب ما ازیں جہان فانی ۔ تا رونق بخش جاہ جنت گشتہ
ہاتف گفت از برائے سال تاریخ ۔ بے شک نواب شاہ جنت گشتہ [2]
۱۲۲۳ھ

قطعہ تاریخ وفات از غلام ہمدانی مصحفی :۔

چو مشتاق کہن نواب جم جاہ ۔ قضا را گشتہ بر خوان قضا حیف
بجستم از خرد تاریخ سالش ۔ ہمیں گفتا "محبت خاں کجا حیف" [3]

قطعہ تاریخ وفات از جرأت :۔

خلف حافظ ملک اب جو اٹھا ۔ دار کیٹی نہ ہو کیوں ویران آہ
کیوں نہ آنکھوں میں ہو اندھیر جہاں ۔ مہر حشمت جو وہ ہو پنہاں آہ
رو کے جرأت نے پڑھی یہ تاریخ ۔ موئے نواب محبت خاں آہ

تاریخ دیگر :۔ مصرعہ تاریخ ہے یہ حسب حال "کیا ہے خاک اب بے محبت زندگی"

---

[1] "بفردوس بریں نواب شد محفل فزا" ۱۲۲۳ھ [2] "جنت گشتہ" ۱۲۲۳ھ (جنت کا نون دو مرتبہ شمار کیا ہے)
[3] "محبت خاں کجا حیف" ۱۲۲۳ھ

۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں نواب محبت خان نے اس دار فانی سے کوچ کیا
متصل وزیر باغ[1] جو کہ کشور گنج کے قریب ہے آپ کو دفن کیا گیا۔ نواب محبت خاں محبت
کے دو سال بعد اس جگہ مقبرہ تعمیر کیا گیا جس کی تاریخ یہ ہے:

این بتاریخ بنا ایما شد ۔ قصر جنت بجہان پیدا شد
۱۲۲۵ھ

آپ سے اٹھارہ فرزند اور چودہ دختران یادگار ہیں۔

فرزندوں کے نام یہ ہیں:

(۱) علی اکبر خان (۲) امام بخش خان (۳) وحید حیدر خان (۴) شاہ عالم خان
(۵) محمد منصور خان (۶) محمد شمس الدین خان (۷) محمد یوسف خان (۸) محمد مقیم خان
(۹) محمد حافظ خان (۱۰) محمد خسرو خان (۱۱) محمد مہدی علی خان (۱۲) خدا یار خان
(۱۳) محمد لطیف اللہ خان (۱۴) شاہ ولی خان (۱۵) غیرت خان (۱۶) محمد موسیٰ خان
(۱۷) نسیم خان (۱۸) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] وزیر باغ کے مالک نواب معتمد الدولہ سید آغا میر تھے۔ ان کی وزارت ختم ہونے پر جب جائیداد ضبط ہوئی تو وزیر موصوف کا باغ بادشاہ نے ملکہ جہاں کو بخش دیا، لکھنؤ میں وزیر باغ کی کمرک بہت مشہور رہیں۔ پھلوں کے پودے بھی اس باغ میں کثرت سے تھے۔ مٹے ہوئے نقش و نگار کی خوشبو اب بھی باقی ہے۔

قطعات تاریخ وفات نواب محبت خاں از جرأت

نواب محبت خان کی وفات پر جرأت نے ۱۳ اشعار پر مشتمل قصیدہ نما مرثیہ لکھا اور اسکے بعد چھ مصرعوں پر مشتمل قطعۂ تاریخ کہا جسکے آخری مصرعے سے بھی محبت خاں کی تاریخِ وفات نکلتی ہے ۔ یہ قطعاتِ تاریخ جرأت کی کلیات میں شامل ہیں[1]۔

ان قطعات میں جرأت نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے ۔ اس نظم کو مرثیہ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ انکے مربی نواب محبت خاں کی وفات کے بعد لکھا گیا اور قصیدہ اسلیئے کہ اس میں نواب مرحوم کے ذاتی اوصاف بیان کیے گئے ہیں ۔ جرأت کے، محبت خاں کے بارے میں یہ خیالات محض اپنے ممدوح کو خوش کرنے کے لیے اس لیے نہیں ہو سکتے کیوں کہ نواب محبت خاں خود دنیا میں موجود نہیں تھے ۔ اس نظم کو ہم بعینہٖ پیش کرتے ہیں ۔ اس نظم کے ۱۳ ویں شعر سے محبت کی تاریخ وفات نکلتی ہے :

ہائے وہ نواب فیاض زماں	تھی بخوبی جسکی دولت زندگی
وہ گلِ گلزار ثروت جسکی تھی	باغِ گیتی میں غنیمت زندگی
ہائے وہ مہر سپہرِ عزو جاہ	جس کے باعث تھی بشوکت زندگی
صاحبِ حسن وجمال وعلم وفضل	کٹتی تھی جسکی بعشرت زندگی
وصف اس کا ہو نہ اک شمہ بیاں	ہائے گو خضر فرصت زندگی
ہو گیا ناگاہ اسے ایسا مرض	تلخ کی جس نے بشدت زندگی
صبحدم ماہِ صفر میں روز جمعہ	ہوئے جوں شب آہ رخصت زندگی
حشر برپا بست و ہشتم کو ہوا	بے وفا تھی کیا قیامت زندگی
جائے جب آئینۂ ہستی سے وہ	کیوں نہ ہو بھر جائے حیرت زندگی

---

[1] قلندر بخش جرأت : "کلیات جرأت" ، مخطوطہ ، نیشنل میوزیم ، کراچی ، ص ۳۱۶، ۳۱۵ ۔

سوزِ ہجراں سے کلیجہ پھنک گیا ۔ اب ہے دوبھر ایک ساعت زندگی
ہے بقولِ دردمندانِ جہاں ۔ مرگ سے بدتر بغیر فت زندگی
سخت بے دردی ہے جینا اس بغیر ۔ اب وبالِ جاں ہے جرأت زندگی
مصرعۂ تاریخ یہ ہے حسبِ حال ۔ کیا ہے خاک اب بے محبت زندگی
۱۲۲۳ھ

خلف حافظ ملک اب جو اٹھا ۔ دار کیبٹی نہ ہو کیوں ویراں آہ
کیوں نہ آنکھوں میں ہو اندھیر جہاں ۔ مہرِ حشمت جو وہ ہو پنہاں آہ
رو کے جرأت نے پڑھی یہ تاریخ ۔ موئے نواب محبت خاں آہ
۱۲۲۳ھ

محولہ بالا ان تمام اشعار سے محبت کے بارے میں جرأت کے احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ اول انہوں نے محبت خاں کی فیاضی، شان وشوکت، حسن وجمال اور پھر علم وفضل کا ذکر کیا ہے ایک مصرعے میں وفات کا دن، ماہ اور وقت بھی لکھ دیا ہے:

صبحدم ماہِ صفر میں روز جمعہ ۔ ہوئے جوں شب آہ رخصت زندگی

جرأت کے دل پر محبت کے انتقال کا جو اثر ہوا وہ بھی انھوں نے مختصراً بیان کر دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرأت کے دل سے نکلی ہوئی یہ صدا ہے جس کا اظہار انھوں نے احسن طریق پر کیا ہے۔

سوزِ ہجراں سے کلیجہ پھنک گیا ۔ اب ہے دوبھر ایک ساعت زندگی

جرأت نے سادگی سے محبت کے اوصاف بیان کیے ہیں اور نہایت انہماک سے محبت کی دو تاریخیں نکالی ہیں۔

محبت تذکروں میں

بھگوان داس المتخلص بہ ہندی: "سفینۂ ہندی"، ۱۲۱۹ھ، ص ۱۹۱-

نواب محبت خاں محبت

خلف نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر مرحوم اند کہ مالک بریلی وغیرہ بودند تولد خود ایشاں دراں ملک رو نمودہ، بعد تحصیل علوم بگفتن شعر ہندی زبان کشادند (نشادند) بعد شہادت پدر خود در لکھنؤ آمدہ مقیم شدہ اصلاح اشعار ہندی از جعفر علی حسرت می گرفتند- آخر بگفتن اشعار فارسی میل کردہ، شاگرد جناب ارشاد مآب شدند، چند روز مجلس مشاعرہ در خانہ خود ترتیب میداند- بسیار خلیق پسندیدہ مزاج عالی منش شیریں گفتار آند- با مؤلف ربط دوستی دارند، کلام از ایشاں است-

دست شوقم گر چنیں سوی گریباں می رود - چاک بردم از گریباں تا بداماں می رود

پیچ و تابم از جنوں گر نیست خاک من چرا - گرد بادی می شود سوئ بیاباں می رود

عاشق زارم مرا راز درد پیدا کردہ اند - ایں گواہم بس کہ رنگ زرد پیدا کردہ اند

منظور تجھ کو شوق ہے گر لالہ زار کا - تختہ اٹھا کے دیکھ ہمارے مزار کا

سید حیدر بخش حیدری دہلوی: "گلشن ہند"، مرتبہ مختار الدین احمد، دلی، علمی مجلس، ۱۹۶۷

بیٹھنے دلوے نہ وہ بزم میں اپنی جو مجھے - تو اٹھا لیجیو اے بار خدایا مجھکو

دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھ کو کیا - اس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجکو کیا

مولوی عبدالغفور نساخ: "سخن شعرا"، ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء، نول کشور پریس لکھنؤ، ص ۴۱۶۔

محبت تخلص نواب محبت خاں شہباز جنگ خلف حافظ الملک نواب رحمت خاں والی کٹھیر شاگرد حسرت و میر درد قدس سرہ اپنے والد ماجد کی شہادت کے بعد لکھنؤ میں سکونت اختیار کی تھی ۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔

عبدالحئ صفا بدایونی: "تذکرہ شمیم سخن"، جلد دوم، المستد پریس، مراد آباد، ص ۲۰۲۔

محبت تخلص نواب شہباز جنگ محبت خاں بریلوی خلف حافظ الملک حافظ رحمت خاں والی روہیل کھنڈ شاگرد حسرت و خواجہ میر درد دہلوی جب ۱۱۸۸ھ میں حافظ الملک شہید ہوئے اور روہیل کھنڈ پر قبضہ نواب شجاع الدولہ کا ہوا، یہ بریلی کی سکونت ترک کرکے لکھنؤ پہنچے۔ وہیں ۱۲۲۲ھ[1] میں انتقال کیا۔ صاحبِ دیوان تھے۔

قید ہوتے ہی ہوا دونوں جہاں سے آزاد ۔ میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا
آپ کچھ غیر کو جیب جیب کے رقم کرتے ہیں ۔ یہ جو جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں

مصطفیٰ خاں شیفتہ: "گلشنِ بے خار"، اردو ترجمہ از محمد احسان الحق فاروقی۔ ایم۔ اے، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۳۹۷۔

نواب محبت خاں حافظ الملک نواب رحمت خاں مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ بریلی اور اسکے متعلقات کے جاگیردار تھے، کمالِ شہرت کے باعث مزید تفصیل سے مستغنی ہیں، والد کی طرح صاحبِ زہد و ورع ہیں اور فہم و فراست کے مالک اردو اور فارسی دونوں میں فکرِ سخن کرتے ہیں ان کے منتخب اشعار یہ ہیں:

[1] اس تذکرے میں محبت خاں کی تاریخ وفات ۱۲۲۲ھ تحریر کی گئی ہے ۔ جبکہ جرأت اور مصحفی نے جو منظوم تاریخیں نکالی ہیں ان کے مطابق ۱۲۲۳ھ [illegible] صحیح ہے

ــ جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا ۔ بالغرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا
ــ عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے ۔ آج چہرہ مرا بحال ہوا
ــ قید ہوتے ہی ہوا دونوں جہاں سے آزاد ۔ میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا
ــ یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہوا ۔ تھا میرا ہمدرد لیکن مجھکو سمجھانے لگا
ــ آپ کیجھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں ۔ یہ جو ہو جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں
ــ بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنے جو مجھے ۔ تو اٹھا لیجیو اے یار خدایا مجھ کو
ــ گالی کا انتظار تو حد سے گزر چکا ۔ منہ کو کہاں تلک ترے دیکھا کرے کوئی

میر حسن دہلوی : "تذکرہ شعراء اردو" ، انجمن ترقی اردو ، دہلی ، طبع جدید ، ۱۹۴۰ء ، ص ۱۷۷ -

---

محبت :-

نواب ذی شان ، نواب محبت خاں ، خلف حافظ الملک ، حافظ رحمت خان . المتخلص به محبت با وجود اسباب امارت طبع موزوں سخن دارد ـ بعضے اوقات کہ آں منبع جود و سخا قدر دان شعرا و به مضمون تازہ مائل می شود ، به اصلاح خواجہ حسن یا میاں حسرت جرأت نمودہ ، اشعار برجستہ ادا می نماید ـ اکثر با صاحب سخنان زماں از روے خوش خلق صحبت می دارد ـ از مغتنمات وقت است سلمہ اللہ :

ــ آپ کیجھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں ـ یہ جو ہو جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں
ــ مذکور جو مجلس میں ہوا دوش کسی کا ـ سنتے ہی ٹھکانے نہ رہا ہوش کسی کا
ــ تھا ارادہ تو نہ آتے اب کے ہم تیری طرف ـ پر کریں کیا جو پڑا اپنا قدم تیری طرف

؎ زلف سے تیری اتصال ہوا ۔ خوش مرا آج بال بال ہوا

؎ عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے ۔ آج چہرہ مرا بحال ہوا

؎ غیر کے گھر قدم رکھا تو نے ۔ دل محبت کا پائمال ہوا

؎ دیکھتے تھے جو کہ ہم عشق اب تجھے دکھلائے گا ۔ کوئی دن میں آپ تو اپنے کیے کو پائے گا

؎ جوں ہمارا دل ہمیں لاتا تھا گلیوں میں تری ۔ اس کے کوچے میں ترا دل اب تجھے لے جائے گا

؎ کی کس نے دلا تجھ پہ یہ بیداد لبغل میں ۔ سنتا ہوں جو ہر شب تیری فریاد لبغل میں

؎ کیا دیوے گا کوئی ہمیں تعلیم محبت ۔ رکھتے ہیں ہم اس فن کا تو استاد لبغل میں

؎ درویش کی خوبی تو تونگر میں نہیں ہے ۔ اکسیر میں جو کام ہے سو زر میں نہیں ہے

؎ دل بر تو میرا کل سے نہیں ناصحِ مشفق ۔ آج اور تماشا ہے کہ دل بر میں نہیں ہے

نہیں ملتا ہے تو مجھ سے بتِ خود کام کس باعث ۔ نہ ملتا تھا تو پھر مجھ کو کیا بدنام کس باعث

یوں دیکھتا ہوں زلفِ سیہ فام کی طرف ۔ گھبرا کے صید دیکھے ہے جوں دام کی طرف

جی چاہے بوسہ دے مجھے جی چاہے اور کچھ ۔ دیکھو پر اپنے دیکھ کے تو نام کی طرف

ہوا اسرار یہ منصور کے ہونے سے یوں ظاہر ۔ کہ بعد از مرگ بھی عاشق کی سرداری نہیں جاتی

جو چلا ہے ہوش تو بے ہوش ہو جام محبت سے ۔ یہ بے ہوشی ہے ایسی جس سے ہشیاری نہیں جاتی

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم : "مجموعہ نغز" ، مرتبہ محمود شیرانی ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ، ۱۹۳۳ ، ص ۱۶۰ ۔

محبت : نواب محب اللہ خان سلمہ الرحمٰن خلف الصدق حافظ الملک حافظ رحمت خان شہید غفرہ اللہ المجید بشکوہ و ثروۃ و عمدگی و شوکت ایشاں بنا بر غائت وضوح و نہائت شیوع محتاج تسطیر و مفتقر تحریر نیست گویند کہ بسیار صاحب مروۃ و ہوشیار و جواد و باوقار صاحب حلم و باحیا و خلیق و مودۃ آما واقع شدہ بعد شہادۃ پدر والاقدر چار و ناچار بہ بلدہ لکھنؤ رحل اقامت افگندہ بر قدر قلیلے کہ شایاں ملازمانش نباشد از دست سردار فرنگ یافتہ ایام بسری کنند بہر دو زبان سخن میگویند و بمضمار ہندو فارس رخش ہمت می پویند صاحب دیوان ریختہ است بہ تحریک فرنگی پسرے قصۂ مسمی بنو بزبان ہندی نظم نمودہ و مشق سخن از میاں جعفر علی حسرۃ فرمودہ ملخص سخن ایں ہفت بیت از سخناں آن عالی شان است :

زخمِ دل کو میرے یہ دیکھ کے بولا جراح ۔ ہائے افسوس یہ ناسور نہیں جانے کا
اوسکے کوچے کی طرف باچشم تر جو جائے گا ۔ پہلے اپنی جان سے وہ ہاتھ دھو کر جائے گا (کذا)
آپ کیچھ غیر کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں ۔ یہ جو ہو جھوٹ تو [ہم] ہاتھ قلم کرتے ہیں
ہم سے [فرقت] اسے کیا کہتے ہیں ۔ اتنی وحشت اسے کیا کہتے ہیں
اسقدر یار سے گرمی کرنی ۔ کیوں محبت اسے کیا کہتے ہیں
فتنہ گر تونے جو ٹک ہم سے چھپائیں آنکھیں ۔ ایسے ہم روئے کہ آشوب کر آئیں آنکھیں
الفت میں جس کو اشک بہانے کی خو نہ ہو ۔ اوسکو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

میرزا علی لطف متخلص بہ لطف: "گلشن ہند" ۱۹۰۶ء دکن و لاہور، ص ۱۶۶-۱۷۰ -

محبت تخلص، نواب محبت خاں نام خلف ارشد حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ہیں، حسب نسب کی طرف سے کثرت شہرت کے باعث نہیں محتاج بیان کے ہیں جوان خوش ظاہر و خوش رو ہیں اور خوش اختلاط و خوش خو۔ حسنِ خلق سے معمور، اور مروت و جوانمردی کے ساتھ مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلق کے باعث انھوں نے شیوہ سخنوری کا اختیار کیا، اور خوش استعدادی طبعی کے سبب طبع بیگانہ خو کے تئیں لطافت معنی سے یار کیا۔ جمیع اقسام نظم میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور اصلاح سخن کی میرزا جعفر علی حسرت تخلص سے لی ہے، معاصرین اپنے میں مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے، اور روشن طبعیتوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ روشن زبانی کے۔ قصہ سسی پنوں کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر کے انھوں نے نظم کیا ہے اور نام اس مثنوی کا اسرار محبت رکھا ہے۔ بعد حافظ رحمت خاں کی شکست کے، جو لکھنؤ میں آئے، تو اسی ایام سے بس طور بود و باش کی وہیں ٹھہرائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت اعزاز و اکرام کیا تھا، اور مشاہرہ بھی معقول کر دیا تھا۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہیں، اسی شہر میں بود و باش رکھتے ہیں، اور مضامین تازہ کی ہمیشہ تلاش رکھتے ہیں۔ دیوان میں ان کے نظم کے سب اقسام ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب کلام ہیں:

؎ جب تلک وہ بتِ خودکام نہیں آنے کا ۔ دلِ بیتاب کو آرام نہیں آنے کا
؎ مجھ کو خطرہ ہے خدا یہ نہ کرے جو اس کا ۔ دیوے قاصد کہیں پیغام نہیں آنے کا
؎ کیا خوشی کیجیے یارو کہ وہ خورشید لقا صبح آوے گا تو پھر شام نہیں آنے کا
؎ کوئی ڈھب بھی تجھے آتا ہے وفاداری کا ۔ یا کہ سیکھا ہے یہی شیوہ ستمگاری کا
؎ دیکھا اک جھڑکی میں اے یار کوئی بھی ٹھہرا ۔ کیا ہی اغیار کو دعویٰ تھا تری یاری کا
؎ قید ہو بیٹھے ہوا دونوں جہاں سے آزاد[1] ۔ میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا
؎ دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا تک[2] ۔ میرا غبار کیجو برباد اس طرح کا

---

[1] دیوان میں یہ مصرع اس طرح ہے ع قید ہوتے ہی ہوا دونوں جہاں سے آزاد۔
[2] دیوان میں اس طرح ہے ع دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا یہ

منہ کو رجو محفل میں ہوا دوش کسی کا
سنتے ہی ٹھکانے نہ رہا ہوش کسی کا

شب کی مجلس بیچ وہ غارت گر ہر خانہ تھا
تھے جو باہم آشنا ایک ایک سے بیگانہ تھا

جس گھڑی گلرو مرے تو جلوہ فرمانے لگا
غنچۂ تصویر بھی خجلت سے مرجھانے لگا

یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہوا
تھا مرا ہمدرد لیکن مجھ کو سمجھانے لگا

عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے
آج چہرہ میرا بحال ہوا

تری گلی سے دل افگار جو گیا سو گیا
عدم کے کوچے سے اے یار جو گیا سو گیا

تو اس کے گھر تو ہنستا ہوا چلا اے دل
یہ ہے وہ قہقہہ دیوار جو گیا سو گیا

دل جو جاتا ہے چلا جانے دیں مجھ کو کیا
اس کی رسوائی کو کہتا ہوں ناصح مجھ کو کیا

چشم میراں سے کہاں دل کو ملے لذت دید
میری آنکھیں جو تجھے دیکھ رہیں مجھ کو کیا

دل دیں گے رونمائی دستور ہے ہمارا
کیا کیجیے یہی کچھ مقدور ہے ہمارا

اللہ رے تکبر سنتا نہیں سخن بھی
یاں تک وہ بت عزیز و مغرور ہے ہمارا

جاتے ہیں جلد چھٹکے تو من کو عمر کے ہم
کیا کیجیے محبت گھر دور ہے ہمارا

غیر کو یاد تو زنہار نہ رکھ اے پیارے
بھول جا مجھ کو بھی لیکن یہ مری بات نہ بھول

دو بیزیر سامنہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں
اڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانے میں

دل خشک ہے کہاں سے ہمیں اشک چشم تر
فوارہ تب چھٹے جو ہو پانی خزانے میں

نزع میں دم ترے پاس آنے کا ہم رکھتے ہیں
دم واپسیں جب تلک اپنے یہ دم رکھتے ہیں

آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں
یہ جو جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں

سرخی اشک کبھی اور کبھی زردی رو
تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھ کو

ساقی گنگا میں جو بہتی نظر پڑی
یاد آ گئی ہے وہیں وہیں مستی نظر پڑی

بوسے کے بھی عوض نہ خریدیں یہ جنس ہائے
اس کو متاع دل مری سستی نظر پڑی

تمنا یار سے ہے جیات کہنے میں نہیں آتی
غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

مخمس

کون سے روز میں سر سنگ سے مارا نہ کیا
ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا
پر مرض کا مرے تو نے کبھی چارا نہ کیا
ولِ درد دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا
نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا

کیوں ہی آنکلے نئے محفل میں تمھاری ہم تو
آپ کے دیکھ چکے سب سے اشارے ہم تو
مر گئے ہائے اسی رشک کے مارے ہم تو
آلگے گور کے اس غم سے کنارے ہم تو
تو بھی غیروں سے میاں تم نے کنارا نہ کیا

ساری شب رہتی ہے مجھ میں اور دلبر میں غرض
گر اسے میں جام بھر بھر دوں پیوں وہ [illegible]
لیک حرف ناز اس کا سن کے نہیں رہ جی میں جی
پھیرتا ہوں جب میں اس کو تب یہ کہتے ہے ابھی
پاس سے ہم ترے ان باتوں سے اب اٹھ جائینگے

مثنوی

کہی القصہ جو بندے سے یہ بات
اگر ضائع نہ ہووے اس میں اوقات
تو مضموں کر کے اس قصّے کا معلوم
یہ ہے منظور[1] کر تو اس کو منظوم
یہ بات اس واسطے تجھ سے کہی ہے
کہ مشق اس کی بہت تجھ کو رہی ہے
تجھے اس عشق کے ہے کار معلوم
محبت کے ہیں سب اسرار معلوم
پیا ہے تو نے بھی جامِ محبت
سراپا تو ہے ہم نامِ محبت
ترے اشعار سن کر سب سخن داں
محبت کا اسے کہتے ہیں دیواں
سراپا کیا لکھوں اس شمع رو کا
کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود
کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود
دوپٹا چاند تارے کا زری باف
جو اوڑھے تھی کہ اپنی پٹیاں صاف
سما ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر
شب دیجور میں چمکے ہیں اختر

گندھی چوٹی نظر اس شکل آوے
کہ جوں مارِ سیہ لہریں دکھاوے
بہت سے تھا دلوں کا اس میں مسکن
اچنبا ہے کہ اک سانپ اور کئی من
نگیں بدر فلک کی اس جبیں پر
یہ بولا کاش میں ہوتا زمیں پر
دو دنداں آب دار اس سیم بر کے
کہ سوراخ ان سے ہیں دل میں گہر کے
کروں کیا خوبیٔ لب کی میں تقریر
قیامت اس پہ تھی مستی کی تحریر
تبسم میں نظر اس رنگ آوے
کہ غنچہ جیسے نافرماں کھل جائے
زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پر
سخن ہو جائے گم میری زباں پر
کوئی کیا جھنکاوے عشق اس راہ
جسے چاہِ زنخ کی اس کے ہو چاہ
نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی
وہ ہے گویا صراحی دار موتی
حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ
کہ جوں خوش خط لکھیں سرخی سے اللہ

بھلا دوں کس سے نسبت ان کچوں کو
جو میداں حسن کے سے لے گئی گو
عیاں وہ گلشنِ خوبی میں ہیں یوں
کہ جیسے دو انار اک شاخ میں ہوں
اگر دیکھے کوئی نامرد ذاتی
عجب کیا وہ بھی کوٹے اپنی چھاتی
جو وصف اس ساق سیمیں کا سنے ہے
بہ حسرت شمع رو رو سر دھنے ہے
قدِ موزوں وہ جب اپنا دکھا جائے
اور اس کے فندق پا تک نظر آئے
تو حیرت سے ہوں یہ سب کو بریکھے
بن شمشاد میں غنچے نہ دیکھے
جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت
کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت
جو ہو تنگ فرشِ گل پر گرمِ رفتار
رگِ گل نیشترِ پا سے ہو نمودار

---

[1] مثنوی میں "منشور" لکھا ہے
(مخطوطہ نیشنل میوزیم کراچی)

قدرت اللہ شوق: "طبقات الشعراء"، مرتبہ نثار احمد فاروقی، طبع اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۵۲۔

محبت: نواب محبت خاں برادر خورد نواب عنایت اللہ خاں، جوانے مست نازک طبع، خوش قماش و خوب صورت بجمع استعداد و قابلیت، معدن محبت، مخزن مودت، حافظ رحمت الہی، مبدأ فیض نامتناہی مورد عنایت ربانی، مصدر ارادت کامرانی، صاحب عظمت و حشمت، عمرش بے پایاں و حرمتش جاوداں من کل الوجوہ باد، ذہنش رسا و سلیم و طبعش درست و مستقیم است، اشعارش بسمع فقیر نرسیدہ مگر غزلے تازہ مرثیہ نما کہ در بیان مفارقت اقربا و آوارگی وطن و مہاجرت خویشاں و حالات بر ہلالت خود مشتمل بر غم و الم و اندوہ و بلا کہ بر سرش کم از واقعۂ کربلا نہ بود، وقتے کہ از پدرش حافظ رحمت خاں، و افواج فرنگ اتفاق جنگ افتادہ و خان موصوف از زخم گولہ مورد رحمت الہی شد، و شہید اکبر گشتہ و مردانہ وار جاں دادہ، موزوں نمودہ، چند بیت آں بسمع رسیدہ از وست:

پہنچ گئے سبھی تجھ تک کسی قرینے سے ۔ یہ ہم ہی رہ گئے[1] سر کو پٹکتے زینے سے
وطن[2] کو چھوڑ کے جاتے ہیں اس طرح مجبور ۔ چلے تھے اہل حرم جس طرح مدینے سے
کیا جو چاہے کوئی نام کے تئیں مشہور ۔ تو روسیاہی[3] تنک سیکھ لے نگینے سے
پلک[4] کے مارتے دم میں وہیں اٹھے طوفاں ۔ جو اشک جاری ہو ٹک چشم کے سفینے سے
قضا و قدر محبت یہی تھا جو کہ ہوا ۔ وگرنہ کچھ نہیں ہوتا کسی کے کینے سے
وہ[5] کیا ہی وقت تھا پیارے ہزار حیف کہ تم ۔ اکیلے ہوتے تھے کوچے میں اپنے سنگ اور شب
نہ[6] قافلہ و نہ رہبر کوئی نہ رہ معلوم ۔ نہ ہم کو آتی ہے کچھ بھی صدائے زنگ اور شب

---

[1] دیوان محبت میں یہ مصرع اس طرح ہے: مگر بھٹکتے ہم ہی رہ گئے یار سر کو زینے سے [2] دیوان محبت میں یہ شعر نہیں ہے۔

[3] یہ شعر دیوان میں اس طرح ہے: کیا جو چاہے یہاں نام کو کوئی مشہور ۔ تو دل خراشی ذرا سیکھ لے نگینے سے

[4] یہ شعر دیوان میں اس طرح ہے جو مبہم معلوم ہوتا ہے: یہ ان کا لطف ہمیں بھولتا ہی نہیں ۔ برنگ جو خوشی محبت تیرے سفینے سے

[5] دیوان میں اس طرح ہے: وہ کیا ہی شب ہے کہ تھا یار خرخ شنگ اور شب ۔ ہم اور کاکل ساقی مے فرنگ اور شب

[6] یہ شعر دیوان میں اس طرح ہے: نہ قافلہ ہے نہ رہبر نہ کوئی رہ معلوم ۔ میں اور دشت و بیاباں ہیں خار و سنگ اور شب

گئے کدھر وہ مجھے چھوڑ ہمرہاں افسوس ۔ کہ ہوں میں دشت میں اور خطرۂ پلنگ اور شب

غزل کہی[1] یہ محبت نے یلد و رو رو کر ۔ کہ بیٹھا درد میں تھا وہ کنار گنگ اور شب

این چند غزلیات تازہ آں مخزنِ محبت کہ بعد اصلاح جرأت بسمع رسیدہ

بہ تحریر می آید، از وست :

ہوتا ہے ابھی حاصل سب کام محبت کا ۔ دے اس کو خداوند اتو جام محبت کا

ثابت قدم الفت میں رکھیو اسے مرتے دم ۔ تو نام نہ ہو جاوے بدنام محبت کا

اتنا تو سمجھ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا ۔ کچھ تو مجھے کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

تہمت مجھے کچھ کہنے کی مت دے کہ یہ میری ۔ خاموشی ہی گویا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وہ شوق سے بد کہتا ہے مجھ کو یہ محبت ۔ کیا جانوں سبب کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

خانۂ غیر میں کرتے ہو مری مہمانی ۔ واہ واہ زور یہ سیکھے ہو مدارات کا ڈھب

تیرے بغیر کٹی یہ دل کو بے قراری رات ۔ کہ کل پڑی کسی کروٹ نہ مجھکو ساری رات

شبِ فراق ہے یا آسمانِ غم ٹوٹا ۔ الٰہی ہوگئی یہ مجھ پہ کیسی بھاری رات

شبِ وصال میں بھی مجھ پہ اک بلا ٹوٹی ۔ محبت اس نے جو کاکل ذرا سنواری رات

دیدِ زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانے میں ۔ اڑتا ہے اپنا مرغِ نگہ آشیانے میں

دل خشک ہے کہاں سے بہے اشک چشم سے ۔ فوارہ تب چھٹے جو ہو پانی خزانے میں

---

[1] دیوانِ محبت میں اس غزل کا مقطع اس طرح ہے :

گلے لگا دن کو نہیں لطف تب مزا ہو اگر ۔ ہماری تیری محبت کی ہو وہیں جنگ اور شب

علی ابراہیم خاں خلیل: "تذکرہ گلزار ابراہیم"، قلمی، نیشنل میوزیم کراچی، ص ۵۰۰۔

محبت تخلص معروف بنواب محبت خاں خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں است از سن شعور شیوہ سخنوری را مرغوب داشتہ اصلاح سخن از مرزا جعفر علی حسرت نمود بمقتضائے استعداد فطری شہرت بخوش بیانی یافتہ کلامش در سائر اقسام نظم ریختہ مدون است اگرچہ راقم خاکسار تا نوشتن این اوراق آں ستودہ اطوار ندیدہ اما از زمانے اکثرے شنیدہ کہ جوانے است زیبا بحسن اخلاق آراستہ فتوت و مروت را شعار خود ساختہ الحال کہ سال یکہزار و یکصد و نود و شش ہجری باشد در لکھنؤ اقامت و مراسلہ با راقم دارد چنانچہ در کمال محبت اشعار خود با مثنوی موسوم بہ اسرار محبت کہ حکایت عشق ستے و پنو بفرمودۂ ممتاز الدولہ مستر جانسن بہادر منظوم نمود۔

میر محسن علی محسن: "تذکرہ سراپا سخن"، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۶۰ء، ص ۸۵۔

نواب محبت خاں شہباز جنگ مرحوم محبت خلف حافظ الملک حافظ رحمت خاں صوبیدار باشندہ بریلی مقیم لکھنؤ صاحب دیوان شاگرد میاں قلندر بخش جرأت۔

فتنہ گر تونے جو ٹک ہم سے چھپائیں آنکھیں ۔ ایسے ہم روئے کہ آشوب کر آئیں آنکھیں

عشق کو سہل سمجھ جس نے لگائی آنکھیں ۔ ہجر شاباش تجھے خوب دکھائیں آنکھیں

لالہ سری رام: "خم خانۂ جاوید"، جلد دوم، جلد اول، نولکشور، لاہور، ص ۲۰۹۔

حسرت کے شاگردوں میں شہرت و قابلیت کے لحاظ سے سب سے اول نمبر تو حضرت جرأت کا ہے ان کے بعد شاہ قدرت اللہ قدرت، نواب محبت خاں محبت شہباز جنگ اور خواجہ حسن حسن لکھنوی وغیرہ کا نمبر ہے یہ لوگ صاحب دیوان اور مسلم الثبوت استاد گزرے ہیں۔

اساتذۂ محبت

اس بات پر تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ نواب محبت خاں فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکین سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں مرزا فاخر مکین زبان فارسی کے مشہور شاعر تھے۔[1]

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں رقمطراز ہیں۔

مرزا فاخر مکین[2] اصل میں کشمیری تھے۔ اول فتوت حسین خاں کشمیری سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر نے کشمیری کے شاگرد ہوئے۔ ان کے کمال میں کلام کی جگہ نہیں صحت الفاظ اور تحقیق لغت میں بڑی کوشش کی۔ دیوان نے رواج نہیں پایا مگر اصل اشعار متفرق بیاضوں میں ہیں یا وہ مشہور ہیں کہ انہوں نے سودا کے حق میں کہے سودا نے تضمین کر کے انہی پر الٹ دیئے۔ کچھ اشعار سودا نے عبرۃ الغافلین میں اعتراضوں کی ذیل میں لکھے۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ کیفیت سے خالی نہ تھے زمانے نے بھی پورا حق ان کی قدردانی کا ادا کیا۔ سیکڑوں شاگرد غریب اور تونگر لکھنؤ اور اطراف میں ہو گئے۔ پیشہ توکل تھا اور بے دماغی سے اسے رونق دیتے تھے۔

---

[1] محمد حسین آزاد: "آب حیات" طبع ہفتم، ء، لاہور ۱۹۵۷ء ص ۱۵۱۔

[2] اشرف علی نامی ایک شخص نے فارسی کے تذکروں اور دواوین کی مدد سے ۱۵ برس برس کی محنت کے بعد ایک انتخاب مرتب کیا تھا وہ تصحیح کے لئے مرزا فاخر مکین کو دیا گیا مگر جابجا اساتذہ کے اشعار کو بے معنی سمجھ کر کاٹ دیا۔ مرتب نے جب اس نسخہ تالیف کو دیکھا تو افسوس کیا اور مرزا رفیع سودا کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا حال بیان کیا پہلے سودا نے اس کام کی طرف گوشہ نشینی سے رجوع کرنے کو کہا لیکن اشرف علی خاں نے کہا کہ ان لوگوں کو تو فاخر مکین خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ سودا نے انتخاب مذکور کو دیکھا تو پتہ چلا کہ جو کمال سلف سے آج تک مسلم الثبوت چلے آتے ہیں ان کے اشعار میں فاخر نے ترمیم کر دی ہیں۔ منظم ا سودا نے رسالہ عبرۃ الغافلین لکھا اور مرزا فاخر مکین کی غلطیوں کو اصول انشاء پردازی کے موجب نکتہ نکتہ ظاہر کیا۔ اسکے ساتھ ہی ان کے دیوان پر نظر ڈال کر اسکی غلطیاں بھی بیان کیں اور جا بجا اصلاح مناسب دی۔ اس صورت حال کے بعد مرزا فاخر کے شاگردوں نے سودا کی بے عزتی کی اور انہیں بیچ بازار رسوا کرنا چاہا لیکن نواب سعادت علی خاں کی اچانک آمد سے یہ معاملہ ختم ہوا۔ نواب آصف الدولہ نے بھی فاخر مکین کو تنبیہ کی۔

[3] یہ بات بھی کم اہمیت کی حامل نہیں مرزا فاخر مکین فارسی شاعری میں جعفر علی حسرت کے بھی استاد تھے اور نواب محبت خاں محبت کے بھی استاد ہیں جو اردو شاعری میں جعفر علی حسرت کے شاگرد ہیں۔

نواب محبت خاں اردو شاعری میں کس کے شاگرد تھے اسمیں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔
قدرت اللہ قاسم ، مرزا علی لطف ، عبدالسلام ندوی ، رام بابو سکسینہ ، علی ابراہیم خاں خلیل ، لالہ سری رام ، اور حسرت موہانی نے انہیں حسرت کا شاگرد قرار دیا ہے ۔ عبدالحئی صفا بدایونی ، عبدالغفور نساخ ، سید نورالحسن ہاشمی اور سید علی حسن کی رائے یہ ہے کہ وہ خواجہ میر درد اور جعفر علی حسرت سے اصلاح لیتے تھے ۔ سید محسن علی محسن کی رائے یہ ہے کہ وہ ابتداً میں جعفر علی حسرت سے اور پھر بعد میں قلندر بخش جرأت سے اصلاح لیتے رہے ۔ سید الطاف علی بریلوی اور قدرت اللہ شوق انہیں جرأت کا شاگرد بتاتے ہیں ۔

میر حسن نے لکھا ہے کہ وہ خواجہ حسن یا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے ۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب فرماتے ہیں

"بیشتر تذکرہ نگاروں کا اجماع جعفر علی حسرت سے تلمذ پر ہے اور ہمارے خیال میں یہی صحیح ہے"

لیکن ہم اس بحث کو آگے بڑھانے سے قبل پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی رائے جو انہوں نے وثوق سے پیش کی ہے تحریر کرتے ہیں ۔[1]

"نواب محبت خاں کو شعر وسخن سے فطری مناسبت تھی ۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے اور اچھے شعر کہتے تھے تخلص محبت تھا اور اول اول میر درد سے اصلاح لیتے تھے لیکن قید سے چھوٹنے کے بعد مرزا جعفر علی حسرت استاد جرأت سے اصلاح لینے لگے تھے اور اسی زمانے میں جرأت کو بزمرۂ شعراء ملازم بھی رکھ لیا تھا فارسی میں مرزا فاخر مکیں کے شاگرد تھے ۔"

---

[1] مجنوں گورکھپوری نے "اسرار محبت" پر تنقیدی حاشیے میں تبصرہ کرتے ہوئے یہ واضح الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ قید سے رہائی کے بعد محبت خان نے حسرت کی شاگردی اختیار کی ، یعنی لکھنؤ پہنچنے کے بعد میر درد سے سلسلۂ اصلاح ترک ہوا ۔

نواب محبت خاں کی شاگردی کے بارے میں جو رائے پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے قائم کی ہے، ہم بھی اس سے متفق ہیں کیونکہ جس دوران محبت خاں قلعۂ الہ آباد میں قید کے لیے لے جائے گئے اسکا اشعار کے ذریعے انھوں نے اس طرح اظہار کیا ہے[1]۔

ے پہنچ گئے سبھی تجھ تک کسی قرینے سے ۔ یہ ہم ہی رہ گئے سر کو پٹکتے زینے سے

ے وطن کو چھوڑ کے جاتے ہیں اس طرح مجبور ۔ چلے تھے اہل حرم جس طرح مدینے سے

محبت خاں قلعۂ الہ آباد میں قید کے کچھ عرصے بعد اگر یہ شعر کہتے تو یہ زمانۂ حال جاریہ میں نہیں بلکہ زمانہ ماضی میں یہ شعر اس طرح ہوتا ے وطن کو چھوڑ کے جاتے تھے اس طرح مجبور ۔

لہٰذا واضح ہوتا ہے کہ لکھنؤ پہنچنے سے قبل یہ غزل کہی گئی تھی ۔ محبت خاں اس قید سے قبل والیِ روہیل کھنڈ کے فرزندِ ارجمند ہونے کے ناطے، مراسلت یا کسی پیغام رساں کے ذریعے خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے ہونگے اور یہ سلسلہ محبت کے قیامِ روہیل کھنڈ کے دوران قائم رہا ہوگا ۔ محبت خان نے قیامِ روہیل کھنڈ کے دوران اپنے والد کی وفات پر عربی زبان میں قطعۂ تاریخ لکھا تھا لہٰذا وہ اردو میں بھی اس زمانے میں شاعری کرتے تھے اور اس دور کے صوفی شاعر میر درد سے ہی اصلاح لیتے ہونگے ۔

ہمارے اس بیان کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ دیوان محبت "اردو" میں کئی ایسی غزلیات موجود ہیں جو نہ صرف میر درد کی غزلیات کی زمین میں کہی گئی ہیں بلکہ ان میں درد کا انداز بھی نمایاں ہے ۔ یہ غزلیات تصوف کے اعتبار سے تو درد کے کلام کی ہمسر نہیں البتہ دہلی کا رنگ، درد کی سادگی اور روہیل کھنڈ کا انداز ان سے صاف جھلکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے باوجود انکی شاعری میں روہیل کھنڈ اور دہلی کا رنگ قائم رہا ۔ درد دہلی کے خاص نمائندے تھے اور حسرت بھی دہلی سے لکھنؤ آئے تھے لیکن حسرت نے اپنے دیوان میں لکھنؤ کا اثر قبول کر لیا تھا ۔

کیا محبت خاں خواجہ حسن کے شاگرد تھے؟ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب فرماتے ہیں:

"اس بارے میں خود میر حسن مشتبہ ہیں جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے

---

[1] قدرت اللہ شوق نے ان اشعار کے پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ محبت نے اپنے کلام میں مفارقتِ اقربا و آوارگیِ وطن اور مہاجرت کا ذکر کربلا کے واقعے کی طرح کیا ہے ۔

باصلاح خواجہ حسن یا میاں حسرتؔ، جرأتؔ نمودہ" میر حسن کے تذکرے کی تکمیل ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے بین ہوئی جو محبتؔ کے ورودِ لکھنؤ کا زمانہ تھا اس لیے وہ یقین کے ساتھ نہیں لکھ سکے کہ محبت خواجہ حسن کے شاگرد تھے یا جعفر علی حسرتؔ کے۔ جہاں تک خواجہ حسن کا تعلق ہے وہ چشتی و مودودی درویش ہونے کی وجہ سے اُمرائے روہیلہ میں مقبول تھے۔ روہیل کھنڈ کی نوابی ختم ہونے کے بعد خواجہ حسن اور محبت لکھنؤ میں جمع ہوئے اور دونوں نے جعفر علی حسرت کی شاگردی اختیار کی۔ ان حالات کی روشنی میں یہ تو قرین قیاس ہے کہ جوان العمر محبت اور خواجہ حسن میں باہمی مشورۂ سخن ہوتا ہو لیکن یہ رائے کہ محبت نے خواجہ حسن سے اصلاح لی ہو قابلِ تسلیم معلوم نہیں ہوتا۔ اگر دونوں میں استادی و شاگردی کا رشتہ ہوتا تو خواجہ حسن یا تو کسی کے شاگرد نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی تو حسرتؔ کے ہرگز نہیں۔ میرے خیال میں اس قدیمی محبت و یگانگت کی بنا پر جو ان دونوں کے مابین تھی، میر حسن کو یہ گمان ہوا کہ محبت، خواجہ حسن سے اصلاح لیتے تھے۔ میر حسن کی تائید دیگر تذکرہ نگاروں نے نہیں کی ہے۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کی محولہ بالا رائے درست ہے کہ خواجہ حسن محبت کے استاد نہیں تھے۔ ان دونوں کے قریبی اور دیرینہ مراسم تھے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامِ روہیل کھنڈ کے دوران محبت نے کس کی شاگردی اختیار کی وہ شخصیت خواجہ میر دردؔ کی ہو سکتی ہے جو عقائد و مسلک کے اعتبار سے ایک صوفی بزرگ تھے اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے لیے بھی وہ اپنے بیٹے کے لیے قابلِ قبول ہو گئے۔ روہیل کھنڈ کی نوابی کے دور میں دردؔ سے محبت کا اصلاح لینا کوئی مسئلہ نہ ہوگا کیونکہ کسی پیغام رساں کے ذریعے یہ کام انجام دیتے ہوں گے اور محبت کے قیام روہیل کھنڈ کے دوران اور قلعۂ الہ آباد میں دو سال قید کے دوران، پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے بیان کے مطابق، محبت کا دردؔ سے

اصلاح لینا خلافِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ خواجہ میر درد کا انتقال ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ (مطابق ۱۷۸۲ء) کو ہوا جبکہ محبت خاں ۱۷۷۱ء میں لکھنؤ پہنچ چکے تھے، انہیں لکھنؤ میں حسرت جیسے استاد مل گئے جن کے ساتھ محبت کچھ سلوک بھی کرنا چاہتے تھے۔ اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ بریلی میں قائم چاندپوری، مصحفی، حکیم کبیر سنبھلی، فدوی لاہوری، محمد نعیم نعیم، میر عوض علی مدعا، پروانہ علی شاہ پروانہ مرادآبادی موجود تھے، محبت ان حضرات میں سے کسی کے شاگرد کیوں نہیں ہوئے، جبکہ یہ شعراء روہیل کھنڈ میں موجود تھے۔

دراصل محبت خاں کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی وہ ماحول بحوالہ بالا شعراء میں سے شاید ہی کسی کو ملا ہو۔ روہیل کھنڈ میں ایسے ایسے بزرگ جمع ہو گئے تھے جن کی قدر و منزلت علمی اعتبار کے ساتھ ساتھ روحانی اعتبار سے بھی تھی۔ شعراء میں سے بعض مختلف نوابینِ روہیل کھنڈ کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے لیکن محبت سے قریب ہونے والے شعراء اتنے بڑے یا مشاق شاعر نہیں تھے جو محبت خاں جیسے قابل و لائق نواب کی شاعرانہ صلاحیتوں کے مطابق ان کی رہنمائی کر سکتے۔ محبت کے اردو دیوان میں یہ اشارہ بھی نہیں ملتا کہ محبت درد کے شاگرد تھے، لیکن درد کے بارے ہی میں کیا بلکہ حسرت کے بارے میں بھی محبت کے کسی شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ان کے شاگرد تھے۔ دیوانِ محبت میں چند اشعار ایسے ضرور ملتے ہیں جن میں درد اور جرأت کے تخلص موجود ہیں لیکن ان سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ یہ محبت کے استاد ہیں البتہ جرأت کے بارے میں ایک شعر ایسا ہے کہ جس سے بعض حضرات کو مغالطہ ہو سکتا ہے سہ محبت اور نہ سمجھے کوئی بجز جرأت۔ جو قافیوں کی ترے ہے نشست کی خوبی

اس سے محبت کی یہ مراد ہے کہ جرأت ہی دراصل اس دور میں ایسے شاعر ہیں جو ایک تو محبت کے صیغۂ شاعری میں، ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں۔ جرأت فیض آباد میں نواب محبت خاں کی ملازمت میں آئے تھے۔ جرأت کی مثنوی "حسن و عشق" کے بعض اشعار سے ظاہر ہے کہ وہ ذی الحجہ ۱۱۸۸ھ میں نواب محبت خاں کی ہمراہی میں نواب آصف الدولہ کے ساتھ فیض آباد آ نا وہ گئے تھے اس وقت جرأت کی عمر (۱۱۶۳-۱۱۸۸) ۲۵ برس کی تھی۔ نواب محبت خاں ان سے تقریباً دو برس چھوٹے تھے۔ قابلیتِ علمی کے لحاظ سے بھی محبت خاں جرأت سے کہیں آگے تھے۔ جرأت کے بارے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جو دیوانِ محبت میں موجود ہیں۔

؎ یہ سخن سن لے محبت کا جو تیرے کان ہیں ۔ اس جہاں کے لوگ جرأت کوئی مہمان ہیں[1]

؎ اک محبت ہی نہ تھا نہیں آئی آفت ۔ کوئی شب ایسی نہ گزری کہ ترے بن جرأت
در و دیوار سے سر اپنے کو مارا نہ کیا

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب فرماتے ہیں :۔

شیخ قلندر بخش جرأت محبت خاں کی طرح جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے چنانچہ حسرت کے انتقال کے بعد (۱۷۹۵) محبت کا جرأت سے مشورہ کرنا ایک مضحک بات ہے اس وقت محبت خاں کی عمر تقریباً ۵۰ سال تھی وہ جامع العلوم تھے انھوں نے بیس اکیس سال حسرت سے اکتساب فیض کیا تھا لہذا حضرت کی وفات کے بعد محبت خاں کا محتاجِ اصلاح رہنا اور جرأت سے مشورہ سخن کرنا عقل سے بعید امر ہے اس وقت محبت کا ایک شعر نقل کرنا بے محل نہیں ہوگا۔

؎ شاعرانِ حال کو دیکھا سوا استاد کے
اب محبت ہے سخن پر ایک سر تیرا بلند[2]

---

[1] دیوانِ جرأت میں یہ مصرع موجود ہے، غالباً تلامذۂ حسرت نے اس مصرع پر طبع آزمائی کی ہوگی۔

[2] یہ شعر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ حسرت کے علاوہ اگر کوئی اس دور کا بڑا شاعر تھا تو وہ محبت خاں تھے۔

ایک اور دلچسپ بات جس کا ضمناً ذکر ہم اسی باب کے شروع میں کر چکے ہیں، وہ یہ ہے کہ جعفر علی حسرت
اردو شاعری میں سرب سنگھ دیوانہ کے اور فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکیں کے شاگرد تھے جب کہ محبت خاں کے
بارے میں بھی کسی کو یہ اختلاف نہیں ہے کہ انکی فارسی شاعری کے استاد مرزا فاخر مکیں تھے۔ اس گفتگو سے ہمارا مقصد یہ
ہے کہ محبت خاں کوئی معمولی شاعر نہ تھے ورنہ اتنی فارسی تو جعفر علی حسرت بھی جانتے ہونگے کہ اشعار کے عام سقم کو
پہچان سکیں بلکہ مرزا جعفر علی حسرت اردو شاعری کے علاوہ، فارسی زبان میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے[1]
اور یہ فارسی استعداد کا اثر تھا کہ ان کا کلام جا بجا فارسی محاوروں کے خوشگوار ترجموں سے مزین نظر آتا ہے[2] لہٰذا اردو
شاعری میں تو محبت خاں مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے لیکن حسرت سے ان کا تلمذ لکھنؤ آنے کے بعد ہی قائم ہوا
البتہ قیام روہیل کھنڈ کے دوران زیادہ امکانات اسی بات کے ہیں کہ وہ خواجہ میر درد سے کسی بھی ذریعے سے اصلاح لیتے رہے
ہونگے البتہ یہ سلسلہ بہت کم مدت کے لیے قائم رہا ہوگا کیونکہ پھر محبت خاں کو لکھنؤ آنا پڑا۔ آخر چند معتبر قسم کے
تذکرہ نگاروں نے محبت کو درد کا شاگرد بلا وجہ تو نہیں لکھ دیا۔ محبت فرماتے ہیں:

ہو درد اور ہم ہوں خدایا ہم ہوں اور درد ۔ اے تو رکھ مدام ہمیں مبتلائے درد

دیوان محبت اردو میں اگر کسی اردو شاعر کی پیروی نظر آتی ہے تو وہ درد ہی ہیں۔ محبت نے اس دور کے
خدائے سخن کے سامنے بھی لب کشائی کی لیکن ان کے کسی شعر سے درد کی تضحیک نہیں ہوتی، ہم یہ بھی واضح کرتے
چلیں کہ درد کی طرح محبت ایک صوفی شاعر نہیں ہیں لیکن انداز سخن اور سادگی الفاظ اور چھوٹی بحروں کی غزلیں اور
وہ غزلیات جو درد کی غزلوں کی زمین میں کہی گئی ہیں درد کی پیروی کے مترادف ہیں۔ لکھنؤ آکر محبت،
حسرت کے شاگرد ہوئے یہ بات ہمیں بلا شک و شبہ تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں دیوانِ حسرت مرتبہ
حسرت موہانی میں نقشۂ سلسلۂ حسرت دیا گیا ہے اسے ہم بعینہٖ پیش کرتے ہیں:۔

---

[1] حسرت موہانی: "دیوان حسرت"، طبع اول، علی گڑھ مطبع الہدی، ص ۱۸۔
[2] حسرت کا کلام اکثر شعرائے متقدمین کی مانند تصنع اور ناگوار رعایات لفظی سے پاک ہے اور درد و سادگی خیال کی بنا پر فی الجملہ میر کے کلام سے مشابہ ہے۔ (دیوان حسرت، مرتبہ حسرت موہانی صفحہ ۱۹)

اس بحث کے اختتام سے قبل لالہ سری رام مؤلف "خم خانۂ جاوید" کے الفاظ دیکھتے چلیے ۔

حسرت کے شاگردوں میں شہرت اور قابلیت کے لحاظ سے سب سے اول نمبر تو حضرت جرأت کا ہے ان کے بعد قدرت اللہ قدرت، نواب محبت خاں محبت شہباز جنگ اور خواجہ حسن محسن لکھنوی وغیرہ کا نمبر ہے یہ لوگ صاحبِ دیوان اور مسلم الثبوت استاد گزرے ہیں ۔

محولہ بالا رائے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حسرت کے شاگردوں میں یہ تمام مسلم الثبوت استادِ سخن تھے اور جب محبت خاں بھی مسلم الثبوت استاد تھے تو ان کا اپنے ہم عمر جرأت یا خواجہ حسن کا شاگرد ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ بنظر انصاف دیکھا جائے تو حسرت کے شاگردوں میں سے اگر کسی کو کثیر اللسان ہونے کے لحاظ سے اوّل نمبر دیا جائے تو وہ صرف اور صرف نواب محبت خاں کا ہوگا ، حسرت کے دیگر شاگرد تو اردو اور زیادہ سے زیادہ فارسی میں شعر کہتے ہونگے جبکہ محبت خان اردو ، فارسی ، عربی اور پشتو زبان کے قادر الکلام شاعر تھے ۔ اور جہاں تک جرأت کا تعلق ہے تو وہ اردو کے علاوہ دوسری زبان کے شاعر کی حیثیت سے نہیں پہچانے جاتے ۔

مولانا محمد حسین آزاد آبِ حیات میں فرماتے ہیں :

"جرأت اگرچہ علوم تحصیلی میں ناتمام تھے ۔ بلکہ عربی زبان سے ناواقف تھے "

مزید فرماتے ہیں :

" ان کی نکتہ یابی اور سخن فہمی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قصیدہ وغیرہ اقسامِ شعر پر ہاتھ نہ ڈالا ۔ بلکہ زبان فارسی کی طرف خیال بھی نہیں کیا ۔ مناسب طبع دیکھ کر غزل کو اختیار کیا اور امراء اور ارباب نشاط کی صحبت نے اسے اور بھی چمکایا "

جرأت ، محبت کے یہاں صیغۂ شاعری میں ملازم تھے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ محبت کے استاد تھے

حاشیہ ۔ محبت کا پشتو دیوان بوڈلین لائبریری آکسفورڈ لندن میں موجود ہے ۔ راقم نے چند صفحات (فوٹو اسٹیٹ) حاصل کیے ہیں ۔

نقشۂ سلسلۂ حسرت [1]

---

[1] اس نقشے میں جن لوگوں کا سلسلۂ شاگردی اب تک قائم ہے ان کو درمیان میں رکھا گیا ہے باقی استادوں کو ان کے درجۂ شاعری کے اعتبار سے داہنے اور بائیں جانب جگہ دی ہے۔ چنانچہ اس حساب سے نمبر بھی لگا دیے ہیں
(دیوانِ حسرت)

نقشۂ سلسلۂ حسرت میں درجۂ شاعری کے اعتبار سے محبت خاں کا جو درجہ متعین کیا گیا ہے اس سے ہم اتفاق نہیں کرتے۔ دراصل حسرت موہانی دیوان حسرت کی ترتیب کے وقت اس بات سے آگاہ نہیں تھے کہ محبت خاں فارسی اردو شاعری کے علاوہ عربی اور پشتو زبان کے بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ حسرت موہانی اس حقیقت کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ محبت اردو کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ لیکن اس ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ محبت خاں کے اردو دیوان کا سراغ نہیں ملتا۔ اور پھر انہوں نے چند تذکروں کی مدد سے ایک فارسی غزل کے چار اشعار اور چار اشعار مختلف اردو غزلوں کے پیش کر دیے اور محبت کا درجۂ شاعری پہلے ہی بحوالہ نقشۂ سلسلۂ حسرت کے ذریعے متعین کر دیا۔[1] اگر حسرت موہانی کے سامنے محبت کا مکمل اردو دیوان اور انکی دیگر تخلیقات ہوتیں تو یقیناً وہ محبت کو حسرت کا سب سے بڑا شاگرد ظاہر کرتے۔ اس مختصر بحث کے بعد ہم بہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ محبت اپنے ہم عصر شعراء میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے کیوں اس دور میں اور کون ایسا شاعر تھا جو چار زبانوں میں شاعری کر سکتا تھا۔ اگر بنظرِ انصاف محبت کا درجۂ شاعری متعین کیا جائے تو وہ اپنے استاد حسرت سے بھی بہت آگے نکل جاتے ہیں۔[2] جرأت کو محبت کا استاد ثابت کرنا محبت کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔

محبت ایک کہنہ مشق پختہ گو اور زود گو شاعر تھے جنہیں عربی، فارسی، پشتو اور اردو پر عبور حاصل تھا اور اگر درد سے ان کا رشتۂ تلمذ ثابت نہیں ہوتا تو حسرت کے بارے میں بھی محبت نے کسی شعر کے ذریعے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ ان کے شاگرد ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جرأت اور خواجہ حسن انکے استاد بھائی تھے اور وہ محبت خاں سے زیادہ قریب تھے اور محبت کے دیوانِ اردو کی ترتیب میں جرأت نے کچھ مشورے دیے ہوں گے، ویسے جرأت کی آنکھیں بھی جاتی رہی تھیں لیکن وہ تھے ایک چالاک انسان اور ان میں شعر و سخن کی اچھی صلاحیت موجود تھی طبیعت میں مسخراپن تھا، اور نواب موصوف کے صیغۂ موسیقی میں خاص طور پر ملازم تھے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسرت موہانی نے بعض تذکرہ نگاروں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے محبت کا درجۂ شاعری متعین کر دیا جیا کہ لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید نے حسرت کے شاگردوں میں اول درجہ جرأت، دوسرا درجہ قدرت کو تیسرا درجہ خواجہ حسن کو اور چوتھا درجہ محبت خاں کو دیا ہے۔

[2] کثیر اللسان شاعر کی حیثیت سے محبت اپنے استاد حسرت سے بھی آگے نکل گئے۔

صرف اس بنا پر یہ گمان گذرا ہو کہ نواب محبت خان کی مادری زبان اردو نہ تھی لہذا انھوں نے آخر دم
تک اس زبان میں شاعری کرتے ہوئے کسی سے اصلاح کی ضرورت محسوس کی ہو گی، حالانکہ یہ گمان اس لیے
نہیں گذرنا چاہیئے کہ محبت خان گو وہ پشاور میں پیدا ہوئے تھے جبکہ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کی زبان
فارسی اور عربی تھی اور جب محبت نے ہوش سنبھالا تو روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کی سرپرستی
نوابینِ روہیل کھنڈ خود فرما رہے تھے' ہاں البتہ ان کے اردو دیوان میں چند پشتو الفاظ بھی استعمال
ہوئے ہیں جو ہماری اس بات کو تقویت دیتے ہیں کہ اگر محبت جرأت سے مشورۂ سخن کرتے تو وہ
ان پشتو الفاظ کو نظر انداز کر کے خالص اردو کے الفاظ استعمال کرتے - اور اگر محبت نے قیامِ روہیل کھنڈ
کے دوران جرأت سے اصلاح نہیں لی تو وہ کون سے دوسرے استاد شاعر تھے جن سے نواب محبت خان نے
قیامِ روہیل کھنڈ کے اور قلعہ الہ آباد میں دو سال قید کے دوران اردو شاعری میں اصلاح لی -
اور پھر بعد میں روہیل کھنڈ سے نکلنے کے اور لکھنؤ پہنچنے کے بعد وہ حسرت کے شاگرد ہوئے -

— × —

نواب محبت خان کے مذہبی عقائد

نواب محبت خاں محبت قیس عبدالرشید کی اولاد میں سے تھے۔ قیس اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ تھے جو مذہب باطل کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے اور ان کا اسلامی نام عبدالرشید رکھا گیا، یہ زمانہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہری کا زمانہ تھا۔ قیس عبدالرشید نے دیدارِ مصطفوی کے شوق میں افغانستان سے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور انکی شادی سارہ بنت خالد بن ولید سے مدینے میں انجام پائی۔ ان سے سرٹرہ بن غور نمشت اور بٹین تین فرزند ہوئے، ان ہی سے پٹھان اپنا سلسلۂ نسب ملاتے ہیں۔ قیس عبدالرشید کا بڑا بیٹا سرٹرہ بن کا بیٹا سرخبوں تھا جس کا اسلامی نام شرف الدین تھا، اس کا بیٹا بھڑیچ کے نام سے تاریخ میں شہرت رکھتا ہے۔ بھڑیچ کی اولاد میں حافظ الملک حافظ رحمت خاں مشہور ہوئے جو نواب محبت خاں[1] کے والد تھے۔

نواب محبت خاں کے جد امجد شہاب الدین المعروف بہ کوٹا بابا بھی یوسف زئی قبیلوں سے قرابت کی بنا پر قندھار سے وادیٔ سوات اٹک لنگر کوٹ کے مقام پر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ شیخ کوٹا بابا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ ان کا لقب کوٹا بابا اسی لیے پڑا کیونکہ کوٹا کتے کو کہتے ہیں اور یہ اپنے آپ کو رسول مقبول کا ادنیٰ غلام اور انکے در کا کتا کہتے تھے[2] کوٹا بابا ہزارہ، پنجملہ اور سمہ کے علاقوں میں بھی آتے جاتے رہتے تھے اور اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے ایک بزرگ کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ مزارات اور خانقاہوں سے عقیدت اور بزرگانِ دین کی صحبت نے ان کے اندر درویشانہ صفات اس حد تک پیدا کر دیں کہ بے شمار افراد انکے ایک اشارے کے منتظر رہنے لگے اور ان کی ذات سے بہت سی کرامات کا ظہور ہوا۔ آج بھی یہ مشہور ہے کہ ان کے

---

[1] نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں ابن شاہ عالم خاں ابن محمود خاں ابن شہاب الدین خاں ابن دولت خاں ابن بدل خاں ابن داؤد خاں ابن بھڑیچ خاں۔

[2] اس مناسبت سے لوگ انھیں کوٹا بابا بھی کہتے تھے۔

مزار کے قریب خندہ وبلوس کے درختوں میں سے اگر کوئی لکڑیاں کاٹ لیتا ہے تو اس کا کچھ نقصان ضرور ہو جاتا ہے[1]۔ شیخ کوٹا بابا کے بیٹوں[2] میں سے محمود خاں عرف موتی بابا نے اپنے والد کا طریقہ اختیار کیا ۔ وہ ان کے سجادہ نشین ہوئے، محمود خاں عرف موتی بابا نے اپنے والد کا طریقہ اختیار کیا اور وہ ان کے سجادہ نشین ہوئے ۔ محمود خاں عرف موتی بابا کے پانچ بیٹوں میں سے شاہ عالم خاں نے اہل اللہ کا طریقہ اپنایا اور ترک دنیا اور تنہائی میں اپنا وقت گزارا ۔ انکے بیٹے حافظ رحمت خاں نے، جو محبت خاں کے والد تھے، دین کے ساتھ دنیاداری کو بھی کامیابی سے نبھایا ۔ اس خاندان کے متقی اور پرہیزگار لوگوں کی ایک طویل فہرست ہے ۔ زیادہ تر یہ حضرات مودودی سلسلے سے بیعت تھے اور حنفی عقیدہ رکھتے تھے ۔

نواب محبت خاں پیر اکبر علی مودودی سے بیعت تھے، نواب محبت خاں انکے مشورے سے کام کرتے تھے ۔ شہزادہ جہاندار شاہ ناراضگی کے سبب جب دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تو نواب محبت خاں کو ملاقات کے لیے بلوایا اور چار ہزار روہیلوں سے مدد طلب کی تاکہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کر سکیں، نواب محبت خاں نے اس سلسلے میں اپنے پیر و مرشد سے صائب رائے چاہی لیکن انہیں اثبات میں جواب نہیں ملا اور شہزادے کو ناکام و نامراد واپس ہونا پڑا ۔ نواب محبت خاں اپنے خاندان کے دیگر افراد کی طرح حنفی عقائد "اہل سنت" کے طریقے پر گامزن تھے ۔ انکے کلام میں اس عقیدے کا اظہار متعدد بار کیا گیا ہے فرماتے ہیں :

ؔ اک میم کو احمد کی کہتا ہے زیادہ وہ ۔ گو کفر ہو پر یہ ہے اسلام محبت کا

ؔ نبی، شفیع محبت علی وسیلہ ہے ۔ نبی سے کام ہے اور مرتضیٰ علی سے غرض

جہاں تک حضور اکرم سے عقیدت اور محبت کا تعلق ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان کو اپنے ماں باپ اور اولاد سے زیادہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت اور محبت ہونی چاہیئے ۔ محبت خاں، عشق رسول کے ساتھ ساتھ آل رسول سے بھی عقیدت

---

[1] شیخ شہاب الدین کوٹا بابا کا مزار ہزارہ میں زیارت گاہ خاص وعام اور مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

[2] شیخ شہاب الدین کوٹا بابا کے تین بیٹے تھے، بائی خاں، محمود خاں اور آدم خاں ۔

رکھتے تھے فرماتے ہیں:

ــــ توفیق مجھ کو بھی دے تا آں کا میں اس کے۔ کرتا رہوں ہر اک پر اعلام محبت کا
ــــ ہے آلِ نبی قائم مجھ پر بھی طفیل انکے۔ تا حشر رہے یارب یہ نام محبت کا

دیوان محبتؔ میں ایک منقبت در شان حضرت علیؓ بھی ہے۔ ساٹھ مصرعوں پر مشتمل یہ منقبت مخمس کے انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ اسکا ہر شعر عقیدت و محبتِ علیؓ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں

ــــ جس نے اصحابِ باصفا کو دیکھا۔ اس نے گویا کہ مصطفیٰ کو دیکھا
ــــ اور جسکی نظر پڑی نبی پر واللہ۔ اس نے تو بعینہٖ خدا کو دیکھا

صحابۂ کرامؓ سے عقیدت و محبت کے باب میں محبتؔ کے عقائد واضح ہیں دو منظوم شجرے بھی موجود ہیں۔ پہلا شجرہ ۲۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ حضور اکرمؐ سے ابتداء اور پھر بارہ اماموں کے ذکر کے بعد محبتؔ کے پیر و مرشد حضرت اکبر علی مودودی پر اس شجرے کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے (یہ شجرہ فارسی زبان کی شیرینی واثت کا بہترین نمونہ ہے) ــــ اے خدا من بحق تاجدار انبیاء۔ صاحبِ صلواۃ و تسلیم آں محمد مصطفیٰ

ــــ اے خدائے من بحق آں امام الاوصیا۔ حیدر مشکل کشا یعنی علی مرتضیٰ

نواب محبت خاں کے مرشد اکبر علی مودودی کی ہمیشہ ان پر نظر کرم رہی۔ ہم نے محبت خاں کے حالاتِ زندگی کے باب میں "نقشِ سلیمانی" کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے تحت محبت خاں کا دردِ گردہ انکے پیر و مرشد نے اس وقت اپنے سر لیا تھا، جبکہ نواب محبت خاں سخت تکلیف میں مبتلا تھے اور انہیں یہ درد اکثر ستاتا تھا لیکن اس کے بعد باقی ماندہ عرصۂ حیات میں نواب موصوف کو اس درد کی کبھی شکایت نہیں ہوئی، جبکہ انکے پیر با کرامت کا وصال اسی دردِ گردہ کے سبب ہوا تھا۔ بہر حال اس شجرے کا اختتام محبتؔ نے اپنے پیر و مرشد کے بارے میں ان اشعار پر کیا ہے:

~ اے خدائے من بحقِ دستگیر و پیرِ من ۔ آں علی اکبر کہ در کونین شد ہادی مرا
~ دین و ہم دنیا محبت رابدہ از فضلِ خود ۔ کردہ بودی چون سلیمان و سکندر را عطا

دوسرا شجرہ بھی چھتیس ۳۶ اشعار پر مشتمل ہے جسکی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے (یہ شجرہ بھی فارسی میں ہے) :۔

~ خداوندا بحقِ راز احمد سیدِ مرسل مرا ۔ کہ بادا بروی و بر آل وی صلوٰۃ تسلیما
~ خداوندا بحقِ راز شاہِ اولیا حیدر ۔ علی مرتضیٰ گو شد امامِ دین و ہم دنیا
~ خداوندا بحقِ راز آں شیخ حسن بصری ۔ کہ دایم نزدِ حق باشد مقامِ قربتش اعلیٰ

اس شجرے کا اختتام ہی محبت خاں کے دیوان کا اختتام ہے ۔ اس کے چند اختتامیہ اشعار دیکھیے :

~ خداوندا بحقِ راز شیخ المسلمیں سید ۔ سراج الحق امیر اللہ مودودی شہ والا
~ خداوندا بحقِ راز پیرم و نامش ۔ محمد میر و گویند شاہ بہلی ہر کسی او را
~ خداوندا بحقِ راز پیرِ دستگیرِ من ۔ علی اکبر کہ شد بیگانہ از دنیا و ما فیہا
~ محبت رابدہ حُبِّ خود اول بعد آں یارب ۔ عطا لیش کن ز فیضِ عامِ خود ہم دین و ہم دنیا
~ زِ انشادی کہ شد صادر یمن از حضرت پیر غمد ۔ ز وقتِ صبحدم تا چاشت ایں منظوم شد انشا

علاوہ اس کے کہ محبت خاں کے تحریر کردہ دونوں شجرے فارسی پر انکی مکمل دسترس کا ثبوت پیش کرتے ہیں، یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ محبت خاں سنّی العقیدہ صاحبِ سلسلہ شخص تھے، جو عشقِ رسول اور اصحابِ رسول کے ساتھ آل محمد و اہلِ بیت رضی سے بھی بھرپور عقیدت رکھتے تھے ۔

باب دوم

عہد و ماحول

روہیل کھنڈ تاریخ کے آئینے میں

اودھ و نوابانِ اودھ

روہیل کھنڈ میں اردو شاعری

لکھنؤ کا ماحول علم و ادب

احوالِ روہیل کھنڈ "تاریخ کے آئینے میں"

نواب مستجاب خاں رقمطراز ہیں :

"روہ عبارت از کوہستان است کہ ابتدائی آن باعتبار طول
از سواد باجور تا قصبہ سوئی از توابع بھکر است و عرضش
از حسن ابدال تا کابل و قندھار در حدود این واقع است"[۱]

روہ سے مراد کوہستانی علاقہ ہے، خاص طور پر موجودہ صوبہ سرحد کی ایک پٹی کا نام "روہ"[۲] تھا، روہ کا یہ علاقہ افغانستان میں موجود ایک وسیع کوہستانی سلسلہ ہے جسکے شمال میں کوہِ کاشغر جنوب میں بکھر اور بلوچستان، مشرق میں کشمیر، مغرب میں دریائے ہلمند جو قندھار کے قریب بہتا ہے موجود ہیں[۳]۔ یہاں پر بسنے والے باشندے فلسطین یا جزیرہ نمائے عرب سے نقل مکانی کر کے اس علاقے میں آباد ہوئے تھے۔

حضرت طالوت افغان قوم کے جدِ اکبر و مورثِ اعلیٰ ہیں۔ آپ علاقہ مصر و فلسطین کے درمیان رہائش پذیر تھے لیکن ایران کے آتش پرست بادشاہ بخت نصر اور اسکے پیرووں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر غور و غزنی اور پھر کوہستان، روہ اور کوہِ سلیمان میں منتقل ہو گئے۔ ۴۲ھ (۶۶۲-۶۳ء) میں عبدالرحمٰن بن سمرہ اور مہلب بن ابی صفرہ کی سرکردگی میں، اسکے بعد ۶۲ھ (۶۸۱-۲ء) میں سلم بن ابی زیاد کی سرکردگی میں جب لشکرِ اسلام غور و غزنی، خراسان، سیستان، کابل قندھار، کوہ سلیمان پشاور اور ملتان پہنچا تو ان علاقوں کے باشندے جن میں افغان بھی شامل تھے مشرف بہ اسلام ہوئے[۴]۔

جب یہ لوگ روہیل کھنڈ کے اس علاقے کٹھیر میں آکر آباد ہوئے تو ان کے اصل وطن روہ کی مناسبت سے یہ علاقہ روہیل کھنڈ[۵] کہلایا۔ کٹھیر کا ذکر رامائن اور مہابھارت میں موجود ہے۔ کٹھیریا نامی سورج بنسی راجپوتوں کی ایک شاخ قنوج سے نکالے جانے کے بعد ۱۰۰۰ء میں یہاں آکر آباد ہو گئی تھی۔ اس سرزمین کا نام اس لیے کٹھیر رکھا گیا تھا، جو علاقہ "روہ" سے نقل مکانی

---

۱ نواب مستجاب خان: "گلستان رحمت" قلمی فارسی، ص ۱۳ – ۲ سید مصطفیٰ علی بریلوی: "ہندوستان کے [illegible] انجمن [illegible] آباد" ص ۵۷ – ۳ سید الطاف علی بریلوی: "حیات حافظ رحمت خان"، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ص [illegible] – ۴ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی: "تاریخ عہد [illegible]"، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۶۵ء۔
۵ کھنڈ سنسکرت میں ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ جبکہ روہ خشکی اور پہاڑی علاقوں کے معنوں میں استعمال [illegible]

کرنے والے روہیلوں کی نسبت سے روہیل کھنڈ بن گیا۔ مؤلف اخبار الصنادید کے مطابق:

"روہ ایک وسیع وپہاڑ ہے اسکی مشرقی حد جبال کشمیر اور اسکی مغربی حد دریائے ایلمن ہے۔ یہ ان دونوں حدوں کے درمیان واقع ہے جسکی مسافت تقریباً ڈھائی ماہ سے زیادہ ہے۔ اسکی شمالی حد کوہ کاشغر، جنوبی حد بلوچستان، کوہ سلیمان قندھار، پشاور، خیبر باجوڑ، حسن ابدال ہے ان ہی علاقوں میں بسنے والے روہیلے کہلائے۔"

بعضوں کا بیان ہے کہ روہیلہ پٹھانوں کی ایک قسم ہے جو بلوچوں سے نکلی ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ اس ملک میں "پہاڑی آدمی" ہوتا ہے۔ یہ روہیلے اپنی قوی الجثہ جسامت کی وجہ سے سلطان محمود غزنوی کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سلطان نے باقاعدہ طور پر انھیں فوج میں بھرتی کیا، انکی بہادری اور فرمانبرداری کو سراہتے ہوئے انھیں "بتان" یعنی جہاز کا پشتی بان قرار دیا۔ روہیلے محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان کے بڑے بڑے معرکوں میں شریک ہوئے۔ سالار مسعود غازی عرف بالے میاں[1] ۱۰۲۸ء میں روہیل کھنڈ[2] کے علاقے پر حملہ آور ہوا اور اودھ کے موجودہ شہر بہرائچ تک پہنچ گیا۔ کشت وخون کے بعد بڑی تعداد میں مسلمان شہید ہوئے لہذا اس علاقے کا نام "گنج شہیداں پڑ گیا"۔ ان شہداء میں علماء اور بزرگانِ دین کی ایک بڑی تعداد شامل تھی جبکہ "روہ" سے آنے والے روہیلوں کو اہل اللہ سے خاص عقیدت حاصل تھی اس لیے انھوں نے اس علاقے کو اپنا مسکن بنایا دوم یہ کہ یہ علاقہ ظاہری طور پر پر کشش تھا۔ کٹھیر میں علی محمد خاں سے قبل روہیلوں کا وجود پایا جاتا ہے ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) بہلول لودھی نے سلطنت کی توسیع کے لیے افغانوں کو طلب کیا، ہندوستان کے ہر شہر میں افغان جمع ہو گئے۔ بہلول لودھی اور شیر شاہ سوری کے زمانے میں ہندوستان میں افغانوں کی آبادی بڑھتی رہی۔

---

[1] سید الطاف علی بریلوی: "حیات حافظ رحمت خان"، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ص ۴۱

[2] سید سالار مسعود غازی ہمشیر زادہ سلطان محمود غزنوی نے صرف بدایوں پر ۱۰۲۸ء میں حملہ کیا تھا۔ (بحوالہ حیات حافظ رحمت خان) ص [illegible]۔

وہ کٹھیر میں دامنِ کوہ کے زمینداروں کی نوکریاں کرتے اور انکے ساتھ خانہ جنگیوں میں شریک ہوتے تھے، رفتہ رفتہ یہ افغانوں کے جتھے آنولہ، نجیب آباد، مئو، بریلی، پیلی بھیت اور شاہجہاں پور میں جمع ہوگئے[1]۔ خاندان تغلق کے عہد میں یہاں کے جفاکش افراد کثرت سے فوج میں بھرتی ہوئے اور بنگالے تک پھیل گئے۔ لودھی، سوری، سروانی کا تعلق ان ہی قبائل سے تھا جو گھوڑوں کی زین سے، مسندِ امارت اور تختِ شاہی تک پہنچے[2]۔ مغلوں کے دور میں اول تازہ ولایت مغل ازبک سواروں کا تانتا بندھا رہا۔ شاہجہانی بدخشانی مہمات کے بعد یہ سلسلہ کم ہوا تو ہندوستان کے سادات و صوبۂ کابل کے سپاہیوں کی طلب بڑھ گئی۔ عالمگیر نے بنگش اور روہیلے شاہی فوج میں بھرتی کیے، ان قبیلوں نے جانبازی کے صلے میں دوآبے کے نزدیک جاگیریں پائیں۔

۱۷۰۷ء میں داؤد خان نے اس علاقے میں آکر بود و باش اختیار کی[3]، داؤد خاں شاہ عالم خاں کا غلام تھا، جو حافظ رحمت خاں کے والد اور نواب محبت خاں کے دادا تھے۔ داؤد خاں ترکہ پدری میں شاہ عالم کو بطور غلام ملا تھا۔ اس وقت انکے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی لہذا شاہ عالم نے اسے اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا اور زراعت کا جملہ کام اس کے سپرد کر دیا تھا، جب داؤد خاں نے جوان ہو کر علاقہ روہیل کھنڈ میں اپنے ہم وطنوں کے کارنامے سنے تو اس نے "روہ" سے اس علاقے میں جانے کا ارادہ کیا تاکہ وہ بھی دوسرے روہیلوں کی طرح دولت کمائے۔ ایک روز وہ شاہ عالم خاں کی مرضی کے خلاف راہِ فرار اختیار کرکے بہادر شاہ ابنِ اورنگ زیب کے عہد میں کٹھیر میں وارد ہوا[4]۔ آنولہ کا علاقہ اسی روہیلہ دور میں ابھر کر سامنے آیا لیکن اس سے قبل آنولہ کو شمالی ہند کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ آنولہ سے سات میل کے فاصلے پر آنولہ شاہ آباد روڈ پر رام نگر گاؤں سے متصلہ علاقوں میں آج بھی کھنڈرات موجود ہیں۔

۱۔ سید الطاف علی بریلوی: "حیاتِ حافظ رحمت خان"، ص ۲۱۔
۲۔ ہندوستان کے بنگش پٹھان: سید مصطفیٰ علی بریلوی، مجلہ، انجمن احباب فرخ آباد، کراچی، ص
۳۔ ڈبلیو فرینکلن: "تاریخ شاہ عالم" میں روہیلوں کی آمد ۱۶۰ سال قبل بتاتے ہیں جبکہ یہ کتاب ۱۷۹۱ء میں تحریر کی گئی۔ اس طرح عام خیال کے مطابق روہیلے ۱۶۳۱ء میں اس علاقے میں وارد ہوئے۔ حیاتِ حافظ رحمت خاں کے مطابق روہیلوں کی آمد بہلول اور شیر شاہ سوری کے زمانے میں پائی جاتی ہے۔
۴۔ سید الطاف علی بریلوی: "حیاتِ حافظ رحمت خان"، ص ۷۱۔

قدیم زمانہ ویدک سے مہاراجہ ہرش کے دور میں یہاں ایک عالی شان شہر بسا ہوا تھا، جو ہزاروں سال تک اس علاقے کا دار الخلافہ رہا[1]۔ یہ تمام علاقہ پانچال جنپد کہلاتا تھا۔ ویدک لٹریچر میں اس پانچال اور یہاں کے مختلف راجاؤں کا ذکر ملتا ہے۔ ان دونوں علاقوں پر کبھی علیحدہ علیحدہ راجاؤں کا دور دورہ رہا اور کبھی ایک ہی راجہ کے ہاتھ میں عنانِ حکومت رہی۔ اس علاقے کو شمالی پانچال بھی کہا جاتا رہا ہے[2]۔

داؤد خاں جب کٹھیر میں آکر سکونت پذیر ہوا اور بعد میں نواب علی محمد خاں نے یہ علاقہ فتح کیا تو یہ علاقہ روہیل کھنڈ کہلایا۔ حیات حافظ رحمت خاں کے مطابق راجہ ہرنندن کی لڑائی کے بعد سے روہیلوں کے تمام مقبوضات کا مجموعی نام کٹھیر کی بجائے روہیل کھنڈ ہوا۔

بقول مصنف قصۂ احوالِ روہیلہ (میر رستم علی بجنوری) تصنیف ۱۱۹۵ھ روہیل کھنڈ کے حدود یہ ہیں:۔

"شاہ جہاں پور سے تمام تلہٹی پہاڑ کی سے تو ہر دوار کنارے دریا و گنگ تیٹ"

روہیل کھنڈ کے حدود میں بجنور، مراد آباد، بریلی، بدایوں، شاہجہاں پور کے علاقے آتے ہیں۔

ڈبلیو ہنٹر کے مطابق: روہیل کھنڈ کا یہ علاقہ دریائے گنگا کی جانب مشرق ۲۸ درجے اور ۳۰ ویں درجے عرض البلد شمال کے درمیان ۷۸ سے ۸۰ طول البلد تک پھیلا ہوا ہے۔ پہاڑوں کی ترائی میں واقع نواحی علاقوں سے جو کمایوں سے لال ڈانگ ہوتا ہوا شہر پیلی بھیت تک چلا گیا ہے، شمال اور مغرب میں دریائے گنگا اس کی حد بندی کرتا ہے۔ اس علاقے کی مٹی زرخیز ہے، رنگ سیاہ مائل ہے بہت سے مقامات پر ریت اور سرخ رنگ کی بالو کی آمیزش ہے[3]۔ یہاں ہر قسم کا غلہ تمباکو اور گنا کاشت کیا جاتا ہے۔ اس علاقے میں متعدد چھوٹی ندیوں کے علاوہ کئی بڑے دریا بھی بہتے ہیں۔ رام گنگا ندی شمالی مشرقی پہاڑی سلسلے سے نکل کر کولی گھاٹ کے مقام پر ہندوستان کے علاقے میں داخل ہوتی ہے، یہی ندی روہیل کھنڈ کے وسیع علاقے کو سیراب کرتی زمین کو

۱۔ آفتاب احمد خاں ایم۔اے: "آنولہ کی مختصر تاریخ"، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ص ۲۔

۲۔ ایضاً " " " ۳۔

۳۔ اسلیے اس علاقے کی زمین کاشتکاری کے لیے نہایت موزوں ہے۔

کو زرخیز بناتی، اپنی راہ میں آنے والے دوسرے دریاؤں کو ضم کرتی ہوئی بالآخر قنوج کے قریب گنگا میں مل جاتی ہے۔ دریائے گنگا سال میں سات ماہ جہاز رانی کے قابل رہتا ہے اسکی دھار چوڑی اور تیز ہے اسکے کنارے پر بڑے بڑے گاؤں آباد ہیں، مشرقی سمت میں دیوا جو اسی پہاڑی سے نکلتی ہے اور پیلی بھیت کی آبادی کے قریب سے بہتی ہوئی شاہجہاں پور میں دیوا گمبرا نام کی ندی میں مل جاتی ہے اور اسی کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ اسی کے نواح سے جو کمایوں کی پہاڑی ترائی میں ہیں، فرکی لکڑی اور سال وغیرہ حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ ندی بیروں اور دیگر مقامات کو سیراب کرنے کے بعد رام گنگا میں اس مقام پر جا گرتی ہے جہاں گنگا سے اس کا اتصال ہوتا ہے۔ اس علاقے کی چھوٹی ندیاں، کوسیلا، ناہول، بیگل، دکرا، بکرا، بہیرا اور یار وفادار روہیل کھنڈ کی زراعت کو ترقی دینے میں معاونت کرتی ہیں۔ بندوں نالیوں اور کاریزوں کے ذریعے پانی کی تقسیم ہوتی ہے[1]۔ اس علاقے کی زمین کی ایک خوبی یہ ہے کہ ملک کے کسی بھی حصے میں سطح زمین سے چند فٹ کھودنے پر پانی وافر مقدار میں دستیاب ہو جاتا ہے۔

روہیل کھنڈ کے علاقے کی ہر دور میں اہمیت رہی ہے۔ سلطنت کے ابتدائی ایام میں تجارت کو بیاد، خوب فروغ حاصل ہوا۔ بڑے بڑے شہروں مثلاً شاہ آباد، شاہجہاں پور، بریلی، بسولی، بدایوں، آنولہ، مراد آباد اور سنبھل سے زمانہ سابق میں شمال کے کاروانوں سے مسلسل تجارتی تعلق قائم رہا۔ ان کاروانوں کے سبب لاہور، کابل، کشمیر، قندھار اور فارس کی پیداواریں مثلاً لعل، قیمتی پتھر، تانبہ، لوہا، ٹین، سیسہ، ادویات کشمیری شالیں، کرمان کی اون، خچر گھوڑے اور اونٹ کٹھیر کے علاقے میں درآمد ہوتے تھے، انکے بدلے میں وہاں کپڑا، غلہ اور تمباکو بھیجا جاتا تھا۔

جب تک ہندوستان میں پٹھانوں کی سلطنت رہی آنولہ، بسولی، پیلی بھیت، روہیلہ سرداروں کے مستقر رہے۔ قصبہ آنولہ جو روہیل کھنڈ کے بہترین حصے اور مرکز میں واقع

---

[1] ڈبلیو فرینکلن کے مطابق نواب فیض اللہ خاں مرحوم کی جاگیر میں پانی کی فراہمی وافر تھی۔

ہے، ایسی نمایاں جگہ پر بسا ہوا ہے کہ وہاں سے نواحی علاقہ کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے۔ نواب ندی نام کا چشمہ شہر کے جنوب مغربی سمت سے آ کر بہتا ہے۔ آنولہ کی آبادی بھی خاصی تھی، اسمیں متعدد خوبصورت عمارتیں تھیں جن میں سے بیشتر کھنڈر بن گئیں۔ ڈبلیو فرینکلن "تاریخ شاہ عالم" میں رقمطراز ہیں:

> "پھر بھی ابھی تک بہت سی اشیاء باقی ہیں جن کو دیکھ کر اس جگہ کی عظمتِ رفتہ کا پتہ لگایا جا سکتا ہے ان ہی کے پیش نظر اس جاں ستاں کی تاراجی پر نوحہ کرنا پڑتا ہے جو سراسر تخریبی جذبے کا نتیجہ تھی"۔

آنولہ میں نمایاں مقام بلند ترین حصے میں اینٹوں سے بنا ہوا قلعہ ہے یہ قلعہ کٹھیر کی روہیلہ حکومت کے بانی نواب علی محمد خان نے تعمیر کرایا تھا۔ یہیں ان کا دربار لگتا تھا۔ قلعہ کے اندر ہی علی محمد خاں کا محل، ایک خانقاہ اور کئی دوسری عمارتیں تھیں، یہ علاقہ قدرتی طور پر حسین ہے[1]۔ آنولہ بریلی سے بجانب شمال مغرب سولہ[16] میل کے فاصلے پر واقع ہے، بسولی سے اس کا فاصلہ ۱۷ میل ہے، دہلی اور پیلی بھیت سے اسکا فاصلہ مساوی ہے۔ بسولی بھی روہیلہ حکومت کی دیرینہ عظمت و شان کے واضح نشانات رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مقام نواب علی محمد خاں کے خاندان کے بہت سے افراد کا مدفن ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔ اسی طرح شہر بریلی بھی ایک تاریخی باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

عہد سلطنت ہمایوں شاہ خلف بابر شاہ میں مسمّی جگت دیو ٹھاکر قوم بریل موضع جگت پور جو شہر کہنہ بریلی سے متصل ہے، سکونت رکھتا تھا اور اکثر جگت پور سے ملحقہ دیہات میں داخل ہو کر ان سے محاصل وصول کرتا تھا وہ اپنی قوم کا سردار بھی بن گیا۔ اس کے دونوں بیٹے، باسدیو ناگدیو اپنے باپ کی زندگی میں ہی کاروبار میں ہوشیار ہو گئے تھے۔ جگت دیو کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا باسدیو اپنے

باپ کا جانشین ہوا اور ہمایوں شاہ سے منحرف ہو کر خود مختار رئیس بن گیا ۱۵۳۷ء میں شہر کہنہ آباد کرکے بانس بریلی نام رکھا، کثرتِ استعمال سے بانس بریلی نام مشہور ہوا، باسدیو ایک مضبوط قلعہ بنا کر رہنے لگا

جہانگیر کے زمانے میں سلطان علی خاں حاکمِ بریلی مقرر ہوئے اسکے بعد علی قلی کو حکومت کٹھیر تفویض ہوئی ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۸ میں شاہجہاں کے دور میں عبداللہ خاں ساکن ملیح آباد ضلع لکھنؤ کٹھیر کے حاکم مقرر ہوئے اسکے بعد راجہ مانک چند قوم کھتری ساکن شاہجہاں آباد ناظم مقرر ہوئے، شاہ جہاں کی قید کے بعد عالمگیر نے مانک چند کے بیٹے مکرند رائے کے سپرد یہ علاقہ کیا ۲ ڈبلیو فرینکلن کے مطابق:-

بریلی جو جواہ اور سنکرہ کے متحدہ قدرتی چشمہ کے کنارے واقع ہے ایک بڑا خوبصورت مستحکم شہر ہے حافظ رحمت خاں کا پایہ تخت اور تجارت کا بڑا مرکز ہے لکھنؤ سے اس کا فاصلہ ۱۸۰ میل اور گنگا سے ۱۲۰ میل ہے آخری شہر پیلی بھیت ہے حافظ رحمت خاں کی نگاہ دوربین نے تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہ علاقہ منتخب کیا ایک کشادہ شہر پناہ یا بیٹھہ تعمیر کی جسکا فاصلہ چار میل تھا اس چاروں طرف اینٹوں کی دیوار اور احاطہ کے اندر ایک شاندار مسجد ہے۔ روہیلوں کے دور میں پیلی بھیت کو تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی اسکی مخصوص پیداوار میں سال سوا اور فر کی لکڑی شکر اور معمولی کپڑا ہیں، الموڑہ کے پہاڑوں سے سہاگہ، رال، ادویہ، موم اور شہد درآمد کئے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پچھلے سالوں میں تجارت کا بازو سکڑ گیا ہے۔ ایک منظم پالیسی کے فقدان، صنعت کی جانب بے توجہی اور حکمرانوں کے لگائے ہوئے پریشان کن محصولات نے اسکی تجارت کو تقریباً بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا ہے جو کسی زمانے میں نہایت منفعت بخش اور ترقی پذیر تھی۔

دہلی کے شاہی اندراجات کے مطابق کٹھیر کا مالیانہ پچاس لاکھ پونڈ تھا، ۱۷۹۷ء میں کٹھیر کی کل آمدنی ۳۰ لاکھ روپیہ یعنی ۳ لاکھ پونڈ تھی۔ فی زمانہ روہیل کھنڈ کسی علیحدہ ریاست کا نام نہیں ہے اور نہ اسکی کوئی جداگانہ حیثیت ہے، برٹش حکومت کے زیر سایہ ہندوستان میں جو سلطنت قائم تھی اس کا ایک صوبہ ممالک متحدہ آگرہ اودھ (یوپی اترپردیش) ہے جسکا ایک ڈویژن روہیل کھنڈ ہے بریلی اس ڈویژن کا صدر مقام ہے جہاں کمشنر رہتا ہے۔ کمشنر کی نگرانی میں بریلی، بدایوں، پیلی بھیت، مراد آباد، شاہجہاں پور بجنور، رام نگر، چھ اضلاع ہیں انکی محدود رقبہ پر اب روہیل کھنڈ کا اطلاق کیا جاتا ہے اس خطہ میں ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کے قدیم خاندان آباد تھے۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں اب پاکستان منتقل ہو چکے ہیں، جو رہ گئے ہیں وہ معاشی پریشانیوں کا شکار ہیں بھارتی حکومت نے صنعت و حرفت ملازمت و تجارت میں انہیں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لیکن مسلمان چونکہ وہاں صدیوں سے آباد ہیں لہٰذا اپنے آپ کو جمائے بیٹھے ہیں۔

روہیل کھنڈ میں اردو شاعری

جہاں تک روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا ذکر آتا ہے تو اس بارے میں کوئی بھرپور تحقیقی کام نہیں ہوا، البتہ محمد شاہی دور سے بہت پہلے دہلی اور نواحِ دہلی میں اردو شاعری کو جو فروغ ہوا، اِس سلسلے میں روہیل کھنڈ کا پہلا اردو شاعر عہد اکبری کے "ملا نوری" کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کا تعلق اعظم پور (یہ قصبہ متصل چاندپور ضلع بجنور) سے تھا۔ اس کے بارے میں قائم چاندپوری رقمطراز ہیں:

جامع فضائل معنوی و صوری، حقیقت آگاہ ملا نوری از قاضی زادہ ھای قصبۂ اعظم پور است۔ در فنِ بدیع و معما سر آمد روزگار خود بود، و شعر فارسی بسیار بدیہہ می گفت چنانچہ قصائد طویل الذیل از وی یاد گار است۔ گویند وقتی کہ ابوالفیض فیضی مثنوی "نل و دمن" تصنیف می کرد، چوں بدایں مصرع رسید:

ع موی شدہ ام ز ناتوانی

بجہت تمامی سعی افتادہ و مضمون مصرعِ ثانی بخاطرش نمی رسیدہ، ملای مذکور بسابقۂ معرفتی کہ داشت برای ملاقات وی رفتہ بود بحقیقت حال وا رسید، مصرع بر بدیہتہ" گفت:

ع مو بر تنِ من کند گرانی ، فیضی بر لطف

طبیعش آفرین کرد و از آن بانہ او را بسیار دوست می داشت۔ دو سہ غزل ریختہ بطور قدما از وی مسموع است؛

اما بالفعل سوای ایں یک بیت متفرق چیزی دیگر در خاطر نیست۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بتر سد
بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے۔ [1]

۱؎ قیام الدین قائم چاندپوری: "مخزنِ نکات"، مرتبہ ڈاکٹر اقتدار احسن، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶، ص ۷۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ملا نوری کے اس شعر کے مصرعِ ثانی کے بارے میں فرماتے ہیں:

" نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے کے اس محاورے نے اثر آفرینی کا ایسا جادو جگا دیا ہے کہ مصرع میں ضرب المثل بن جانے کی قوت پیدا ہو گئی ہے"۔[1]

روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کی ابتدا کے سلسلے کی ایک کڑی مثنوی "لولوئے از غیب"[2] ہے جسے روہیل کھنڈ کے مشہور و معروف قصبے آنولہ کے ایک ہندو شیولال نے تحریر کیا۔

یہ عہد تخت دہلی پر حضرت عالمگیرؒ کی حکمرانی کا دور ہے۔ اس مثنوی کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصنف پڑھے لکھے شخص نہیں تھے اور نہ فن عَروض کی باریکیوں سے واقف تھے۔ اردو نظم کے اس ارتقا کے دور میں اردو شاعری میں وہ پختگی نہیں آئی تھی جو ولی دکنی کے دہلی آنے کے بعد ظاہر ہوئی "لولوئے از غیب" کے دس بعد ولی دکنی دہلی میں وارد ہوئے[3]۔ ولی اس وقت دکنی زبان میں شاعری کرتے تھے۔

اس مثنوی کا شاعر کوئی پختہ گو اور مستند شاعر نہیں اور فنی لحاظ سے بھی اس مثنوی میں بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ البتہ یہ مثنوی روہیل کھنڈ کی قدیم شاعری پر روشنی ضرور ڈالتی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو" جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵، ص ۵۹۔

[2] "لولوئے از غیب" سے اسکی تاریخ ۱۱۰۲ھ نکلتی ہے ۱۶۹۰

[3] مقدمہ "لولوئے از غیب" از ثنا الحق صدیقی۔

یہ مثنوی حمدیہ اشعار سے شروع ہوتی ہے :

ع پس از توحید ذات کبریائی ۔ مدح خواں جس کی ہے ساری خدائی

ع بنایا ہے اسی نے رات اور دن ۔ کیا پیدا اسی نے ہے ہر اک فن[1]

ع اسی کی ذات سے علم و ہنر ہے ۔ وہی ہر ایک کے دل کی خبر ہے[2]

آگے چل کر شاعر نے مختلف دنوں سے شگون لینے کے گر بتائے ہیں مثلاً سہ شنبہ کے شگون کی خاصیت اس طرح بیان کی ہے ۔

ع شگن منگل اگر ہر دم سناوے ۔ کسی عورت کو بستی میں رولاوے[3]

ع شگن ہو اس کا گر چوتھے پہر میں ۔ تو کوئی دوست مر جاوے شہر میں

حکایت چہار شنبہ میں فرماتے ہیں :

نئی رت میں وطن ہے بدھ کا یار ۔ وہ شاہی میں کرے ہے پنج بیوپار

بڑا غم خوار ہے اور میٹھا ٹھگ ہے ۔ روپیہ سب سے بیلوں کا الگ ہے

اور اوس کے گھر میں ہے اک چشمہ جاہ ۔ مگر وہ خشک ہے بے آب واللہ

شگن سنیچر شنبہ میں فرماتے ہیں :۔

سنیچر بولی جب اپنا سناوے ۔ تو کچھ رخنہ وہاں در پیش آوے

ڈرے بستی کا راجہ اے مری جاں ۔ ویا[4] کوئی مسافر آمرے واں

پڑے ڈاکہ وہاں یا ہوئے ہو جائے ۔ ویا حاکم کسی کو باندھ لے جائے

خواص شگن اتوار میں تحریر فرماتے ہیں :۔

شگن اتوار کا بھی ہم نے تاڑا ۔ بلاشک ہو وہاں پر غل غپاڑہ

کسی سے جل پڑے تکرار ہو جائے ۔ جماعت اس جگہ بسیار ہو جائے

---

[1] ردیف کا قافیہ فن درست نہیں [2] یعنی واقف، خبردار [3] رلا دے

[4] یائے معنی میں استعمال کیا گیا ہے ۔

شروع چکر دوشنبہ میں لکھتے ہیں :-

ـــ چلی جاتی ہے بھاگی سمتِ تمار[1] ۔ نہیں کچھ تن بدن کا ہوش ہے یار

شروع چکر سہ شنبہ میں فرماتے ہیں :-

ـــ میاں منگل کے گھر تیرہ[2] بیریں[3] ہیں ۔ کہ جس کی دھوم تا عرشِ بریں ہے
گئی ہے ساتویں گھر بدھ کے اے یار ۔ وزن[3] کرتی ہے روپیوں کا اسی بار
بس اے شیولال قصہ مختصر کر ۔ یہاں تاریخ کی بھی کچھ فکر[4] کر
ہوئی ہاتف کی بھی الہام لاریب ۔ کہ اس کا نام کہہ "لولوئے از غیب[5]"

جیسا کہ ہم بیان کر چکے کہ یہ مثنوی ۱۱۰۲ھ / ۱۶۹۰ء میں تحریر کی گئی تھی ، اس وقت تک روہیل کھنڈ کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا ۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں جو ابتری اور بدامنی پھیلی، اس نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ اورنگ زیب کے جانشین ٹکڑیوں میں بٹ گئے امراء ، وزراء ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں کرنے لگے ۔ مغل دربار میں ایرانی اور تورانی دو مستقل گروہ تھے[6] البتہ ایرانی گروہ زیادہ با اثر تھا ۔

دوسری جانب انگریز کامیابی سے اپنے مقاصد حاصل کر رہے تھے ۔ مرہٹے ، جاٹ ، سکھ ، بندیلے ، راجپوت ، مغل حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اتنے مضبوط ہو گئے تھے کہ مرکزی حکومت کو بھی خاطر میں نہ لاتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بیرونی طاقتوں سے مدد کے طالب ہوئے ۔

---

[1] عربی اور ہندی کے ساتھ ترکیبِ اضافی ۔ [2] یعنی بیری [3] وزن کو متحرک باندھا ہے
[4] فکر کا ک متحرک باندھا ہے [5] تفصیل کے لیے دیکھیے رسالہ موسوم بہ "لولوئے از غیب"
مصنفہ شیولال ، مرتبہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری ، انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۸۳ء ۔
[6] تاریخ عبرت نگاشتہ ، صفحہ ۱۱ (دیباچہ)

اسی دور میں برصغیر کے شمالی سرحدی علاقے کے بعض صاحبِ عزم مسلم قبائل دوآبہ اور کشمیر کے اس زرخیز علاقے میں قسمت آزمائی کے لیے پہنچے، اس سیاسی ابتری سے انہوں نے فائدہ اٹھایا، پہلے اپنے گروہ قائم کیے، مقامی رئیسوں اور زمینداروں کی مدد کرتے رہے اور آہستہ آہستہ اپنے قدم جماتے رہے اور پھر اپنی سیاسی حیثیت منوانے میں کامیاب ہوئے۔ سرحدی علاقے سے آنے والے مشہور سرداروں میں نواب محمد خاں بنگش[1]، داؤد خاں[2]، نواب علی محمد خان[3]، حافظ الملک حافظ رحمت خان[4] اور نجیب الدولہ[5] خاص طور پر مشہور ہوئے۔ ان تمام سرداروں نے انفرادی و اجتماعی طور پر مغلیہ سلطنت کی مدد کی اور مرکزی حکومت کو سہارا دیتے رہے۔ جن علاقوں میں انہوں نے اپنی ریاستیں قائم کیں، وہاں امن و امان قائم رکھا اور رفاہی و فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، پل، کنویں، سرائیں، مدرسے اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ان کے علاقوں میں خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ ان سرداروں نے علمی و ادبی، دینی تعلیمات کے لیے بڑے بڑے مدرسے و مراکز قائم کیے۔ یہ اپنے دشمنوں سے برسرِ پیکار بھی رہتے تھے اور شعر و سخن کی محافل بھی منعقد ہوتی رہتی تھیں۔

کشمیر کے اس علاقے میں جب افغانوں نے نئی ریاست کی بنیاد ڈالی تو یہ علاقہ روہیل کھنڈ کہلایا۔ ابتدا میں اس کا صدر مقام آنولہ تھا جس کی بنیاد داؤد خاں نے ڈالی، نواب علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں بہادر نصر جنگ

---

[1] ف ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء
[2] ف ۱۱۳۹ھ
[3] ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء
[4] ف ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء
[5] ف ۱۱۸۳ھ / ۱۷۷۰ء

نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں روہیل کھنڈ کو استحکام بخشا اور ملکی فتوحات کے ساتھ ادبی ماحول پیدا کیا۔[1]

بعض مورخین نے روہیلوں کو خودسر، غاصب اور جاہل کہا ہے لیکن تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ نہ تو یہ جاہل تھے اور نہ خودسر بلکہ انھوں نے رعایا میں فنی و ادبی شعور پیدا کیا۔ ان میں بعض سردار خود شاعر بھی تھے اور شعراء کی قدردانی بھی کرتے تھے۔ انھوں نے اس دور کے شعراء کو خوب نوازا۔

ان کے مختصر دور کی یادگار فارسی اردو کا وہ سرمایۂ شاعری ہے جو آج بھی اس دور کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ۱۷۵۶ء سے ۱۷۷۴ء تک کا یہ عہد تقریباً اٹھارہ، انیس سال پر محیط ہے لیکن اس مختصر وقت کے علمی، ادبی اور دینی کام اور خدمات قابلِ ستائش ہیں۔

اگر ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ اور ہیسٹنگز نے روہیلوں کا استیصال نہ کیا ہوتا تو آج اردو شاعری کی تاریخ روہیلوں کے ادبی کارناموں سے خالی نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں صرف روہیل کھنڈ کے علاقے میں ہی نہیں بلکہ اس قوم کے تقریباً تمام نووارد افراد نے ملکی اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں شعر و سخن کو ترویج دی، اور مشاعروں کا اہتمام کیا اور ان میں خود شریک ہو کر ادبی محافل کی ہمت افزائی کی۔

نواب محبت خاں نے روہیل کھنڈ کے اسی علاقے میں ہوش سنبھالا تھا اور شعر و شاعری کی ابتدا بھی اسی ماحول میں کی تھی۔ روہیل کھنڈ علمی و ادبی ماحول کس قدر سازگار تھا اس کا اندازہ بھی آئندہ صفحات سے ہو جائے گا۔

ہم یہاں روہیل کھنڈ کی ان مشہور ادب نواز شخصیات اور شعراء کا مختصر احوال بیان کریں گے۔ ان میں بعض شخصیات . . . .

---

[1] ڈاکٹر لطیف حسین ادیب بریلوی: "روہیلوں کے دور میں اردو شاعری کا فروغ"، معارف، اعظم گڑھ، نمبر ۲ جلد نمبر ۹۶۔

اردو ادب میں معروف ہیں اور بعض غیر معروف کیوں کہ ادبی تاریخ نے بھی جانبداری سے کام لیا۔ روہیل کھنڈ کے شعراء اور علمی و ادبی شخصیات میں نواب محبت خاں کے والد، بھائی اور دیگر عزیز و اقربا بھی شامل تھے لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت میں ان سب کا قابل قدر حصہ رہا۔

روہیل کھنڈ کے ان شعراء اور ادیبوں کی مختصر تاریخ پیش کی جاتی ہے تا کہ نواب محبت خاں محبت کا ابتدائی ادبی ماحول سامنے آجائے، اُن کی اردو شاعری پر بحث کے دوران اس پس منظر کو بھی پیش نظر رکھا جا سکے۔

نواب علی محمد خان

۱۷۵۶ء میں داؤد خان نے رتن گڑھ کے زمیندار کھیم کرن پر حملہ کیا، وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا، داود خاں کو اس فتح یابی کے بعد باکولی[۱] (کالنو تحصیل بہیڑی) سے ایک بچہ ہاتھ آیا۔ جس کو داؤد خاں نے اپنا بیٹا بنالیا، اس کا نام علی محمد خاں رکھا۔ اسکی تربیت نہایت معقول انداز سے کی۔ داؤد خاں نے ان کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ انتظام کیا تھا۔
نواب علی محمد خاں کی قومیت کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ جاٹ تھے[۲]۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ یہ ایک صاحبِ تدبر سیاست دان اور ایک ذی علم شخص تھے، جن کی عقل و دانش کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

نواب علی محمد خاں کا شمار روہیل کھنڈ کے بانیوں میں ہوتا ہے، وہ چودہ برس کی عمر میں روہیل کھنڈ کے حکمران ہوئے انہوں نے اپنی قوت سے روہیل کھنڈ کے وسیع علاقے پر حکومت کی اور اسے خوشحال بنایا۔ آپ کو علم و ادب سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ خود بھی شاعر تھے۔

فرخ آباد میں بنگش نوابین اردو شاعری میں بھرپور حصہ لے رہے تھے۔
نواب احمد خاں بنگش غالب جنگ کے دیوان کا نام نواب مہربان خان رند تھا یہ ایک اچھے شعراور شعراء کے مربی تھے۔ مرزا سودا اور میر سوز ان کے خوانِ کرم کے زلہ بار تھے[۳]۔ سودا کی نہ صرف مہربان خاں رند قدردانی کرتے تھے بلکہ خود نواب احمد خان بنگش بھی مہربان تھے۔ امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے بیٹے نواب ضابطہ خاں بھی شعراء کے مربی اور

---

[۱] بانکولی۔

[۲] دیپے سے ایسا دیکھو پیر بھو کے ٹھاٹ - آنولہ کا راجہ بھیو باکولی کو جاٹ
پسندیدہ ز سرتا پا صفاتش - یگانہ در گروہِ جاٹ ذاتش

[۳] ڈاکٹر لطیف حسین ادیب: "اردو شاعری کا فروغ"، معارف نمبر ۲ جلد ۹۶۔

اہلِ علم کے قدر دان تھے، میدانِ کارزار میں اپنا بیشتر وقت گذارنے کے باوجود بھرپور انداز سے شعراء کی قدر دانی فرماتے تھے۔ فدوی لاہوری بھی کچھ دن ان کی رفاقت میں رہے اور نواب ہی کی فرمائش پر "یوسف زلیخا" داستان نظم کی جو نامتمام رہی۔

ظہور الدین حاتم کو نواب ضابطہ خاں سے تقرب حاصل رہا تھا، انہوں نے ایک شعر میں نواب ضابطہ خاں کی تعریف اس طرح کی ہے۔

؎ حاتم اس دور کے امیروں میں ۔ حاتم اس وقت ضابطہ خاں ہے[1]

کٹھیر میں نواب علی محمد خاں نے کچھ دن شعراء کو مدعو کیا تھا لیکن جلد ہی اقتدار جانے کے سبب یہ سلسلہ قائم نہ رکھ سکے۔ نواب محمد یار خاں نے بعد میں ٹانڈہ میں شعراء کی محفل جمائی۔ روہیل کھنڈ میں جب نوابی ٹھاٹ جمے اور یہ پٹھانوں کا مرکز بنا تو انہوں نے شمالی ہند کی سیاست میں بھرپور کردار ادا کیا۔ جب دہلی میں نادر گردی سے بہت سے شعراء ترکِ وطن پر مجبور ہوئے، فکرِ معاش اور سخن پرور، قدر داں رئیسوں کی تلاش میں نکلے تو ان میں سے دو چار بریلی اور آنولہ بھی آئے۔

نواب علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں کے صاحب زادے بریلی اور آنولہ میں شعر و سخن کی محافل جمائے بیٹھے تھے۔ یہ خود بھی شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور شعراء کی قدر دانی بھی کرتے تھے۔ ان کے دولت کدوں پر مشاعرے منعقد ہوتے جن میں یہ خود بھی شریک ہوتے تھے اور شرکاء کی ہمت افزائی بھی فرماتے تھے، اس لیے دیگر علاقوں سے بریلی اور آنولہ منتقل ہونے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ ترکِ وطن کر کے آنے والے شعراء صرف دہلی سے ہی نہیں آئے تھے بلکہ موجودہ روہیل کھنڈ کے مختلف مقامات و اضلاع سے اپنی حوصلہ افزائی کی امید لے کر پہنچے تھے۔ روہیل کھنڈ کی تباہی اور

---

[1] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی: "دلی کا دبستانِ شاعری"، طبع دوم، اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۶۶ء، ص - ۷۱

بربادی کے بعد نواب آصف الدولہ کے عہد میں دبستان لکھنؤ کی بنیاد رکھی گئی اور اردو شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔

بریلی اور آنولہ کے شعراء کی فہرست کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قدیم روہیل کھنڈ کی اردو شاعری کی تاریخ سخن پرور امیروں کی تاریخ ہے۔ چند شعراء امراء سے وابستہ ہوئے بغیر بھی اپنے ذوق شاعری کو جلا دیتے رہے، لیکن ان شعراء کو نظرانداز کیا جاتا رہا۔

نواب علی محمد خاں عربی و فارسی پر عبور رکھتے تھے، کیونکہ اُس وقت کا ذریعہ تعلیم فارسی زبان تھی۔ ہمارے پیش نظر خاص طور پر وہ گفتگو ہے جو انھوں نے حافظ رحمت خاں کو روہیل کھنڈ کا سردار بناتے ہوئے کہی تھی[1]۔ علی محمد خاں نے فرمایا:-

"سعد اللہ کہ ہنوز فرق از نیک و بد نمیکند چہ رسد کہ بزرگاں گفتہ اند

ابیات - سہ بخوردان مغز ہای کار درشت - کہ سنداں نہ شاید شکستن بمشت

رعیت نوازی و سر لشکری - نہ کاریست بازیچہ سرسری

حکومت امریست بس مشکل و بکسی مناسب دارد کہ جامع جمیع صفات حسنہ باشد و

بجمع کل کمالات کاملہ و اینکہ گفتم در وجود با وجود و مشہور است و علاوہ آں حقوق

خداوندی ایشاں بر ذمہ ما"[2]

اسکے علاوہ پوری تقریر جو اس موقع پر نواب موصوف نے فرمائی، فصاحت و بلاغت علم بیان کی مظہر ہے[3]۔

---

[1] دوران گفتگو آپ نے فرمایا جیسا کہ ملک العلام کے اس کلام سے ثابت ہوتا ہے "لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا" (اگر خدائے واحد کے سوا اور بھی خدا ہوتے تو ضرور فساد پیدا ہوتا)

[2] نواب مستجاب خاں: "گلستان رحمت"، (قلمی) فارسی، کراچی، قومی عجائب گھر، ص ۳۷۔

[3] تفصیل کے لیے دیکھیے (گلستان رحمت اور حیات حافظ رحمت خاں)

حافظ الملک حافظ رحمت خان

نواب محبت خاں کے پدر نواب حافظ رحمت خان ۱۷۰۸ء تا ۱۷۷۴ء پشتو فارسی عربی اور اردو زبانیں جانتے تھے۔ نواب علی محمد خاں کے انتقال کے بعد یعنی ۱۷۴۹ء میں ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ میدانِ سیاست و کارزار میں گزرا۔ انگریزوں نے نواب شجاع الدولہ کے ساتھ ملکر سیاست و تدبر کے اس روشن باب کا جب خاتمہ کیا تو اسکے بعد ہیسٹنگز پر ہندوستانیوں پر مظالم کے بارے میں ایک مقدمہ چلا جس میں اس کے وکیل مسٹر لا نے ہیسٹنگز کی صفائی میں حافظ الملک کو جاہلِ مطلق ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی اور انکے شاعر ہونے سے بھی انکار کیا[1]۔ لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حافظ رحمت خان پشتو، فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے[2]۔

سر جان اسٹریچی نے اپنی کتاب "ہیسٹنگز اینڈ دی روہیلہ وار" میں "حافظ رحمت خاں بحیثیت ایک شاعر" ایک علیحدہ باب تحریر کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ :۔

> ایم ڈارسس ٹیڑ اپنے رام پور جانے کی کیفیت اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو اس کو ایک روہیلے نے حافظ رحمت خان اور دوسرے روہیلے سرداروں کا ایک قلمی نسخہ مجموعہ کلام دیا۔ یہ مجموعہ جو اس کو رام پور میں دیا گیا اور جو اب برٹش عجائب خانہ کے مشرقی نوشتہ جات میں محفوظ ہے اسمیں بہت سے دوسرے افغان سرداروں[3] کی غزلیات کے علاوہ پشتو زبان کی ایک نظم حافظ رحمت خاں کی لکھی ہے

---

[1] سید الطاف علی بریلوی : حیات حافظ رحمت خان، ص ۔ ۳۰۰ [2] حیات حافظ رحمت خان ص ۱۰۰

[3] اس نظم کا نفسِ مضمون پٹھانوں اور مغلوں کی موروثی عداوت ہے ۔

اس کے علاوہ ایم ٹرارسس ٹیٹر کے حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے :۔

گو حافظ رحمت خاں کا دیوان میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا لیکن تعلیم یافتہ انسانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ ایک دیوان چھوڑ مرے تھے، مجھے امید ہے کہ وہ اب بھی ہندوستان میں ہوگا لیکن خود مجھے نہ مل سکا۔ رامپور اور بریلی میں تو اب اس کے وجود تک کا لوگوں کو علم نہیں ہے۔[1] حافظ رحمت خاں ایک صاحبِ دیوان شاعر تھے کیونکہ ان کا یہ قول تھا "ایک سردار یا سپاہی کی شہرت اس وقت تک نامکمل رہتی ہے جب تک وہ صاحبِ دیوان نہ ہو"[2]

اس دور کے تقریباً تمام اہلِ سیف اہلِ قلم بھی ہوا کرتے تھے، تاریخ اس بات کا بین ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ احمد شاہ درانی جیسے بہادر بادشاہ کا زورِ قلم اس حد تک پہنچا کہ وہ خود صاحب دیوان شاعر کہلایا یہاں تک کہ اس کے اکثر جانشین بھی شاعر تھے۔ اور انہوں نے شعر و سخن کو نہ صرف خود اختیار کیا بلکہ دوسروں کو اس کی ترغیب بھی دی اور شعراء کی قدر دانی بھی کرتے رہے۔ شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ اور وزیر اعظم قمر الدین خاں اور شاہ عالم بھی بساطِ شاعری پر دہلی میں شعر و سخن کا جادو جگاتے رہے۔

حافظ رحمت خاں کے پاس ایک قیمتی ذخیرہ کتب موجود تھا، جب حافظ رحمت خاں شہید کر دیئے گئے اور ان کے لواحقین کو قید کر دیا گیا تو شجاع الدولہ کتب کے اس بیش بہا خزانے کو جس کی وہ اہمیت سمجھتے تھے اٹھا لے گئے جو شاہان اودھ کے شاہی کتب خانے کی زینت بنا۔ ڈاکٹر اسپرینگر نے ان کتابوں کی فہرست مرتب کی تھی جس کی ایک جلد ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی تھی[1]

---

[1] سید الطاف علی بریلوی: "حیات حافظ رحمت خاں"۔ ص - ۳۰۳

[2] ایضاً ؍؍ ؍؍ ص - ۳۰۲

ڈاکٹر اسپرینگر لکھتے ہیں:

مجھے اسلحہ خانے میں چالیس صندوق خراب و خستہ حالت میں رکھے ہوئے ملے ان میں حافظ رحمت خاں کا تمام علمی خزانہ موجود تھا کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بعض پشتو کی تصانیف تھیں جو بڑی کاوش کے ساتھ بکمال حسن و خوبی بہادر اور صاحبِ علم و فضل روہیلہ سردار کے لیے لکھی گئی تھیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لکھنؤ کا کتب خانہ لٹ لٹا کر برباد ہو گیا۔ لیکن پھر بھی کافی تعداد میں اس کی کتابیں وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہی ہیں۔

حافظ رحمت خاں کی تصانیف میں سے ایک تصنیف "خلاصۃ الانساب" ہے جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں بھی محفوظ ہے[1]۔ اس کتاب میں آپ نے اپنے بزرگوں کے نام و نسب وغیرہ کے تفصیلی حالات تحقیق کے بعد تحریر کیے ہیں۔ حافظ رحمت خاں کے دور کی ایک اور کتاب "تواریخِ رحمت خانی ہے" جس میں یوسف زئیوں کے کابل پر قبضے اور ہندوستان آنے کے تاریخی واقعات مفصّل اور شرح طور پر درج ہیں۔ ابتدا میں یہ کتاب سنہ ۱۶۶۲ء میں پشتو میں تحریر کی گئی تھی۔ اس کا آسان اور بامحاورہ فارسی میں ترجمہ حافظ رحمت خان نے سنہ ۱۷۷۰ء میں کروایا تھا[2]۔

جہاں تک حافظ رحمت خاں کی شاعری کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ فارسی اور پشتو زبان کے شاعر تھے۔ ہمیں امید ہے کہ جلد یا بہ دیر انکے کلام کا نمونہ ضرور دستیاب ہوگا۔

---

[1] اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ حافظ صاحب کی وفات کے چھ سال بعد کا کتابت شدہ ہے۔ سنہ ۱۹۷۰ میں پشتو اکیڈمی کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔

[2] اس کتاب کو خواجو ملی زئی نے شاہجہان پور کے نواب بہادر خاں کی تحریک پر جمع کیا تھا۔ حافظ الملک کے عہد میں پیر معظم شاہ نے اس تاریخی مواد کو تالیف کی شکل دی اور حافظ رحمت خاں کی خدمت میں پیش کر کے "تواریخ حافظ رحمت خانی" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ پشتو زبان میں خطی صورت میں انڈیا آفس (لندن) میں محفوظ تھی۔ پشتو اکیڈمی پشاور نے اسکی مائکرو فلم حاصل کی اور خان روشن خان (نواکلی) نے اصل کتاب کو اکیڈمی کی طرف سے سنہ ۱۹۷۱ء میں شائع کیا اسکے بعد اردو ترجمہ مع حواشی سنہ ۱۹۷۶ء میں اور اشاعت سوم ۱۹۷۷ میں ہوئی۔

نواب عنایت خاں[1] پسر حافظ رحمت خاں

۱۷۷۱ تا ۱۷۷۳ء نواب عنایت خاں بہادر نواب حافظ رحمت خاں کے بڑے صاحبزادے، عقل و تدبر اور سیاسی بصیرت میں اپنے تمام بھائیوں سے سبقت لے گئے تھے۔ ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے جنگِ پانی پت میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ اس فتح کو شاہ درانی نے آپ کے نام سے معنون کیا تھا۔ نواب عنایت خاں نے جھنکو[2] کا سر شاہ درانی کو پیش کیا تو درانی نے عنایت خاں کی پیٹھ ٹھونک کر فرمایا۔

"ایں فتح بنام تو نہادم مبارک باد۔ آفریں بر تو و رحمتِ خدا بر پدر تو"

علاوہ ازیں بھاؤ[3] کا سر بھی عنایت خاں کے ہاتھوں قلم ہوا، آپ سور مشہور تھے، آپ کے ہاتھ اس قدر لمبے تھے کہ گھٹنوں سے بھی نیچے آتے تھے، جن کے باعث تلوار چلانے میں اپنے زمانہ میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم علمائے عصر سے حاصل کی۔ حاجی محمد سعید خاں[4] اپنے استاد، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے وصال کے بعد دہلی سے روہیل کھنڈ چلے آئے انہیں حافظ رحمت خاں نے عنایت خاں کا استاد مقرر کیا۔ حافظ رحمت خاں کی علم دوستی[صفت] آپ کے صاحبزادوں کے حصے میں بھی آئی تھی میر عوض علی مدعا[5] شاہجہاں آبادی نواب عنایت خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ حافظ رحمت خاں نے بریلی کا انتظام نواب عنایت خاں کے سپرد کر دیا تھا لہذا آپ ۱۷۶۵ء سے بریلی میں رہنے لگے تھے۔

---

[1] نواب عنایت خاں نواب محبت خاں کے بڑے بھائی تھے۔ [2] مرہٹہ سردار۔

[3] مرہٹہ سردار بھاؤ کو جنگِ پانی پت میں عنایت خاں نے نہایت بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے قتل کیا۔
از شمشیر عنایت خاں دراں جنگ ۔ اجل گفتا سر بھاؤ تراشہ

[4] حاجی محمد سعید خاں افغانستان سے دہلی تشریف لائے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے تفسیر و حدیث میں فارغ التحصیل ہوئے اور شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد روہیل کھنڈ چلے آئے اور حافظ رحمت خاں نے آپ کو عنایت خاں کا استاد مقرر کیا۔

[5] یہ وہی عوض علی مدعا شاہجہاں آبادی ہیں جنہوں نے نواب محبت خاں کی شادی پر ایک مشہور قصیدہ تحریر کیا تھا۔ جس کا مطلع ہے سہ پہر ہے بادل شد نگاں در پئے آزار فلک ۔ متصل جبر کے ہے ناسور بہ چھاتی کے فلک۔

"تذکرہ شعرائے اردو" (مؤلفہ میر حسن) کے مطابق: (میر عوض علی مدعا شاہجہاں آبادی عنایت خاں کی سرکار میں ملازم تھے)

فرماتے ہیں "بر عنایات یزدانی از راہ قدر شناسی و نکتہ دانی خاں عالی شان خلف
حافظ رحمت خاں عنایت خاں ظفر اللہ سہ روپیہ می دارد، چندے
در بریلی اقامت داشت"[1]۔

قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعرا میں نواب عنایت خاں کی حوصلہ مندی کے ساتھ
انکی مناسب فکرِ سخن کی تعریف اس طرح کی ہے :۔

نواب عنایت اللہ خاں خلف رشید حافظ رحمت جوانے بود عالی حوصلہ
خوش سلیقہ فاتح زمانہ در جرأت و شجاعت یگانہ مجمع قابلیت واستعداد،
در عنفوان جوانی ازیں جہان فانی ہزاروں داغ و حسرتِ جاودانی
ہم راہِ خود بردہ، آں حافظ حقیقی بہ فضل یزدانی و عنایت ربانی خود
غریقِ رحمت کند طبعش صائب و فکرش مناسب بود۔

نمونہ کلام یہ ہے

کل جو دیے دیوانے دل کی قید کی تدبیر تھی۔ زلف کا کھلنا نہ تھا گویا وہی زنجیر تھی

نواب علی محمد خاں کے منجھلے بیٹے صاحبزادہ اللہ یار خاں اثیر کو شعر و سخن سے خاص
دلچسپی تھی لہذا انہوں نے رامپور میں شعر و سخن کی فضا خوشگوار بنائی، جب کہ حافظ رحمت خاں
کے بیٹے عنایت خاں نے بریلی میں شعر و سخن کے ذوق کو قائم رکھتے ہوئے میر عوض علی مدعا کی
سرپرستی کی جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔

مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی، دہلی

---

[1] میر حسن دہلوی: "تذکرہ شعرائے اردو" (فارسی) طبع اول ترقی اردو، ۱۹۴۰ء، ص ۱۴۲
[2] جنگ پانی پت میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے، حافظ رحمت خاں نے شاہ درانی کا ساتھ دیا تھا لیکن نواب عنایت خاں کو بریلی کا حاکم مقرر کر کے آئے تھے اور نواب عنایت خاں جنگ پانی پت میں جوش و حمیت کی خاطر اپنے والد کی اجازت کے بغیر اس عظیم جنگ میں شامل ہو گئے تھے اور انکی بہادری پر شاہ درانی نے ان کی تعریف کی تھی۔

نواب عنایت خاں، حاجی محمد سعید خاں جیسے مشہور زمانہ عالم کے شاگرد تھے جن سے انہوں نے عربی و فارسی کی تعلیم پوری طرح حاصل کی۔ عنایت خاں کی مادری زبان پشتو تھی۔ بریلی میں نواب موصوف نے دوسرے شعراء و ادباء کی قدردانی کی۔ نواب عنایت خاں کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا، نواب محبت خاں کی شادی کے موقع پر انہوں نے اپنے خاص احکامات سے رقص و موسیقی کی محافل کا بندوبست کیا تھا۔

نواب عنایت خاں کا انتقال ۱۷۷۳ء / ۱۱۸۶ھ میں ۳۲ برس کی عمر میں ہوا۔

خواجہ حسنؔ

خواجہ حسن خواجہ ابراہیم کے بیٹے تھے جو خواجہ غیاث الدین مودودی کی اولاد میں سے تھے۔[1] ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کے مطابق خواجہ حسن کا سلسلۂ نسب خواجہ کھاری چشتی مودودی سے ملتا ہے جو دہلی کے معروف درویش تھے۔ خواجہ حسن کا مکان محلہ پہاڑ گنج دلی میں تھا لیکن وہ ترک سکونت کر کے بریلی آگئے تھے۔[2] خاندانِ روہیلہ میں ان کی بہت قدر و منزلت تھی نواب محبت خاں سے ان کے بہت قریبی تعلقات تھے اور یہ تعلقات نواب سعادت علی خاں کے دور میں بھی مستحکم رہے۔ خواجہ حسن اپنے خاندانی اثر کی وجہ سے تصوف سے پوری طرح واقف تھے، علم موسیقی سے خاص لگاؤ تھا، عاشق مزاج، دردمند اور خوبصورت انسان تھے، علم ریاضی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، موسیقی اور درویشی میں بہت مشہور تھے۔ علمِ ہیئت، علمِ نجوم میں دسترس رکھتے تھے اور شاعری بھی خوب کرتے تھے۔

---

[1] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ: "گلشن بے خار"، ترجمہ محمد احسان الحق فاروقی، طبع اول، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۷۱۔

[2] ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اردو کی منظوم داستانیں" میں حکیم قدرت اللہ کے حوالے سے صفحہ ۳۲۷ پر تحریر فرماتے ہیں:-

خواجہ حسن دہلوی ولد خواجہ ابراہیم بن غیاث الدین ابن محمد شریف ابن ابراہیم جو کہ خواجہ کھاری مودودی اور بنام حسن مشہور ہے، سید حسن کے آباء و اجداد شاہجہان آباد میں پہاڑ گنج میں رہتے تھے بریلی لکھنؤ چلے آئے سرکار نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے افسروں میں بھرتی ہوئے۔ بیشتر بریلی میں رہتا تھا، علم موسیقی اور علم ریاضی میں اس کی شہرت تھی، علم ہیئت میں محنت کرتا تھا، خصوصاً تصوف بہت جانتا تھا۔ صاحبِ دیوان ہے، جعفر علی حسرت سے ابتدا میں اصلاح لی تھی۔ قلندر بخش جرأت سے بھی ملاقات رکھتا تھا۔ خوش طبع اور تماشہ بین انسان تھا۔ خبر نثر وغیرہ ملفوظات میں مصروف رہتا تھا۔ ابتدا میں جعفر علی حسرت کا شاگرد اور انتہا میں میاں جرأت کا شاگرد ہوا۔ دیوان بھی اسکی استعداد سے ترتیب دیا۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب تذکرۂ ہندی کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

"صوفی مشرب اکثر مسائل صوفیہ را کہ مراد از وحدت وجود باشد بادلائل و براہین چنانکہ شیوۂ صوفیان با فضل و کمال است از روئے حدیث باثبات رسانید"

خواجہ حسن کو ایک بازاری عورت سے عشق تھا، اس کا نام بخشی تھا، غزل کے مقطع میں اس کا نام بالالتزام لاتے تھے۔ خواجہ حسن ایک باعزت اور خود دار انسان تھے۔ نواب سعادت علیخاں کی ایک حرکت پر اسے دختر آصف الدولہ کہہ کر پکارا تھا اور کمر سے چھرا نکال کر کھڑے ہوگئے تھے کہ سعادت علی خاں کو خاموشی اختیار کرنا پڑی اور اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔

کلیات جرأت میں "حسن و عشق" کے نام سے ایک مثنوی موجود ہے جو خواجہ حسن اور بخشی طوائف کے عشق کی داستان ہے جرأت نے اس مثنوی میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ اس منظوم قصے کو فرضی قرار نہ دیا جائے، اس لیے کہ انھوں نے جس قصے کو بیان کیا ہے وہ شنیدہ نہیں، دیدہ ہے، افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ خواجہ حسن کے جو اوصاف بتائے گئے ہیں وہ سب مثنوی حسن و عشق کے ہیرو میں موجود ہیں لہذا اس مثنوی کو خواجہ حسن کے عشق کی داستان خیال کرنے میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں[1]

جرأت جس وقت فیض آباد میں مقیم تھے وہاں ایک صوفی منش بزرگ یعنی خواجہ حسن سے ان کی ملاقات ہوئی جو علم ظاہری اور باطنی کے ماہر تھے۔ گرد و نواح میں ان کی کشف و کرامات کی شہرت تھی، ان سے ملاقات کا حال جرأت اس طرح بیان فرماتے ہیں[2]

---

[1] جرأت خود بھی خواجہ حسن کے ارادت مند تھے، فیض آباد سے لے کر تا وہ اور پھر لکھنؤ تک وہ خواجہ حسن کے ساتھ رہے ہیں اور انھوں نے خواجہ حسن اور بخشی طوائف کے معاملات محبت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے [illegible]: ڈاکٹر فرمان فتح پوری: اردو کی منظوم داستانیں، اشاعت اول، کراچی انجمن ترقی اردو ۱۹۷۱ء ص ۳۲۷۔

[2] ڈاکٹر فرمان فتح پوری: اردو کی منظوم داستانیں، اشاعت اول، انجمن ترقی اردو کراچی۔ ۱۹۷۱ء ص ۳۲۹۔

کہ ناگاہ اک بزرگ آیا جو اس جا ۔ ہوا شدت سے میں مشتاق اس کا

میسر آ گئی بارے مجھ کو صحبت ۔ بجا ہے گر کہوں پیرِ طریقت

کروں وا پردہ تا کہ وصفِ ارقام ۔ ہے اس کا حضرت خواجہ حسن نام

نواب محبت خان نے جب فیض آباد سے اٹاوے کا سفر کیا تو جرأت و خواجہ حسن انکے ہمرکاب تھے ۔ فیض آباد کی رنگین صحبتیں وہاں میسر نہ تھیں لہذا اٹاوہ نہیں پسند نہیں آیا ۔ خواجہ حسن رقص و سرود کی محفلوں کے دلدادہ تھے لکھنؤ میں "متن" نامی ایک طوائف کے ڈیرے پر جانے لگے ، وہاں کی ایک طوائف بخشی سے آنکھیں چار ہوئیں ، یہ دونوں ایک دوسرے پر جان و دل سے فدا ہوئے اور جرأت کو اپنی ایک مثنوی کا پلاٹ ہاتھ آیا[1] ۔

مختصر یہ کہ خواجہ حسن نہایت خلیق خوش اختلاط اور علم مجلسی کے ماہر شخص تھے اپنی اکثر غزلیات میں اپنی محبوبہ کا ذکر کرتے تھے :- میں

جان بخشی کو نہ آیا وہ دمِ نزعِ حسن ۔ اس نے اس وقت بھی مجھ سے چرائیں آنکھیں

ایک جگہ فرماتے ہیں :-

بچے جی کیونکر اس دردِ سخن سے ۔ ملے جب تک نہ یہ بخشی حسن سے

مختلف تذکروں میں خواجہ حسن کا جو کلام ملتا ہے اس میں سے منتخب کلام ملاحظہ فرمائیے :-

یہی شورش عشق ہے تو الہی ۔ اس آغاز کا کیوں کر انجام ہو گا

موئے ہم مگر بیقراری وہی ہے ۔ خدا جانے کب دل کو آرام ہو گا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے اردو کی منظوم داستانیں :- از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۔
(کلیات جرأت قلمی مرقوم ۱۲۹۲ھ نیشنل میوزیم کراچی) اعظم نمبر ۸۵
ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے معارف نمبر ۲ جلد ۹۶ صفحہ ۱۲۱ پر خواجہ حسن کے اشعار کے بعد لکھا ہے راقم جس محیط و منظوم نے مثنوی حسن بخشی میں ان کے عشق کا قصہ نظم کیا ہے ۔ اس مقالے کا عنوان "روہیلوں کے دور حکومت میں اردو شاعری کا فروغ" ہے ۔

اگر نزع ہے جان بخشی حسن کو ۔ تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا

یہ تو نہ مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی ۔ یاں دل جلایا اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی
کچھ اور تو ہوا نہیں ہے ساری عمر میں ۔ تقصیر یہ ہوئی کہ میں تقصیر کچھ نہ کی
مرتا ہوں جاں کنی میں حسن میف تم نے رات ۔ اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

امڈ کے آنکھوں سے یکبار یہ چلے آنسو ۔ ہنسی ہنسی میں جو ذکر وداعِ یار ہوا
جھٹک کے ہاتھ سے دامن خفا جو یار ہوا ۔ تو ٹکڑے میں پیرہن صبر تار تار ہوا
یہ دوستی نے حسن اس کی بخشی کچھ تاثیر ۔ کہ دشمن آج پھر اک اپنا دوست دار ہوا

وقتِ نظارہ نہ رو گئے تھے اے چشم تجھے ۔ شدتِ گریہ سے لے خاک نہ سوجھا دیکھا
وہ تو آیا نہ تماشے کو مرے نزع کے بیچ ۔ ہم نے اس وقت بھی اس کا ہی نظارہ دیکھا
آئینہ دیکھ کے حیران جو ہوا اپنا آپ ۔ ہم تو تھے محو ترے تو نے بھلا کیا دیکھا

وقتِ وداعِ یار دلِ بے قرار نے ۔ یہ آہ کی کہ عرش معلیٰ ہلا دیا
پہنچا تھا ہاتھ چوری سے رات اس کے پاؤں تک ۔ پر میرے بختِ خفتہ نے اس کو جگا دیا
بخشی حسن یہ لذتِ غم اس کی یاد نے ۔ راحت کا جو مزہ تھا وہ ہم نے بھلا دیا

آہ کیونکر بے وفائی کا نہ کیجے شمار ۔ اور تو سب اک طرف منہ بھی اٹھانے سے رہے
اس نے کس کس طرح ٹالا ہمکو اپنے در سے پر ۔ دیکھو تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

کون سا نقصان اس میں آپ کا ہو جائے گا - اس طرف بھی مڑ کے دیکھوگے تو کیا ہو جائے گا
جان بخشی کو حسن کی نزع میں آکر شتاب - ورنہ یہ ارمان اس کو اے میاں رہ جائے گا

ہمیں آرام زیرِ خاک بھی کیا خاک ہووے گا - لیے پہلو میں یہ اک دلِ پُر شور جاتے ہیں

دل دلاسوں سے کرے ہے بیقراری بیشتر - خانۂ ماتم میں ہو پڑے سے زاری بیشتر

اشک اس کو نہیں سمجھتے ہم - جس میں لختِ جگر نہیں آتا

خواجہ حسن کے یہ منتخب اشعار انکی شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ایک آئینے کے مترادف ہیں - ان کے اشعار میں حسن و عشق کی لگاوٹ موجود ہے اور انکی عملی زندگی کا عکس بھی نظر آتا ہے - بخشی طوائف سے ان کا معاشقہ کوئی پوشیدہ بات نہیں بلکہ انہوں نے اپنے اشعار میں اس کا برملا اظہار کیا ہے - ان کے اشعار میں ہجر کی کیفیات، نالہ و فراق کا غمزدہ انداز پایا جاتا ہے - وارداتِ قلبی اور عشق کی چوٹ سے دلِ فگار اور دامن اشکبار نظر آتا ہے - ان کے اشعار میں سادگی اور پرکاری موجود ہے - حسن ایک پختہ گو شاعر ہیں جن کے اشعار میں دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی دونوں کی خوبیاں موجود ہیں - نواب محبت خاں کے ذوقِ سلیم پر ان شاق شاعر کا بھی اثر تھا کیونکہ حسن انکے ساتھیوں میں سے تھے اور ایک دوسرے پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار رہتے تھے -

نواب محمد یار خاں امیر المتوفی ۱۷۷۵ء

نواب علی محمد خاں کے صاحبزادے، نواب فیض اللہ خاں والیٔ رامپور کے چھوٹے بھائی تھے۔ والیٔ روہیل کھنڈ نواب علی محمد خاں کے انتقال کے بعد حافظ رحمت خاں نے ان کے بیٹوں کو علیحدہ علیحدہ جاگیریں عطا کیں اور روہیل کھنڈ کے علاقے کو تین مرتبہ مختلف انداز سے تقسیم کیا، اس تقسیم کا سبب نواب علی محمد خاں کے بیٹوں کے درمیان رونما ہونے والا اختلاف تھا۔

نواب فیض اللہ خاں کو رامپور، چھاچھٹ اور شاہ آباد کا علاقہ ملا تھا، نواب محمد یار خاں امیر بوجہ صغیر سنی انکی تربیت میں دے دیے گئے تھے۔ بعد میں نواب محمد یار خاں امیر ٹانڈہ[1] میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں مسندِ امارت بچھائی، انہیں شاعری اور موسیقی سے دلچسپی تھی۔ علم موسیقی اور ستار نوازی میں یگانہ و یکتائے روزگار تھے[2]۔ اہلِ علم کی سرپرستی کرتے تھے۔ مرادآباد کے ایک صاحب انصاری کبیر علی نام کبیرؔ تخلص، طبیبِ ریاست تھے، ظریف انسان تھے[3]، انہوں نے نواب محمد خاں امیرؔ کو اردو شاعری کا شوق دلایا لہٰذا ان کی تحریک پر مرزا رفیع سوداؔ اور میر سوزؔ کو خطوط لکھے گئے، یہ دونوں بزرگ اس وقت فرخ آباد میں تھے اور وہاں نواب احمد خاں بنگش کے دیوانِ ریاست مہربان خاں رندؔ کی سرکار میں بصیغۂ شاعری عز و امتیاز رکھتے تھے اس لیے حاضرِ خدمت نہ ہو سکے۔

سوداؔ کے نامور شاگرد قیام الدین قائمؔ چاندپوری بدایوں کے قریب بسولی میں موجود تھے اور نواب دوندے خاں (حافظ رحمت خاں کے چچا زاد بھائی) کی سرکار میں ملازم تھے[4]۔ نواب محمد یار خاں کے حسب الطلب ٹانڈے پہنچے سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور نواب

---

[1] رامپور کے قریب ایک قصبہ ہے۔

[2] حیاتِ معنی: نگار پاکستان جنوری ۲۹ صفحہ ۱۲

[3] ایک ہی یار سے جی ناک میں آیا ہے کبیرؔ ۔ زیست معلوم اگر ایسے ہی دو چار ملے

[4] ڈاکٹر لطیف حسین ادیب "روہیلکھنڈ دورِ حکومت میں اردو شاعری کا فروغ" بریلی، معارف نمبر ۲، جلد ۹۶، ص ۷، ا/۱۷۱

کی استادی کا شرف حاصل ہوا[1] قائمؔ اس بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

؎ تجھ کو قائمؔ رکھے اللہ تا ابد سا ئے امیرؔ۔ مجتمع سائے میں ہیں جس کے سخنداں ایسے

چشمۂ شیریں کے قریب شعراء کا جمگھٹا ہوا، فدوی لاہوری، نعیم اللہ خاں نعیمؔ اور قائمؔ کے شاگرد پروانہ مراد آبادی نے نواب کی مصاحبت میں اردو شاعری کے ارتقاء میں حصہ لیا۔ مولوی قدرت اللہ قدرتؔ بھی ٹانڈہ میں وارد ہوئے انہوں نے ایک تذکرے کا مولف بن کر خوب شہرت پائی، میاں عشرتؔ اور مصحفیؔ نے بھی ٹانڈہ میں قیام کیا۔[2]

استاد قیام الدین قائمؔ کی شاعری اور زور قلم کا اثر نواب محمد یار خاں امیرؔ کی شاعری پر پڑا، قائمؔ کے دیوان کو ہرگز میر اور میرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے ان کا ایک مشہور شعر ہے :۔

؎ قسمت تو دیکھو ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند۔ کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

جہاں تک نواب محمد یار خاں امیرؔ کی سخن شناسی اور علم پروری کا تعلق ہے تو اس ضمن میں مصحفیؔ کے الفاظ دیکھیے :۔

علمِ موسیقی و ستار زدن یگانۂ روزگار و رعنائی و زیبائی

نوانے بود باغ و بہار دریا کہ بر ترغیب حکیم کبیر سنبلی شوق شعر

بندی دامن دلش را بسوے خود کشید، خطی بطلب میر سوزؔ و

میرزا محمد رفیع سوداؔ نوشتہ روانہ کرد، چوں در ایام ایں ہر دو

بزرگ در سرکار مہربان زندہ تخلص بصیغۂ شاعری عز و امتیاز داشتند

---

[1] نواب محمد یار خاں امیرؔ ابتداء میں قیام الدین قائمؔ کے شاگرد ہوئے اور انتہا میں مصحفیؔ سے بھی شرف تلمذ ہوا ہے۔

[2] مصحفیؔ نے ٹانڈہ کی پرلطف صحبتوں کو بڑی حسرت و آرزو سے لکھنؤ میں یاد کیا ہے لکھتے ہیں "و اللہ کہ یاد آں صحبت گذشتہ داغِ ناکامی بر دل دردمندی گزارد"

بحوالہ حوالہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری : وقائع عبدالقادر خانی "علم و عمل" ص ۱۵۷۔

کی استادی کا شرف حاصل ہوا[1] قائم اس بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

؎ تجھ کو قائم رکھے اللّٰہ بہت سا اے امیر۔ مجتمع سائے میں ہیں جس کے سخنداں ایسے

چشمۂ شیریں کے قریب شعراء کا جمگھٹا ہوا ، فدوی لاہوری ، نعیم اللّٰہ خاں نعیم اور قائم کے شاگرد پروانہ مراد آبادی نے نواب کی مصاحبت میں اردو شاعری کے ارتقا میں حصّہ لیا ۔ مولوی قدرت اللّٰہ قدرت بھی ٹانڈہ میں وارد ہوئے انہوں نے ایک تذکرے کا مؤلف بن کر خوب شہرت پائی ، میاں عشرت اور مصحفی نے بھی ٹانڈہ میں قیام کیا۔[2]

استاد قیام الدین قائم کی شاعری اور زورِ قلم کا اثر نواب محمد یار خاں امیر کی شاعری پر پڑا ، قائم کے دیوان کو ہرگز میر اور میرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے ان کا ایک مشہور شعر ہے :۔

؎ قسمت تو دیکھو ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند۔ کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

جہاں تک نواب محمد یار خاں امیر کی سخن شناسی اور علم پروری کا تعلق ہے تو اس ضمن میں مصحفی کے الفاظ دیکھیے :۔

علمِ موسیقی و ستار زدن یگانۂ روزگار و رعنائی و زیبائی جوانے بود باغ و بہار در ایا کہ بہ ترغیب حکیم کبیر سنبلی شوقِ شعرِ ہندی دامن دلش را بسوے خود کشید ، خطی بطلب میر سوز و مرزا محمد رفیع سودا نوشتہ روانہ کرد ، چوں در ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان زندہ تخلص بصیغۂ شاعری عز و امتیاز داشتند

---

[1] نواب محمد یار خاں امیر ابتدا میں قیام الدین قائم کے شاگرد ہوئے اور انتہا میں مصحفی سے بھی شرف تلمذ ہوا ہے۔

[2] مصحفی نے ٹانڈہ کی پر لطف صحبتوں کو بڑی حسرت و آرزو سے لکھنؤ میں یاد کیا ہے لکھتے ہیں "و اللّٰہ کہ یادِ آں صحبتِ گذشتہ داغِ ناکامی بر دل دردمندی گزارد"

بحوالہ خوشحال ڈاکٹر محمد ایوب قادری : وقائع عبد اللّٰہ در خانی "علم و عمل" ص ۱۵۷۔

از فرخ آباد آمدنِ ایشاں بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باش نواب بود اتفاق نیفتاد
آخر کار میاں محمد قائم کہ در آں ایام در لبسولی بودند حسب الارشاد آمدہ شرف ملازمت
آں والاجناب دریافت و بدر ماہیہ یک صد روپیہ عزو امتیازش دادہ باستادیش برداشت -

نواب محمد یار خاں امیر قائم کے شاگرد تھے اور قائم نے پہلے شاہ ہدایت سے مشورہ لیا، پھر درد سے بھی اصلاح لی لیکن تلمذ کا باقاعدہ سلسلہ سودا سے شروع ہوا[1]۔ لہذا امیر کے کلام میں اپنے استاد کے رنگ کے ساتھ ساتھ میر درد کے کلام کا رنگ بھی غالب رہا۔ میر درد کے کلام کی پر تاثیر سادگی کا عنصر امیر کے کلام کا بھی نمایاں پہلو ہے۔ قائم اور میر درد کی طرح امیر نے بھی چھوٹی بحور میں عمدہ اشعار کہے ہیں۔

دیکھی جو میں سر نوشت اپنی ۔ جز روز سیاہ کچھ نہ نکلا
کیا تو نے دیا تھا مجھ کو ساقی ۔ شیشہ میں تو واہ کچھ نہ نکلا

ان اشعار میں درد کی زبان بول رہی ہے۔ اس کے علاوہ قائم پر ان دنوں درویشی کا رنگ غالب تھا جو امیر کے اشعار سے بھی نمایاں ہوتا ہے[2]

اٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا ۔ دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا "قائم"
ماہیتِ خلق خوب سمجھے ۔ پر آپ سے بے خبر گئے ہم "امیر"

نواب امیر ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو سنّی العقیدہ اور عشقِ محمدی سے سرشار تھا، نماز روزہ کے پابند تھے، عبادت و ریاضت میں اپنی راتیں گزارتے تھے۔

جنس طاعت سے کچھ اپنے تو نہیں پاس امیر - مگر احمد کا ہوں میں اور ہے احمد میرا

امیر کی غزلیات کے بیشتر اشعار اس دور کی غزل کے روپ کا مظہر ہیں۔ ان میں ہجر و وصال کی کیفیات محبوب کے عشوے و غمزے، عشق کی لگاوٹ، جذبۂ خودداری کے ساتھ، سادگی اور

---

[1] یہ اول شاہ ہدایت کے شاگرد ہوئے ان سے ایسی بگڑی کہ ہجو کہی۔ تعجب یہ ہے کہ شاہ موصوف باوجودیکہ حد سے زیادہ خاکساری طبیعت میں رکھتے تھے مگر انہوں نے بھی ایک قطعہ ان کے حق میں کہا۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے ان کے حق میں بھی کہہ سن کر الگ ہوئے۔ پھر مرزا کی خدمت میں آئے اور ان سے پھرے۔ مرزا تو مرزا تھے، انھوں نے سیدھا کیا (بحوالہ حاشیہ آبِ حیات ص ۱۵۶ -)

[2] نگار پاکستان "حیاتِ مصحفی" جنوری ۱۹۳۹ء، ص ۱۶ -

اور دردمندی سے نظم کی گئی ہیں۔

نمونۂ کلام:-

ؔ تیرے گھر جانے سے یاں اپنا تو گھر جاتا ہے ۔ اے میری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے

ؔ ہائے سرخی ترے رخسار کی ہنگامِ عتاب ۔ جتنا بگڑے ہے وہ اتنا ہی سنور جاتا ہے

ؔ سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے میخواری سے ۔ لہو تیرا تری آنکھوں میں ہے خونخواری سے

ؔ وقت رخصت کے ترے اے مرے جی کے دشمن ۔ تھام تھام آج رکھا دل کو میں کس خواری سے

ؔ کس نے نظروں میں خدا جانے اسے مل ڈالا ۔ نرگس آج آنکھ اٹھاتی نہیں بیماری سے

ؔ کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیرؔ ۔ گھر میں جاتے ہیں پرائے تو خبرداری سے

ؔ شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن ۔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا[1]

ؔ تھرتھراتا ہے اب تلک خورشید ۔ سامنے تیرے آ گیا ہوگا

ؔ داغِ دل لے چلے گلی سے تری ۔ چاہیے کچھ نشان کی خاطر

ؔ کیوں سیل کچھ تجھے بھی خبر ہے کہ مثلِ موج ۔ جائیں گے کس طرف کو ہیں آئے کہاں سے ہم

ؔ جوں نقشِ قدم نام کو ہستی ہے ہماری ۔ اک بار کے جھونکے میں نہ ہم ہیں نہ نشاں ہے

ؔ جاؤ دنیا پہ اعتماد ہے کیا ۔ مہر بعد از فروغ ڈھلتا ہے

ؔ کن حسرتوں سے چھوڑ کے ہم یہ جہاں چلے ۔ آئے تو جو سبک تھے یہ کتنے گراں چلے

ؔ گر وقتِ ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا ۔ پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے

نواب محمد یار خاں امیرؔ کے محولہ بالا اشعار کے مطالعے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں روانی اور سلاست ہے، محاورات کا استعمال نہایت خوش اسلوبی سے کر سکتے ہیں، سیدھے سادے پیرائے میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار تو ضرب المثل بن چکے ہیں اور زبان زد عام ہیں ا۔

---

[1] یہ شعر میرؔ کے اس شعر سے مستفاد ہے ۔ شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مثلاً :-

؎ گر وقتِ ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا ۔ پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے

؎ شکست و فتح میاں اتفاق ہیں لیکن ۔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

امیر کے کلام میں سہلِ ممتنع خاص انداز سے جلوہ گر نظر آتا ہے :- فرماتے ہیں

؎ ماہیتِ خلق خوب سمجھے ۔ پر آپ سے بے خبر گئے ہم

ہر ایک شاعر کا کائنات اور زندگی کے بارے میں ایک تصور ضرور کھل کر سامنے آتا ہے۔ اور ہر بڑے شاعر نے اس فکر کو کسی نہ کسی انداز میں اجاگر بھی کیا ہے ۔ امیر بھی اس ضمن میں دیگر بڑے صوفی شعراء کی طرح انداز فکر رکھتے ہیں :-

؎ کہاں کی زیست کس کی عمر سب ۔ حباب آسا ہے جھگڑا ہر اک نفس کا

؎ جوں نقشِ قدم نام کو ہستی ہے ہماری ۔ اک بار کے جھونکے میں نہ ہم ہیں نہ نشاں ہے

امیر اپنے مصاحبوں کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کی محفل سجائے ہوئے تھے ، کہ حافظ رحمت خاں شہید کر دیے گئے ، نواب فیض اللہ خاں بہادر لال ڈانگ میں محصور ہو گئے ، امیر بھی افراتفری کے عالم میں ٹانڈے سے نکلے[۱] ۔ سنبھل سے نزدیک فیروز پور میں ان کے برادرِ نسبتی علی محمد خاں ولد پائندہ خاں ملے ، انھوں نے بتایا کہ اب کوئی لال ڈانگ نہیں پہنچ سکتا مجبوراً محمد یار خاں آنولہ چلے گئے ۔ شجاع الدولہ نے منونہ پہنچ کر کیمپ کیا تو نواب محمد یار خاں مرزا آغا اور مرزا رمضانی کی معرفت شجاع الدولہ کے حضور پیش ہوئے اور انہیں امان دی گئی ۔ اس طرح آنولے کی لوٹ مار کے دوران ان کا مکان ، مال و اسباب محفوظ رہا۔ البتہ ٹانڈے سے جس پریشانی کے عالم میں نکلے تھے اس میں پ اپنی شاعری کے مسودات کا خیال نہیں رہا اور مسودات خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچے ۔ منونہ کیمپ میں امان دینے کے بعد جب آنولے سے کوچ ہوا تو شجاع الدولہ نے نظر بندی میں انھیں اپنے ساتھ رکھا

---

۱ راز یزدانی : "رامپور کا ماحول شعر و سخن" ، نگار پاکستان (کراچی) اگست ، ۱۹۵۸ء ص ۲۰ -

فیض اللہ خاں بہادر اور شجاع الدولہ کی صلح کی تکمیل کے وقت آپ شجاع الدولہ کے کیمپ میں موجود تھے کہا جاتا ہے کہ کیمپ میں ان کی خاطر خواہ مدارت اور دیکھ بھال نہیں ہوئی اور وہ بیمار پڑ گئے۔ یہ طویل بیماری بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی ۔ صلح کے بعد امیر بھی رام پور چلے آئے تھے، دو ڈھائی ماہ بعد ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۵ء میں انتقال ہوا۔ مدرسے میں ان کا مقبرہ ہے ۔

نواب محمد یار خاں امیر کی عظمت کا راز ان کے مربیٔ سخن ہونے میں پوشیدہ ہے ان کی مجلسِ سخن میں شعراء کا بڑا اجتماع ہو گیا تھا ۔ اگر سیاسی افراتفری نہ ہوتی اور حافظ رحمت خاں، شجاع الدولہ اور انگریزوں کی ملی بھگت سے شہید نہ کر دیے جاتے تو روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور روہیل کھنڈ کا دبستانِ شاعری ایک علیحدہ دبستان کی حیثیت سے پہچانا جاتا ۔

قیام الدین قائمؔ چاند پوری

شیخ قیام الدین نام عرف محمد قائم ہے، قائمؔ تخلص، چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے[۱]۔ آپ سنِ شعور کو پہنچتے ہی روزگار کی تلاش میں دہلی آئے۔ یہ شاہ عالم کا دور تھا۔ شاہی توپ خانے میں نوکر رہے۔ علوم متداولہ میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے[۲] لہٰذا بے فکر ہوئے اور شاعری شروع کی، ابتدا میں شاہ ہدایت سے تلمذ اختیار کیا لیکن جلد ہی ان سے بگاڑ پیدا ہو گیا اور ان کی ہجو کہی، خواجہ میر درد سے اصلاح لینی شروع کی لیکن کچھ مدت بعد ان سے بھی اختلاف ہوا، ان کی بھی ہجو کہی۔ درد کے بعد سودا سے رجوع ہوئے اور سودا کے ساتھ بھی انہوں نے وہی ڈھنگ اختیار کیا لیکن سودا کو ہجو میں خاص شہرت حاصل تھی اور انکے سامنے انکی چل نہ سکی سودا نے ایسی خبر لی کہ کس بل نکال دیا[۳]۔

دہلی کے زوال کے قریب، قائمؔ نے آنے والے وقت کو محسوس کر لیا، پہلے بسولی کو رختِ سفر باندھا، بسولی میں نواب دوندے خاں اپنی نوابی کے ٹھاٹ جمائے بیٹھے تھے، ان کی سرکار میں ملازمت اختیار کی۔ جب نواب محمد خاں امیرؔ نے اردو شاعری کا آغاز کیا تو استاد کی تلاش ہوئی۔ میر سوزؔ اور مرزا رفیع سودا کو خطوط تحریر کیے گئے لیکن ان دونوں نے معذرت چاہی۔ پھر نواب دوندے خاں کو بسولی لکھا گیا اور اس طرح قائمؔ بسولی سے ٹانڈے چلے آئے اور سو روپے مہینے پر وظیفہ نواب محمد یار خاں امیرؔ کے استاد مقرر ہوئے[۴]۔ قائمؔ لکھنؤ جا کر اپنی خاندانی جائیداد کی بحالی کے بعد مکمل طور پر رام پور میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ قائمؔ ہی نے مصحفیؔ کو بھی نواب محمد یار خاں کی سرکار میں ملازم رکھوایا۔ قائمؔ کو بحیثیت شاعر سودا کے ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے[۵]۔

۱۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی: "دلی کا دبستانِ شاعری" طبع دوم، اردو اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۱۱۔

۲۔ راز یزدانی: "رام پور کا ماحول شعر و سخن"، نگار پاکستان، اگست ۱۹۵۸ء، ص ۷۱۔

۳۔ حضرتِ درد کی خدمت میں جب آ قائمؔ نے — عرض کی یوں کہ اے استادِ زماں سنتے ہو
امر ہو وے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا — واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسو سے بھی کبھی کج طینت — تیر بنتی ہے کہیں شاخِ کماں سنتے ہو
قائمؔ بہ فیضِ حضرتِ سودا ہے درد میں — طرحی غزل سے میر کے آ تا تھا بر کہیں

۴۔ نواب محمد یار خاں امیرؔ کی وفات کے بعد انکے چھوٹے بھائی احمد یار خاں افسرؔ نے اسی وظیفہ پر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

۵۔ مرزا علی لطف گلشنِ ہند میں لکھتے ہیں، "مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف ہیچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے، راقم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے"۔

مصحفی قائم کو سودا پر ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

"در پختگی کلام و چستی مصراع در رویہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دو قش بدوش استاد راہ میرفت بلکہ در بعضے مقام رجحان می جست" ۔

لیکن شیفتہ نے اپنے تذکرے میں اس بات کو ماننے سے انکار کیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قائم کے اشعار میں سودا کی سی بلند پروازی اور شان و شوکت نہیں البتہ درست ہے کہ انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ مثنوی[1]، غزلیات ، قطعات ، رباعیات انکے کلام میں موجود ہیں ۔ دراصل میر درد ، میر سوز اور سودا سے اصلاح پانے والا شاعر قادر الکلام ضرور تھا لیکن کاش وہ ان اساتذہ کی خاکِ پا کو سرمہ بناتا تو اسے ضرور شہرت کی بلندی میسر ہوتی ۔

قائم کے اس رویّے سے جو انھوں نے اپنے سابقہ اساتذہ کی ہجو لکھ کر ظاہر کیا ، قائم کی بد دماغی اور کم مائیگی ظاہر کرتا ہے ۔ قائم کے بعض اشعار ضرب المثل بن گئے اور بہت مشہور ہوئے مثلاً :۔

قسمت[2] تو دیکھو ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند ۔ کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

قائم کے کلام میں ، درد ، سوز اور سودا کی بازگشت سنائی دیتی ہے ۔ سہل ممتنع کے زمرے میں جو اشعار آتے ہیں وہ درد کے اشعار کا سامنا کرتے ہیں ۔

ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم ۔ کیا کہوں پر رہا نہیں جاتا

قائم کے کلام میں قدیم شعراء کی طرح گفتگو کا وہ انداز ملتا ہے جو روزمرہ اور محاورہ کا خاص انداز ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپس کی بے تکلف گفتگو کو اشعار کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے ، اس ضمن میں قائم کا کلام بڑے بڑے استاد شعراء سے کسی طرح کم نہیں ۔

اک عرض تو تھی پر اس سے پیارے ۔ کیا کہئیے جو بات کو نہ سمجھے

گو ہم سے تم ملے نہ ، تو ہم بھی نہ مر گئے ۔ کہنے کو وہ گیا یہ سخن دن گذر گئے

---

[1] مثنوی صبح خورشید جس کے پانچ اشعار جس کے پاس تھے مرتب نے سودا کے کلام کے ساتھ شائع کرادئے حالانکہ یہ قائم کے اشعار تھے ۔ مثنوی شدت سرما جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے سردی اب کہ برس ہے اتنی شدید صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

مثنوی طفل پتنگ باز ، ۷۱ اشعار پر مشتمل حکایت ہے سنا ہے کہ اک مرد ابن طریق ۔ نہایت ہی واقع ہوا تھا خلیق حکایت ۲۸ شعر کی ۔ ایک حکایت ۱۶ اشعار کی ۔ ایک مثنوی ۵۹ ۳ اشعار کی بعنوان " حکایت مرد درویش " تحریر کی ۔

[2] گلشن بے خار میں اس طرح ہے ۔ قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

روزمرہ محاورہ کی زبان اشعار میں علیحدہ ہی نظر آتی ہے، قائمؔ کو اس سلسلے میں کس قدر ادراک و مشق ہے وہ ان کے اشعار سے واضح ہوتا ہے خاص طور پر ایسے اشعار سے جن میں ایک ہی موقع پر کئی روزمرہ محاورے استعمال کیے گئے ہیں اور شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ قائمؔ کے منتخب اشعار جو مختلف تذکروں میں ملتے ہیں ان سے ایک بات اور سامنے آتی ہے کہ انکے کلام میں صنعتِ تضاد کو بحسن و خوبی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

یہاں ہم صنعتِ تضاد کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں:-

- کیوں چھوڑتے ہو دردِ تہِ جام میکشو ۔ ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا
- بتوں کی نظروں سے نزدیک تھا کہ اتریں ہم ۔ گرے تھے دور سے لیکن خدا نے تھام لیا
- رکھیں اپنے تئیں کس طرح ہم دوست ۔ ہو تجھ سا شخص جب دشمن ہمارا
- تیرے فراق میں مر کر کھلا ہے یہ عقدہ ۔ کہ تھی وہ موت سمجھتے تھے جس کو ہم جینا
- کیوں نہ روؤں میں دیکھ خندۂ گل ۔ کہ ہنسے تھا وہ بے وفا یو نہی۔
- ناصحا کر نہ اے سی کے پشیماں مجھ کو ۔ کتنے ہی چاک ابھی کرنے ہیں گریباں مجھ کو
- اہلِ مسجد نے جو کافر مجھے سمجھا تو کیا ۔ ساکنِ دیر تو جانے ہیں مسلماں مجھ کو

مندرجہ بالا اشعار میں ہم متضاد الفاظ کی بڑی تعداد تلاش کر کے حاصل کر سکتے ہیں چند اشعار مزید ملاحظہ فرمائیے جن میں تخیل کی بلند پروازی، بعض محاورہ اور نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔

- آتشِ عشق میں جلنا نہیں کارِ آساں ۔ ہر مگس سے نہ طلب کر جگر پروانہ
- جوں موج میرا قافلہ غافل ہے سفر سے ۔ کیا جانے کہاں جائے گا آیا ہے کدھر سے
- ہوتے تیرے مجال ہے ہم درمیاں نہ ہوں ۔ جب تک وجودِ شخص ہے سایہ نہ جائے گا
- شیخ جی مانا میں اس کو تم فرشتہ ہو تو ہو ۔ لیک حضرت آدمی ہونا نہایت ہے

معاملہ بندی کا ایک شعر دیکھیے ۔

- قائمؔ اور تجھ سے طلب بوسہ کی کیونکر کیجئے ۔ یوں وہ نادان ہے پر اتنا تو بدآموز نہیں

1۔ قائمؔ کے بارے میں آزادؔ کی یہ رائے ہے " قیام الدین قائمؔ ان کا وہ شاگرد تھا جس پر استاد کو فخر کرنا چاہیئے" [illegible] آبِ حیات ص ۱۵۵

حکیم کبیر علی سنبھلی

حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی، مراد آباد کے متعلقات میں سنبھل کے رہنے والے تھے۔ طب میں مہارت تامہ رکھتے تھے[۱] نواب محمد یار خاں بہادر کے ملازم تھے۔ تذکرہ کاملانِ رامپور میں تحریر ہے[۲]

"ایک روز نواب صاحب کی آنکھ میں سال کی لکڑی کا ایک ریزہ گھس گیا حکیم صاحب نے محمد حیات جراح کو بلا کر کہا کہ اس کو نکال لے چنانچہ اس کام کے لیے جو آلات مقرر ہیں اس سے وہ ریزہ نکال لیا مگر آنکھ سے خون جاری ہو گیا۔ حکیم صاحب نے فوراً دوا تجویز کر کے آنکھ پر باندھی۔ تیسرے دن ہی کھولی آنکھ اچھی تھی۔ مگر سرخی شدید آنکھ میں پیدا ہوئی تھی ایک ہفتے کے علاج میں وہ بھی جاتی رہی۔ نواب صاحب نے غسلِ صحت کی خوشی میں ڈوم ڈھاڑیوں کو خلعت اور بہت روپے دیے۔ اسی طرح مصاحبین کو مثل سید محسن شاہ و میر ضیاء الدین عبرت و میر محمد قاسم شاعر اور میاں معز الدین وغیرہ کو خلعت دو شالے تھان کمخواب اور بنارسی دو پٹوں سے دیے۔ لیکن حکیم صاحب چونکہ نوکر تھے ان کو ایک پان بھی نہیں دیا حکیم صاحب نے ذیل کی رباعی لکھ کر نوازی نامی درزی کے ہاتھ نواب صاحب کو بھیج دی۔"

~ جنابِ عالی کو آج غسل صحت کا ۔ ہر ایک ندیم کے تئیں عطر اور پان ملے
بجائے خلعت بیست پارچہ و اسپِ عراق ۔ حکیم جی کو بھی کہتے ہیں تین تھان ملے

مصحفی تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں:

حکیم کبیر سنبھلی انصاری بودہ و کبیر تخلص می گذاشت، فقیر ایشاں را در سرکار نواب محمد یار خاں امیر مرحوم کہ ذکر ایشاں گذشت دیدہ بود بسیار بخوبی پیش آمدہ بہ سبب تمادی ایام یک شعر از ایشاں بخاطر است[۳]

~ ایک ہی یار سے جبیں ناک میں آیا ہے کبیر ۔ زیست معلوم اگر ایسے ہی دو چار ملے

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب فرماتے ہیں:

"حکیم کبیر سنبھلی ایک ذی حیثیت شاعر تھے[۴] وہ نوابین روہیلہ کے پرانے نمک خوار اور نواب محمد یار خاں امیر کے رفیق تھے۔ ان ہی کی ترغیب پر امیر نے شعر گوئی کی تھی ان کا دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے۔"

۱۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ: "گلشنِ بے خار"، ترجمہ و حواشی، محمد احسان الحق فاروقی، طبع اول، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۲ء ص ۳۷۷۔

۲۔ احمد علی خاں شوق: "تذکرہ کاملانِ رامپور"، دہلی، ہمدرد پریس، ۱۹۲۹ء، ص ۳۲۸، ۳۲۷۔

۳۔ غلام ہمدانی مصحفی: "تذکرۂ ہندی"، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء، ص ۱۹۷۔

۴۔ جہاں تک حکیم کبیر علی سنبھلی کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے تو یہ کہنا کافی ہے کہ اگر وہ اساتذہ شعراء کی صف میں ہوتے تو نواب محمد یار خاں امیر کے استاد مقرر کرنے کی خاطر میر سوز اور سودا کو بلانے کی ضرورت پیش نہ آتی اور ان دونوں کی معذرت [illegible]

سید پروانہ علی شاہ پروانہ مراد آبادی[1]

قیام الدین قائم چاند پوری کے توسل سے نواب محمد یار خاں امیر کی بزم سخن میں داخل ہوئے قلندر وضع اور صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ ان سے متعلق گلزارِ ابراہیم میں تحریر ہے[2]

"دریں زمانہ کہ عہد عالم شاہ است شنیدہ شد ترک دنیا داری کردہ لباسِ فقر پوشیدہ"۔

مصحفی تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں کہ[3]

"جوان شوریدہ سر و قلندر وضع بود بنگ و شراب و شدت یزد و یکہب و شغل نفی و اثبات وغیرہ نیز راہے داشت گاہ گاہے از وکشف کہ اہل کمال را باشد مشاہدہ کردم۔ معرفت محمد قائم در سرکار محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گذشت او ہم در سلسلۂ شعراء جا داشت و چیزے کہ موزوں می کرد از نظر ایشاں می گزرانید"۔

پروانہ نواب امیر کی سرکار میں شعراء کے زمرے میں شامل تھے اور نواب امیر کے استاد قیام الدین قائم کے شاگرد تھے۔ پروانہ اپنا دیوان درست کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں،

ہمتِ حضرتِ قائم سے اگر ہو امداد ۔ چند ایام میں کر لیجئے دیوان درست

نمونۂ کلام

آج ثابت نہ رہے دل نہ کوئی جان درست ۔ اسکی مژگاں نے کیے پھر پیرو پیکان درست

الفت جو کی ہے تم نے میاں اس کا ساتھ دو ۔ یا دل جو لے گئے ہو مرا میرے ہاتھ دو

اپنا تو دل زمانے سے اب اتنا تنگ ہے ۔ جو دم ہے زندگی کا سو شیشہ پہ سنگ ہے

---

[1] ان کا نام بیشتر تذکروں میں پروانہ علی شاہ درج ہے۔ مگر گلزار ابراہیم میں سید پروان علی لکھا ہے۔

[2] علی ابراہیم خاں خلیل: "گلزار ابراہیم" (مع گلشنِ ہند علی لطف)، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور، طبع اول، اورنگ آباد دکن، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۴ء، ص ۷۶۔

[3] غلام ہمدانی مصحفی: "تذکرۂ ہندی"، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو ۱۹۳۳ء، ص ۵۷۔

نعیم اللہ خاں نعیم[1]

نعیم اللہ خاں نعیم شاہ حاتم کے شاگرد تھے اور اس طرح مرزا رفیع سودا اور نعیم اللہ نعیم ایک ہی استاد کے شاگرد تھے ۔ نواب محمد یار خاں امیر نے شعراء کی قدردانی کی تو بہت سے شعراء نواب کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے اور ان کی فیاضانہ طبیعت سے مالامال ہوئے ۔ نواب امیر کی سرکار میں یہ ایک جوان العمر اور زُہر گو شاعر تھے ۔ مصحفی نے لکھا ہے[1]:

" فقیر او را در آنولہ دیدہ بود کہ بعد چندے در سرکار نواب محمد یار خاں نوکر شد چوں ملازمت نواب مؤلف ہم در آں نزدیکی کرد و قصیدۂ مدح بر گوش حضّار رسانیدہ داخل صحبت کیمیا خاصیت شد لہٰذا اکثر اتفاق ملاقات می افتاد "۔

میر حسن نے ان کے لیے یہ رائے قائم کی ہے ۔

" فکرش سرسری است بعالم اعلیٰ نرسیدہ مگر بعضے جستہ جستہ خوب می گوید " (بحوالہ شعر الہند ص ۱۲۶ -)

ٹانڈہ کی محفل جب تک برقرار رہی اور روہیل کھنڈ پر حافظ رحمت خاں اور نواب علی محمد خاں کے صاحبزادوں کی سرداری قائم رہی ، اس علاقے میں شعراء کی قدردانی بھی ہوتی رہی ۔

سکرتال کے مقام پر ضابطہ خاں کی شکست کے بعد روہیل کھنڈ کی آبادی میں شدید تفرقہ رونما ہوا ، اس زمانے میں نعیم انتر چھینڈی[2] چلے گئے اور وہیں مرضِ استسقا میں مبتلا ہو کر وفات پائی ۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

آفت کی نشانی ہی رہے ہم تو زمیں پر ۔ جو سنگِ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر گر تجھے منظور تھا غیروں سے ہونا آشنا ۔ پھر عبث تو کیوں ہوا ظالم ہمارا آشنا
تیری خاطر کے لیے سنتا ہے اے بیگانہ وضع ۔ سب مرے دشمن ہیں کیا بیگانہ و کیا آشنا
کوچۂ یار سے دل ہم سے اٹھایا نہ گیا ۔ مل گیا خاک میں اس طرح کہ پایا نہ گیا
نشتابی عبث تو نے کی جان مضطر ۔ ابھی تو ہمیں آرزو تھی کسو کی
کس سے لگاویں دل کوئی محبوب ہی نہیں ۔ اور سچ کہو تو کام یہ کچھ خوب ہی نہیں

---

[1] عقدم ۔ ابی مصحفی : " تذکرۂ ہندی " ، مرتبہ مولوی عبد الحق ، اورنگ آباد ، انجمن ترقی اردو ، ۱۹۳۳ ، ص ۲۵۹
[2] من مضاف آنولہ ۔

؎ شتابی عبث تونے کی جان مضطر - ابھی تو ہمیں آرزو تھی کسو کی

نعیم اللہ نعیمؔ کے کلام میں روانی پائی جاتی ہے - نعیم کے اشعار میں سادگی، تابانی اور رعنائی خیال موجود ہے - شوکتِ الفاظ اور بلند پروازیٔ تخیل اس شاعر کے پختہ گو ہونے کی دلیل ہے - ؎ آفت کی نشانی تو رہے ہم ہی زمیں پر - جو سنگِ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر

؎ کوچۂ یار سے دل ہم سے اٹھایا نہ گیا - مل گیا خاک میں اس طرح کہ پایا نہ گیا

بیان کی سادگی کے ساتھ، وسعتِ خیال اور شاعرانہ استدلال قابلِ تعریف ہے - سہلِ ممتنع، کے بعض اشعار ان کے استاد ظہور الدین حاتم کے ہم پلہ ہیں :

؎ تم تو بیٹھے ہوئے یہ آفت ہو - اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو "حاتمؔ"

؎ کوچۂ یار سے دل ہم سے اٹھایا نہ گیا - مل گیا خاک میں اس طرح کہ پایا نہ گیا "نعیمؔ"

نعیم اللہ خاں نعیمؔ کے کلام میں وسعتِ تخیل، نکتہ آفرینی اور فصاحت پائی جاتی ہے - حاتمؔ کے پینتالیس تلامذہ ہیں، ان میں جو تین شعرا سرِ فہرست ہیں وہ سوداؔ، نعیمؔ اور لقاء اللہ لقاؔ ہی ہو سکتے ہیں۔

فدوی لاہوری

فدوی لاہوری کے بارے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے گلشنِ بے خار میں جو فرمایا اس کا ترجمہ یہ ہے :

"مکند لبقال، لاہور کا رہنے والا ایک لڑکا تھا جو مشرف بہ اسلام ہوگیا تھا اس شہر میں اگر سودا سے نوک جھوک ہوگئی، سودا نے اسکی بہت رکیک ہجویں لکھیں جو مشہور ہیں، شاہ صابر علی صابر کے شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سادہ رخوں کی محبت کا نقش اس کے دل نشیں تھا اور اس سلسلے میں کئی بار جھگڑے بھی ہوئے اور زخم بھی کھائے۔ بالآخر نواب ضابطہ خاں کے دربار میں ملازم ہوگیا اور بعد میں مرگیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اسکو مغل لکھا ہے اور اس کا نام فدائی بیگ بتایا ہے[1]"۔

محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں :

"پنجاب وطن تھا، علم کم مگر طبیعت مناسب تھی۔ احمد شاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا تو بادشاہ نے ہزار روپیہ، شتر، گھوڑا اور تلوار انعام میں دی"۔

نواب احمد خاں کے عہد میں فرخ آباد بھی آئے۔ مرزا رفیع سودا سے ہجونگاری کا مقابلہ بھی ہوا۔ جوانی میں ایران کا سفر کیا اور چار برس خراسان و اصفہان میں رہے مذہباً شیعہ تھے[2]۔ سودا نے طنزاً ان کے دوسرے ملک جانے کا تذکرہ کیا ہے :

ے شاعروں میں ہند کے میں گیا ایران تک۔ سیکھی زباں واں کی بھی جا کے خراسان تک

---

[1] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ : "گلشن بے خار"، مترجمہ احسان الحق فاروقی، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۳۔

[2] مفتی ولی اللہ فرخ آبادی : "عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ" (اردو ترجمہ) مرتبہ محمد ایوب قادری، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۵ء، ص ۲۰۸۔

نواب محمد یار خاں امیر کے جلو میں جو شاعر جمع تھے ان میں فدوی لاہوری بھی ٹانڈہ میں رہے فرخ آباد میں ایک عطار کی دوکان کے قریب مکان لیا تھا یہیں پر سودا سے ہجو نگاری کا مظاہرہ ہوا[1] اس کے لیے سودا نے جو ہجویں تحریر کیں وہ کلیات سودا میں موجود ہیں البتہ سودا کے بارے میں فدوی کی ہجویں نسیاً منسیا ہو گئیں[2] فدوی لاہوری سودا کے مقابلے کے لیے فرخ آباد آئے اسکی تائید خود سودا کے اشعار سے بھی ہوتی ہے[3]

اے بیابانِ نجیست کے غول ۔ لبنیوں نہ کر تو ڈانواڈول
فرخ آباد کے تو محلوں میں ۔ حد سے باہر تو کر چکا ہے کلول
جلد یہاں سے نکل وگرنہ ترا ۔ بھرم اس طرح سے میں دوں گا کھول

فتح علی شیدا امیر سوز کا متبنیٰ تھا اور سودا کا شاگرد ۔ جب فدوی نے احمد نگر عرف فرخ آباد میں سودا سے شاعرانہ مجادلہ کیا تو شیدا نے اپنے استاد کی حمایت میں اس کی ہجو کہی ۔ میر حسن اور شوق کے بیانات کے سوا خود مثنوی کے اشعار اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔[4]

وارد احمد نگر ایک ہیں مردِ عزیز ۔ فہم میں سر تا قدم اور سراپا تمیز
شعر پر ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض ۔ جامی کے دیوان سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض
حضرتِ سودا تلک جو مرے استاد ہیں ۔ شعر پہ ان کے بھی اب یہ کریں ایراد ہیں

فدوی فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ مشاعرے میں کبھی بیٹھ کر ورنہ کھڑے کھڑے ہی غزل پڑھ دیتے تھے ۔ کچھ دنوں نواب ضابطہ خاں کی سرکار میں ملازم رہے اور نواب ہی کی فرمائش پر "یوسف زلیخا" کو اردو میں منظوم کیا ۔

میر حسن اپنے تذکرے میں فدوی لاہوری کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔

"مردے برخود غلط برائے مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیش مرزا رفیع سلمہ اللہ آمدہ ہنگامہ برپا نمود بعد از ذلت بسیار بہ وطن خود برگشت" ۔

مصحفی ان کی امرد پرستی اور حسن پرست طبیعت سے متعلق فرماتے ہیں :

"الحاصل چوں از اں طرز آوردہ شدہ بر ملک ہندوستان رسید دعوائے شاعری در ماغش جا داشت و زیادہ از مرتبۂ شاعری قدم در راہ امرد پرستی می گذاشت چند جا

1۔ گلشن بے خار میں شیفتہ کا بیان ہے کہ "اسی شہر (دہلی) میں آکر سودا سے نوک جھونک ہو گئی" لیکن یہ بیان درست نہیں ۔
2۔ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی: "عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ" (اردو ترجمہ) مرتبہ محمد ایوب قادری ، کراچی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ، ۱۹۶۵ء ، ص ۲۰۹ ۔
3، 4۔ شیخ چاند : سودا (مقالہ تحقیق) ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، اشاعت ثانی ، ۱۹۶۲ء ، ص ۱۱۲ ، ۶۵ ۔

خانہ جنگی ہم کردہ بر کودکان حسین تعیش و رزیدہ اکثر اعضایش دیدم کہ مجروح بودند [۱]

جس زمانے میں مصحفی آنولہ میں تھے اس زمانے ہی میں فدوی سے ان کی ملاقات ہوئی :

"در ایامیکہ از شاہ جہاں آباد در کھتیر (کذا) آمد در آں روزہا فقیر در آنولہ بود کہ شورش او بہ سمع رسیدہ آخر روزے برائے دیدنش رفتم او باش چند گرد و نشستہ دیدم صحبتِ شعر بمیان آمد [۲]"۔

فدوی لاہوری کی رسائی نواب محمد یار خاں امیر کے دربار میں ہو گئی لیکن جلد ہی نواب موصوف کی سرکار سے برخاست کر دیے گئے۔ تذکرۂ ہندی کے مطابق :

بعد چند روزے شنیدم کہ بر سرکار نواب محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گذشت نوکر شد بعد دو سہ ماہ میاں محمد قائم وغیرہ و فقیر ہم بایاب مجلس ایشاں شدند بہ سبب برہم زدگی مزاج نواب کہ بیاں آں موجب تطویل است برخاستہ رفت [۳]

مصحفی کے مطابق پچاس برس کی عمر میں مراد آباد میں فوت ہوئے [۴]

منتخب اشعار اور نمونۂ کلام

ٹلتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے ۔ ہم داد خواہ ساتھ ہیں اس کے جہاں چلے

کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیر آہ سے ۔ یہی ہے تیر اک کہ سدا بے کماں چلے

سر پر تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار ۔ ہر اک قدم پہ روتے ہوئے خوں فشاں چلے

لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں ۔ بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی اے دوستاں چلے

یاروں نے اپنی راہ لی فدوی ہمیں سے ہے ۔ وہ جیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

---

[۱] [۲] غلام ہمدانی مصحفی : "تذکرۂ ہندی"، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۶، ۱۶۷۔

[۳] مصحفی کا یہ بیان اس اشارہ کرتا ہے کہ فدوی ٹانڈہ میں بھی اپنی سابقہ حرکتوں سے باز نہیں آئے ۔ نواب امیر ان سے ناراض ہو گئے ہوں گے اور انہیں اپنی مصا[حبت] سے علیحدہ کر دیا ہوگا ۔ تذکرۂ ہندی، ص ۱۶۷۔

[۴] اسیر نگر نے لکھا ہے کہ بریلی میں قتل ہوئے، ناسخ نے لکھا ہے کہ مراد آباد میں انتقال ہوا ۔ بحوالہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری : "مرتب تاریخ نیگش"، مولفہ مفتی ولی اللہ، ۱۹۶۵، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ص ۹۰

ؔ بعد مرنے کے بھٹکتا ہوں تہِ خاک ہنوز ۔ ساتھ پھرتی ہے مرے گردشِ افلاک ہنوز

ؔ چشم پُر آب ہے اور تس پہ جگر جلتا ہے ۔ کیا قیامت ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے

ؔ آوارہ و سرگشتہ نہ دیوار نہ در کے ۔ سایہ کی طرح ہم نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے

ؔ یہ سرو نہیں باغ میں ہے آہ کسی کی ۔ نرگس نہیں تکتا ہے چمن راہ کسی کی

فدوی کے کلام میں غزل کا نیا انداز پایا جاتا ہے ۔ مثلاً

ؔ چشم پر آب ہے اور تس پہ جگر جلتا ہے ۔ کیا قیامت ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے

ؔ یہ سرو نہیں باغ میں ہے آہ کسی کی ۔ نرگس نہیں تکتا ہے چمن راہ کسی کی

غلام علی عِشرت بریلوی

نواب محمد یار خاں امیرؔ کی محفلِ سخن میں بروایت مصحفیؔ ایک بذلہ گو میاں عِشرتؔ بھی ملازم تھے۔[1] ان کا نام میر غلام علی تھا، بریلو کے رہنے والے تھے" تذکرہ کاملانِ رامپور کے مطابق:

"ابن میر معظم علی مشہدی ۔ نواب نصر اللہ خاں بہادر کے زمانۂ نیابت میں ۱۲۰۹ھ لغایت ۱۲۲۵ھ ریاست کے ملازم ہوئے ۔ بریلی میں محلہ گڑھیا میں مکان تھا ۔ مرزا علی لطف کے شاگرد تھے ۔ سنا ہے صاحبِ فضل و کمال تھے ۔ مثنوی پدماوت[2] جو میر ضیاء الدین عبرتؔ سے ناتمام رہ گئی تھی اس کی آپ نے تکمیل کی اور چند بار چھپ گئی ہے ۔ پدماوت کا اردو دیباچہ لکھا ہے ۔ اس میں کہتے ہیں کہ ۱۲۱۱ھ میں رام پور آیا تھا ۔ صاحبزادہ محمد عثمان و احمد خاں خواہرزادہ اور داماد جناب سید محمد فیض اللہ خاں صاحب بہادر کے ہاں ملازم ہو گیا ۔ چونکہ ان دونوں صاحبوں کو سخن سنجی کا شوق تھا میں بھی غزلیں کہا کرتا تھا ۔ مولوی قدرت اللہ شوقؔ کے ہاں ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ مشاعرے میں شریک ہوتا ۔ ایک روز مولوی صاحب نے فرمایا کہ حکیم میر ضیاء الدین عبرتؔ شاہجہان آبادی ملازم نجو خاں نے پدماوت کو زبان ریختہ میں لکھنا شروع کیا تھا ۔ چہارم حصہ لکھنے پائے تھے کہ مر گئے ۔ اب تم اس کو پورا کرو"۔[3]

---

[2] اس مثنوی کا تاریخی نام "تصنیف دو شاعر" ہے ۔ یہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی ترتیب کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے شائع ہو گئی ہے ۔

[3] حافظ احمد علی خاں شوق : تذکرہ کاملانِ رامپور ، بار اول ، ہمدرد پریس دہلی ، ۱۹۲۹ء ، ص ۳۰۱ ۔

عبرت[1] نے اس مثنوی کے بارہ سو اشعار کہے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ عشرت نے ڈیڑھ سال میں ساڑھے تین ہزار اشعار کہہ کر اسے مکمل کیا۔[2] بقول شیفتہ عشرت صاحبِ دیوان شاعر ہیں لیکن ان کا دیوان نظر سے نہیں گزرا۔[3] ان کے اشعار میں وسعتِ تخیل نہیں۔

نمونۂ کلام:

بلسانِ جامِ خالی پھوڑ ڈالوں چشمِ پرخوں کو ۔ نہ دیکھوں گر صراحی دار اس مخمور کی گردن

شبِ وصال میں دل پر قلق ابھی سے ہے ۔ سحر کا دور مرا رنگ فق ابھی سے ہے

میں لکھ چکا ہی نہیں حالِ دل کہ اسکی طرف ۔ ہوائے شوق میں اڑتا ورق ابھی سے ہے

ہنوز دفن ہوا بھی نہیں ترا بسمل ۔ کہ زلزلے میں زمیں کا طبق ابھی سے ہے

کسی نے شام کے آنے کو کیا کہا عشرت ۔ کہ جھوٹی آپ کے منہ پر شفق ابھی سے ہے

غیروں سے ہنسا وہ جو مرے سامنے عشرت ۔ کچھ بس نہ چلا دیکھ کے آنسو نکل آئے

عشرت کو عبرت کے مقابلے میں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی جیسا کہ کتاب کے آخر میں تحریر ہے:

روز مرہ قدیم میں کتاب لاجواب ہے، ہر شعر انتخاب ہے جس جگہ کاتبوں سے کچھ رہ گیا تھا صحیح کیا ترکیب و بندش قدیم میں تصرف مناسب نہ جانا اسے ویسے ہی رہنے دیا تاکہ اس زمانے کی زبان لوگوں کو معلوم رہے کوئی روز مرہ جدید نہ کہے[4]

---

[1] نواب محبت خاں کے شاگرد تھے۔

[2] یہ مثنوی ۱۲۱۱ھ میں تمام ہوئی ملک محمد جائسی کی پدماوت بھاشا سے اردو میں کئی شعراء نے منتقل کی ان میں غلام علی دکنی، سید محمد فیاض ولی، سید محمد خاں عشرتی، ضیاء الدین عبرت، غلام علی عشرت اور محمد قاسم بریلوی شامل ہیں۔ عبرت و عشرت نے اس مثنوی کو شمع و پروانہ کے نام سے منظوم کیا۔

[3] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ: "گلشن بے خار"، ترجمہ و حواشی، محمد احسان الحق فاروقی، طبع اول، کراچی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۳۔

[4] بحوالہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری: "اردو کی منظوم داستانیں"، طبع اول، کراچی، انجمن ترقی اردو، ص ۱۰۱۔

نواب محمد یار خاں امیرؔ کی محفلِ سخن ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء تک آب و تاب سے جاری رہی لیکن پھر درہم برہم ہوگئی، کیونکہ امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے فرزند نواب ضابطہ خاں کو شاہ عالم ثانی اور مرہٹوں کی فوج کے مقابلے میں سکرتال کے مقام پر شکست ہوئی اور یہ خبر عام ہوگئی کہ مرہٹے روہیل کھنڈ میں داخل ہونے والے ہیں۔ اس وقت مرہٹے ہنگامہ آرائی میں مشہور تھے لہٰذا حفظ ماتقدم کے طور پر آنولہ اور بریلی کے عوام و خواص پہاڑ کے دامن میں چلے گئے اور اس افراتفری میں ٹانڈہ کی محفل بھی اجڑ گئی نہ سخن سنج ہی رہے نہ ان کے مربی۔ اس صورتِ حال کو مصحفیؔ نے اس طرح بیان کیا ہے:

اے مصحفیؔ میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو۔ بن بن کے کھیل ایسے اکثر بگڑ چکے ہیں۔

یہ ذکر ان شعراء کا تھا جو خاص طور پر نواب امیرؔ کی سرکار میں ملازم تھے لیکن روہیل کھنڈ میں اس مخصوص طبقے کے علاوہ بھی آنولہ، بریلی اور اس کے گرد و نواح میں چند دیگر شعراء بھی جمع ہوگئے تھے اور یہ سخنور اپنے اپنے طور پر اپنی شاعری کو جِلا دے رہے تھے۔ روہیل کھنڈ کے اس دور کے چند اور شعراء کا مختصر احوال درج کرتے ہیں تاکہ مزید ادبی ذوق کا پتہ چل سکے۔

عشقی مراد آبادی

عشقیؔ تخلص کرتے تھے۔ مصحفیؔ نے انھیں آنولہ میں دیکھا تھا اور انھیں وہ ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مصحفیؔ تذکرہ ہندی میں تحریر فرماتے ہیں:

"فقیر اورا در آنولہ دیدہ بود شعرے از و بہ خاطر است"۔[1]

کوئی تو ہے گل چہرہ کوئی سرو رواں ہے۔ دیکھا تو یہاں ایک سے ایک آفتِ جاں ہے

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو بھی عشقیؔ کے متعلق اور کچھ معلومات نہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

"بجز اس کے کہ مراد آباد کے رہنے والے تھے ان کا مزید حال معلوم نہ ہو سکا"[2]

پھر نمونۂ کلام میں مندرجہ بالا شعر تحریر کیا ہے

---

[1] غلام ہمدانی مصحفیؔ: "تذکرۂ ہندی"، مرتبہ مولوی عبد الحق، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء، ص ۵۲
[2] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ: "گلشنِ بے خار"، ترجمہ و حواشی، محمد احسان الحق فاروقی، طبع اول، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۲ء، ص ۳۲۰ ۔

عظیم

عظیم سے متعلق شیفتہ نے لکھا ہے:

"ان کا نام اور حال معلوم نہیں نمونۂ کلام یہ ہے:"[1]

کچھ نگہ میں نہیں آتا ہے بجز جلوۂ یار - جبکہ ہم دل میں عظیم اپنے نظر کرتے ہیں

مصحفی نے انھیں آنولہ میں دیکھا تھا۔ مصحفی کے تذکرۂ ہندی کے مطابق

"جوانے بود سپاہی پیشہ یک غزل خود در آنولہ پیش فقیر خواندہ بود

سہ شعر از او انتخاب اعتماد الیست"[2]

کارواں اشک کا ہوتا ہے رواں آنکھوں سے - تم کو بھی آہ و فغاں ہم یہ خبر کرتے ہیں

کوئی اگر تم میں سے چلتا ہے تو آجائے شتاب - ورنہ اب یار کوئی دم میں سفر کرتے ہیں

کچھ نگہ میں نہیں آتا ہے بجز جلوۂ یار - جب کہ ہم دل میں عظیم اپنے نظر کرتے ہیں

مولوی قدرت اللہ قدرت

مولوی قدرت اللہ قدرت کی ولادت موضع "موی" میں ہوئی۔ سکونت ایک طویل عرصے تک رامپور میں رہی قیام مختلف وقتوں میں آنولہ، پیلی بھیت، بدایوں بسولی وغیرہ میں بھی رہا ہے[1] قدرت قیام الدین قائم چاندپوری کے شاگرد تھے۔

تذکرۂ ہندی میں مصحفی نے لکھا ہے:

"مولوی قدرت اللہ قدرت مؤلف تذکرہ ہندی گویاں کہ بالفعل

در رامپور استقامت دارد روزے دیدہ بود از دست"[2]

نمونۂ کلام:

لاکھوں جلائے مردہ صد سالہ آن میں - فیض دم مسیح ہے اس کی زبان میں

انصاف بھی ضرور ہے یہ ظلم تا کجا - کتنوں کے گھر تو جاتے رہے امتحان میں

نکلی تھی رات دل سے مرے بے دریغ آہ - ہنگامہ ایک پڑ گیا ہفت آسمان میں

۱۔ گلشن بے خار، ص ۳۲۵ ۔ ۲۔ (تذکرہ ہندی، ص ۔ ۱۵۲)

۱۔ تاریخ قائم چاند پوری [illegible] (قلمی) [illegible] رامپور، ترجمہ و تلخیص از احمد علی خاں شوق، اورینٹل کالج میگزین جلد ۷ شمارہ [illegible]

[illegible] ۱۹۳۱ء

مراد علی حیرتؔ مراد آبادی

مراد علی نام، حیرتؔ تخلص کرتے تھے فنِ شعر و سخن میں انھیں خاصی شہرت ملی ۔ میر حسنؔ کے مطابق طبع رسا رکھتے تھے ۔ ان کا قیام آنولہ میں رہا ۔ مصحفیؔ ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

> متغیر او را در اوان آبادی کٹھیر روزے در آنولہ دیدہ بود ۔ شعر را بہ پاکیزگی می گفت ۔ در ہماں ایام شنیدم کہ بطرف کوہ برائے کارے حسب ایمائے رئیسے رفتہ بود کہ آفتاب زندگیش در ہماں کوہ بغروب نہادہ ۔

نمونۂ کلام :

سمجھ کے دیکھا تو بیجا ہے سب گلہ دل کا ۔ کہ چشم تر نے ڈبویا ہے معاملہ دل کا

یہ اشک و آہ ہے شورِ جنوں ہے وحشت ہے ۔ عجب جلوس سے جاتا ہے قافلہ دل کا

کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر ۔ مری بغل میں چھلکتا ہے قافلہ دل کا

کیا قافلے یاروں کے آگے کہیں ٹھہرے ہیں ۔ آوازِ جرس کم ہے یا کچھ ہمیں بہرے ہیں

رنگینؔ

ہندو شعراء میں دیوان مان رائے کے فرزند بلاس رائے رنگینؔ ایک معروف شاعر گزرے ہیں ۔ میر حسنؔ ان کے متعلق لکھتے ہیں :

> لالہ بلاس رائے المتخلص بہ رنگینؔ خلف راجہ مان رائے دیوان دارالمہام پسر محمد علی روہیلہ است طبع موزونے دارد، ہر جا کہ باشد سلامت باشد از وست :

اس مصیبت سے جو تو گھر سے نکالے ہے مجھے ۔ یہ تو بتلا میں بھلا جاؤں کدھر آخر شب

میر عوض علی مدعاؔ شاہجہان آبادی

: نواب محبت خاں کے بڑے بھائی نواب عنایت خاں کی سرکار میں ملازم تھے اور کچھ عرصے ان کے ساتھ ہی بریلی میں رہے ۔ محبت خاں کی شادی پر مشہور قصیدہ لکھا ۔ میر حسنؔ نے اس قصیدے کے بارے میں فرمایا " الحق خوب گفتہ است " نواب محبت خاں کے بارے میں جو قصیدے لکھے گئے وہ ہم نے اس مقالے کے ضمیمہ اوّل میں دیے ہیں ان میں میر عوض علی مدعاؔ کا قصیدہ بھی شامل ہے ۔ اس کا مطلع ہے :

بسکہ ہے یاد دلِ خستگاں در پئے آزار فلک ۔ متصل چوٹ کے [illegible]

نواب حافظ رحمت خاں کی اولاد میں نواب محبت خاں صاحب دیوان شاعر تھے اردو، فارسی، عربی اور پشتو میں شاعری کرتے تھے انکے اردو کلام، مثنوی مسمّی بینوں اور انکی پشتو فارسی لغت پر آئندہ ابواب میں تفصیل سے بحث کی جائے گی کیوں کہ ہمارے مقالہ کا موضوع ہی یہ شخصیت ہے۔

نواب اللہ یار خاں[۱] ۱۷۵۱ تا ۱۸۳۲ء ایک ادب پرور رئیس تھے ان کی ایک پشتو لغت مسمّی بہ عجائب اللغات رضا لائبریری رامپور اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے[۲]۔ نواب مستجاب خاں[۳] ۱۷۵۸ء تا ۱۸۳۲ء عربی فارسی اور پشتو زبان کے ماہر اپنے زمانے کے بہت بڑے ادیب تھے آپ نے اپنے والد حافظ رحمت خاں اور خاندان کے حالات میں ایک کتاب "گلستانِ رحمت"[۴] لکھی ہے فارسی زبان میں یہ کتاب باعتبار صحت و واقعات، زبان و انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ جنگ سکرتال کے بعد نواب محمد یار خاں امیر کی محفلِ سخن درہم برہم ہو گئی، نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کی مشترکہ فوجوں سے حافظ رحمت خاں کی فوج کا مقابلہ ۲۲ اپریل ۱۷۷۴ء کو کٹرا میران پور کے مقام پر حافظ رحمت خاں شہید کر دیے گئے اس کے ساتھ ہی روہیلہ سرداروں کی ادب نوازی کا سنہری دور اختتام پذیر ہوا۔

نواب محبت خاں اپنے والد کی شہادت کے بعد اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ قید کر لیے گئے دو سال قید کے بعد انہیں انگریز وظیفہ خوار کی حیثیت سے لکھنؤ منتقل ہونا پڑا اور جو شمع ادب بریلی اور روہیل کھنڈ کے دوسرے علاقوں میں روشن تھی وہ لکھنؤ میں منور ہوئی۔

۱؎ نواب محبت خاں کے چھوٹے بھائی، حافظ محمد یار خاں کے حقیقی بھائی تھے۔ عالم و محقق شخص تھے۔

۲؎ سید الطاف علی بریلوی نے حیاتِ حافظ رحمت خاں میں تحریر کیا ہے کہ اب یہ لغت دستیاب نہیں ہوتی۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری کے کیٹلاگ کے مطابق یہ لغت انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔

۳؎ نواب مستجاب کی اولاد میں نواب محمد عبدالرزاق خاں صاحبِ تصنیف تھے لغت میں ان کا دیوان موجود ہے۔

۴؎ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے ذاتی کتب خانے میں یہ کتاب موجود ہے۔

نواب محمد یار خاں امیر[1]، قیام الدین قائم رامپور چلے گئے اور رامپور ہی میں انتقال کیا مصحفی لکھنؤ پہنچے، قدرت اللہ قدرت بھی رامپور میں قیام پذیر ہوئے۔ دیگر بہت سے شعراء بھی جنگِ روہیلہ کے بعد نواب فیض اللہ خاں نواب رامپور کے زیر سرپرستی چلے گئے۔ اس علاقہ میں بریلی سے آنے والے شعراء کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بریلی میں میر غلام علی عشرت (شاگرد لطف) ایک غزل گو، مثنوی نگار، داستان نویس، صاحب علم و فن شاعر تھے انکی سرپرستی نواب فیض اللہ خاں کے داماد نواب محمد عثمان خاں نے کی[2]۔

ہم نے روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کے اس دور کے شعراء کے بارے میں تحریر کیا جو ۱۷۷۴ء سے قبل اس علاقے میں بساطِ علم و ادب بچھائے ہوئے تھے۔ حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد شعر و سخن کی جو بنیاد پڑی وہ دربارداری سے مستغنی تھی، ان کے صاحبزادوں میں سے جو بریلی میں رہے وہ بھی صاحبِ علم و فن تھے ان میں نواب اللہ یار خان، نواب مستجاب خاں بہت مشہور ہوئے[3] - حافظ رحمت خاں کے پوتوں میں نواب سعادت یار خاں عبد العزیز خاں عزیز، نیاز احمد خاں ہوش، نواب ظفریاب خاں راسخ، نواب حیدر حسین خاں حیدر اور نواب بہادر خاں[4] معروف معروف شاعر گزرے ہیں۔

نواب محبت خاں محبت سے خاندانِ حافظ رحمت خاں کی شاعری کا ایک سنہری باب منسلک ہے لیکن چونکہ یہ ۱۷۷۴ء کے بعد لکھنؤ چلے گئے، نواب شجاع الدولہ اور پھر نواب آصف الدولہ، نواب سعادت علی خاں کے دربار سے منسلک رہے لہٰذا ان کی شاعری پر تبصرہ کرنے سے قبل لکھنؤ میں علم و ادب اور معاشرتی ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہوگی۔

---

[1] بانی روہیل کھنڈ نواب علی محمد خاں کے صاحبزادے اور نواب فیض اللہ خاں والیٔ رامپور کے چھوٹے بھائی تھے۔

[2] ڈاکٹر وسیقہ (؟) حسین ادیب: "روہیلوں کے دور میں اردو شاعری کا فروغ"، معارف نمبر ۲، جلد ۹۶، ص - ۱۵۱

[3] حافظ محمد یار خاں کے صاحبزادے مولف "گل رحمت"

[4] نواب بہادر خاں شہید نواب محبت خاں کے بھتیجے اور گورنر بریلی نواب ذوالفقار خاں کے فرزند تھے۔ سخن شعر کے مصنف عبد الغفور نساخ کے مطابق آپ صاحب دیوان شاعر تھے - سید مصطفیٰ علی بریلوی نے نواب بہادر خاں شہید" تصنیف میں ان کی ایک غزل بہ تشبیہ سخن کے حوالے سے شائع کی ہے جسکا مطلع ہے - تا حشر اب خیال زمیرا گریہ کا دل - تو اس کو مل گیا تو میرا کیا گر گیا دل

انکی ایک اور تصنیف "منتخب العلوم" [illegible]

نواب محبت خاں محبتؔ نے لکھنؤ میں رہ کر علم و ادب کی جو شمع فروزاں کی اس کی تابانی میں اضافہ کرنے کے لیے ان کے صاحبزادوں، پوتوں اور پرپوتوں نے قابلِ قدر حصہ لیا۔ بیٹوں میں محمد منصور خاں مہرؔ[۱]، محمد مقیم خاں مقیمؔ، شاہ عالم خاں عالمؔ[۲]، پوتوں میں محمد حسین خاں ضیاؔ، احمد حسین خاں جوشؔ، محمد سلیمان خاں[۳] اسدؔ اور پرپوتوں میں عابد علی خاں خورشید، محمد علی خاں قمرؔ اچھے شاعر و ادیب گذرے ہیں۔

۱۔ سخن شعرا کے مطابق: "مہرؔ تخلص نواب منصور خاں خلف نواب محبت خاں تخلص باشندہ لکھنؤ شاگرد جرأت صاحب دیوان گذرے"۔ سے نہ خمار مئے اندوہ سے چھوٹے وہ آنکھ جو نشۂ عشق ہو وے جسے بیہوش وہ آنکھ (خورشید ہو گردوں یہ بام) سے خطا نہ ہو دل کی، باغ دل دور کی راہ سے شغل ہے بت آگ بجھانی میرے دل کی۔ خورشید قیامت ہے نشانی میرے دل کی (کیا یہ خوب ہے) بند کانوں سے جن کر دیے ہیں گو ... افسانہ اللہ کے سوا شغل نہیں) اور۔ دشمن ہے یہ شباب جوانی میرے دل کی

۲۔ تذکرہ ریاض الفصحا کے مطابق: نواب محبت خاں کے دونوں بیٹے شاہ عالم خاں عالمؔ اور منصور خاں مہرؔ بھی شاعر تھے۔ شاہ عالم خاں عالم فارسی میں شعر کہتے تھے اور اپنے والد سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ منصور خاں مہرؔ اردو میں شعر کہتے تھے، جرأت کے شاگرد تھے۔

۳۔ تاریخ افغانستان "موسوم بہ نقش سلیمانی" کے مؤلف۔ نواب محبت خاں کے صاحبزادے محمد موسیٰ خاں کے بیٹے تھے۔ نقش سلیمانی خاندان حافظ رحمت خاں کے بارے میں ایک مستند تاریخ ہے جو اردو میں تحریر کی گئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم (کراچی) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اودھ اور نوابانِ اودھ

۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء تا ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۶ء

نام	از		تک
سعادت خان برہان الملک	۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء	تا	۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء
دختر — ابوالمنصور خان صفدر جنگ	۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء	تا	۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء
نواب شجاع الدولہ	۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء	تا	۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۵ء
نواب آصف الدولہ	۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۵ء	تا	۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷
وزیر علی	۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء	تا	صرف چار ماہ
سعادت علی خاں	۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸	تا	۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء
غازی الدین حیدر	۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴	تا	۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء
نصیر الدین حیدر	۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء	تا	۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۸ء
امجد علی شاہ	۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء	تا	۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۶ء

علمی و ادبی
لکھنؤ کا ماحول

نواب محبت خاں اپنے والد نواب حافظ رحمت خاں کی شہادت ۱۷۷۴ء
کے بعد لکھنؤ میں انگریز وظیفہ خوار کی حیثیت سے رہنے لگے تھے۔ انہیں یہ وظیفہ نواب
وزیر اودھ کے توسط سے ملتا تھا۔ نواب موصوف کی تمام شعری و نثری تخلیقات قیامِ لکھنؤ ہی
کے دوران منظرِ عام پر آئیں۔ اس دور میں لکھنؤ کا سیاسی، معاشرتی اور ادبی ماحول کس طرح
کا تھا جو محبت خاں کی ادبی تخلیقات پر بھی اثر انداز ہوا ہوگا؟ یہ جاننا اس لیے بھی ضروری ہے
کیونکہ اس کے پس منظر میں وہ محرکات بھی کارفرما رہے ہونگے جنہوں نے ایک جانب تو
دلبستانِ روہیل کھنڈ سے انہیں یکسر جدا نہیں ہونے دیا اور لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی اپنا
منفرد رنگ قائم رکھا البتہ بعض تصنیفات میں یہ بھی ثابت کیا کہ محبت خاں لکھنؤ دلبستان شاعری
کی نمائندگی کر سکتے ہیں:۔

نواب شجاع الدولہ ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء کو اودھ میں مسند نشیں ہوئے اس وقت
تختِ دہلی پر محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ براجمان تھے[۱] یہ پورے چھ سال بھی حکومت نہ کر پائے
کہ اہلِ دربار کی سازش کا شکار ہوئے۔ بعض امرائنے انھیں اندھا کر دیا اور شاہزادہ معظم کے
ایک پوتے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا لیکن انکی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ
نہ تھی دہلی میں طوائف الملوکی کا عالم تھا، جسکی خبر افغانستان پہنچی تو نادر شاہ کے جانشین
احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندوستان پر لشکر کشی کی۔ ابھی دہلی نادر گردی سے سنبھلنے نہ پائی
تھی کہ اسے دوبارہ جی بھر کر لوٹا گیا۔ دہلی میں ایسے غیر یقینی حالات پیدا ہوئے کہ بڑے
بڑے مستقل مزاج افراد کے قدم ڈگمگانے لگے۔ جو لوگ اب تک دہلی سے نکلنے کا نام تک
نہ لیتے تھے اب وہ بھی دہلی سے نکلنے پر مجبور ہو گئے[۲] اور اودھ کا رخ کرنے لگے جہاں نواب

---

[۱] احمد شاہ ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء تخت دہلی پر متمکن رہے۔

شجاع الدولہ حکمران تھے ۔ اودھ کے علاقے میں ترک وطن کر کے آنے والوں میں دیگر اہل ہنر کے ساتھ چند شاعر بھی تھے ان شعراء میں اشرف علی فغاں، خان آرزو سید محمد میر سوز، مرزا رفیع سودا، خواجہ حسن حسن، شیخ علی ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خان انشا، میر جعفر علی حسرت، بقا اللہ خاں بقا، مرزا حیدر علی حیران، قلندر بخش جرأت فاخر مکیں، میر ضاحک، ان کے صاحبزادے میر حسن دہلوی، میر قمر الدین منت، میر شیر علی افسوس، میر ضیاالدین ضیا شامل ہیں[1] ۔

نواب شجاع الدولہ نے شعراء کی قدر دانی ضرور کی لیکن وہ شعراء کی بھرپور دلداری نہ کر سکے کیونکہ ان کے سیاسی حالات ناسازگار رہے، وہ دور عاشقانہ شاعری کا تھا جس کے لیے سکون و اطمینان، مال و دولت عیش و عشرت کی فراوانی درکار تھی شجاع الدولہ کا یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا انتہائی پُر آشوب دور تھا۔ ایک جانب دہلی کی عظیم سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، دوسری جانب ہندوستان کے طول و عرض میں روز بروز انگریزوں کا تسلط بڑھتا جا رہا تھا، تیسری جانب مرہٹے پورے ملک میں دندناتے پھر رہے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی سرزمین سے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیں ۔ اسی اثنا میں افغانی بھی بار بار لشکر کشی کرتے رہے ۔ ان حالات میں شجاع الدولہ کس طرح شعر و سخن کی محفلیں جما سکتے تھے ۔ ۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی روز افزوں قوت توڑنے کے لیے پانی پت کے میدان میں آئے تو شجاع الدولہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور پانی پت کے میدان میں وہ مشہور تیسری جنگ ہوئی جس نے ہمیشہ کے لیے مرہٹوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا[2] ۔

---

[1] ان میں سے چند شعراء شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد پہنچے اور بعض شعراء نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ پہنچے ۔

[2] اس جنگ کی فتح کو نواب بنگش خاں کے بڑے بھائی نواب عنایت خاں سے بھی منسوب کیا جاتا ہے ۔

۱۷۶۴ء میں محمد قاسم ناظم بنگالہ اور انگریزوں کے درمیان بکسر میں جنگ
چھڑی، نواب شجاع الدولہ محمد قاسم کے ساتھ انگریزوں کے مقابلے میں آئے جس میں انھیں
شکست ہوئی اور پچاس لاکھ روپیہ کا تاوان انگریزوں کو دینا پڑا۔ ان سے ایک معاہدہ
بھی کرنا پڑا جس کی رو سے انگریز ریذیڈینٹ دربار اودھ میں مقرر ہوا۔ کانپور اور
فرخ آباد میں انگریز چھاؤنیاں قائم کی گئیں اور ان چھاؤنیوں کے اخراجات چوبیس
لاکھ روپے سالانہ نواب ہی کے ذمے لگائے گئے۔[1]

۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ پر چڑھائی کی اور انگریز فوج
کی مدد سے روہیل کھنڈ کو تاراج کر دیا اور اپنے محسن حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں
کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگا۔ حافظ کے اہل خاندان کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔
لیکن وہ خود روہیل کھنڈ کی فتح کی بہار نہ دیکھ سکا، ایک سال کے اندر ہی دنیا سے رخصت
ہوا۔

خان آرزو کو شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ نے دہلی سے بلوایا تھا
انہیں نہایت عزت و توقیر کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔ سرزمینِ اودھ میں شاعری کا بیج ان ہی
کا بویا ہوا ہے۔ خان آرزو شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے بعد چار سال زندہ رہ کر ۱۷۵۶ء
میں رحلت کر گئے۔[2] میر ضاحک اپنے بیٹے میر حسن کے ساتھ شجاع الدولہ کے عہد میں
فیض آباد آکر نواب سالار جنگ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے اور اپنے بیٹے کو
سالار جنگ کے صاحبزادے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت پر مامور کرا دیا، آپ آخر
عمر تک یہیں رہے نواب آصف الدولہ کے عہد میں ان کا انتقال ہوا۔

---

۱ محمد اعظم خاں: "اودھ میں اردو شاعری کی ابتدا:" مجلہ عثمانیہ، جلد ہشتم، شمارہ سوم اور چہارم ص - ۶۵
۲ محمد اعظم خاں: " " " " ص - ۶۶

سودا ۱۷۷۳ء میں فیض آباد آئے یہ شجاع الدولہ کا آخری دور تھا۔[1] لیکن آصف الدولہ کے دورِ حکومت میں ان کا زیادہ عرصہ بسر ہوا، اب اس عہد کے تین مشہور شعراء رہ گئے۔ یعنی سوز، ضیاء اور فغاں ان میں سے کوئی بھی فیض آباد میں مستقل طور پر نہ رہ سکا اور دوسرے علاقوں کو عازمِ سفر ہوئے۔ اشرف علی فغاں کے بارے میں محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کے ہاتھ سے ان کا کپڑا جل گیا اور وہ ناراض ہوکر پٹنہ چلے گئے۔ دراصل سبب صرف یہی نہیں رہا ہوگا بلکہ وہی نامساعد حالات تھے جن کی وجہ سے اودھ کے علاقے سے یہ عظیم شعرا دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے، کوئی ان کی بہتر طور پر قدر دانی نہ کر سکا۔

شجاع الدولہ نے اہلِ علم کی سرپرستی کی لیکن وہ غیر مستحکم سیاسی حالات کا شکار رہا، شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ نے اپنے نئے دور کا آغاز کیا۔ شجاع الدولہ کے دور کی ادبی تاریخ سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے کہ اس دور کی شاعری کو پوری طرح دربار کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی۔ آرزو، ضاحک اور میر حسن آخر وقت تک اودھ میں رہے لیکن صرف سالار جنگ کی فیاضیوں کے سہارے جیا کیے۔ ان کی حوصلہ افزائی میں شجاع الدولہ کا بہت ہی کم حصہ رہا، اسی لیے اس دور کی شاعری میں رزمیہ مشاغل کا ذکر تک نہیں ملتا کیونکہ وہ شاعری ایسے قدر دانوں کے سایۂ عاطفت میں پلی جو اس زمانے کی سیاسی الجھنوں سے دور اطمینان و فراغت، لطف اور مسرت کی زندگی گزار رہے تھے یعنی اس دور کی شاعری کو سالار جنگ کی یادگار کہا جا سکتا ہے۔

۱۷۶۵ء کے عہد نامے کے بعد سے انگریز اودھ کی فوجی سرگرمیوں پر سخت نگرانی کرنے لگے تھے شجاع الدولہ آخر وقت تک اپنی فوجی قوت برقرار رکھنے

---

[1] شجاع الدولہ، سودا کی اتنی عزت کرتے تھے کہ انہیں برادرِ من، مشفقِ من لکھتے تھے۔

میں کامیاب ہوئے۔ ۱۷۷۵ء کے بعد جب نواب آصف الدولہ نواب اودھ مقرر ہوئے تو وہ کیونکہ شجاع الدولہ کی طرح چالباز اور سپاہی منش نہیں تھے، انگریز نے انہیں آسانی سے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیا۔ دربار کا رنگ بالکل بدل گیا اور جو روپیہ برہان الملک اور شجاع الدولہ کے عہد میں قلعوں کی تعمیر و ترمیم پر صرف ہوتا تھا، شہر کی آرائش و زیبائش پر صرف ہونے لگا اور جو وقت فوجی اصلاحات اور تنظیم پر خرچ ہوتا تھا عیش و عشرت کے جلسوں پر صرف ہونے لگا۔

نواب آصف الدولہ اور ان کی ماں میں رنجش ہوئی جس کی وجہ سے آصف الدولہ نے فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔[1] دوسری وجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ اپنی ماں کی موجودگی میں عیش و عشرت اور من مانی نہیں کر سکتے تھے لہذا اربابِ فکر نے یہ رائے دی کہ لکھنؤ آباد کرنا چاہیئے۔ آغا مہدی تاریخِ لکھنؤ میں رقمطراز ہیں کہ آصف الدولہ نے دنیائے لکھنؤ کا باوا آدم بن کر ویران زمین کو بسایا علم و حلم شجاعت و تہور دولت و رضاعت ان کی اولاد بن کر پھیلی اور تہذیب لکھنؤ کا آوازہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا اور یہاں کے معاشرہ میں وہ صلاحیت پیدا کر دی کہ دنیا تقلید پر فخر کرتی ہے۔

آصف الدولہ نے انگریزوں کے مشورے سے فوج کم کر دی اس صلہ میں انہوں نے روہیل کھنڈ پر ان کا قبضہ کرا دیا اس سے دولت کی افراط ہو گئی اور انہیں دل کھول کر روپیہ خرچ کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کے جتنے مشاغل تھے ان سے رعایا پر زر و جواہر کی گھٹائیں جھوم جھوم کر برسیں۔ لکھنؤ میں خوشحالی نے

---

[1] چو ملال از آصف و مادر شدہ - لکھنؤ آباد افزوں تر شدہ
سید آغا مہدی لکھنوی: "تاریخ لکھنؤ"، طبع اول، کراچی، ۱۹۷۶ء حواشی صفحہ ۷۶

آصف الدولہ کی ایک نگاہِ کرم سے مفلس لوگ دولت مند بن گئے۔ جہلا اور خاص طور پر اہلِ ہنود جو حکمران کو "دلیو" کہتے تھے انکی زبان پر یہ محاورہ زبان زدِ عام ہو گیا۔

"جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ" اس شہر کو اس قدر وسعت دی کہ باون گاؤں ملا کر اسے بڑھایا ایرانی طرز کے چار سو باغ بنوائے جن میں عالیشان عمارتیں، حوض، فوارے، روشیں، کیاریاں اور درختوں کی قطاریں سب ہی کچھ تھا یہی وجہ تھی کہ انگریز لکھنؤ کو "GARDEN OF INDIA" کہتے تھے۔

میر علی لطف کے مطابق آصف الدولہ ہر روز ایک نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے تھے۔ اسراف و اخراجات کے ضمن میں مولانا شررؔ کی تحریر سے ایک اقتباس دیکھئے[1]

وزیر علی خاں کی شادی میں انہوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ارض کے تمام واقعات سے بڑھ گیا برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے دولہا جو شاہی خلعت پہنے ہوئے تھا اس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے، محفل طرب کے لیے دو عظیم الشان شامیانے بنوائے گئے تھے جن میں ہر ایک ساٹھ ساٹھ فٹ بلند تھا اور ایسا نفیس و عمدہ و قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ ان دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے تھے۔
آصف الدولہ کی جدت پسند طبیعت نئی نئی راہیں تلاش کرتی تھی شکار کا شوق ہوا تو نشانہ کی ایسی مشق کی کہ شیر ہاتھی اور آرنا بھینسے ایک گولی میں اپنی جگہ سے نہ ہل سکے، شیر اتنے شکار کیے کہ انکی کھالوں کا شامیانہ بنوایا ہاتھی اتنے شکار کیے کہ ان کے دانتوں سے ایک مکان بنوایا جس میں لکڑی کا نام و نشان نہ تھا[2]۔

---

[1] سید محمد باقر شمس لکھنوی: "آصف الدولہ کا عہد اور لکھنؤ کی زبان و شاعری"، نگار پاکستان ۱۹۶۷ء، صفحہ ۳۸۰
[2]

علاوہ ازیں ایک شیشے کا مکان بھی بنوایا تھا اور ان کے دور میں
تعزیہ داری کا ایک نیا باب شروع ہوا، ان کا ایک امام باڑہ
ہندوستان کی مشہور عمارتوں میں سے ہے جس کا رومی دروازہ
باولی، بھول بھلیاں اور لداؤ کی چھت فن کے لحاظ سے سیاحانِ
عالم کو حیرت زدہ کرتی ہے۔

سید محمد باقر لکھنوی مرزا ابوطالب کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں۔

اس عمارت کے اندر دو رویہ دیوار پر قدِ آدم آئینے لگے ہوئے ہیں سونے
چاندی کی گھڑیاں اور جواہرات جڑا ہوا سونے کا آرائشی سامان !!
کثرت سے لگا ہوا ہے چار پانچ سو بلوری جھاڑ چھتوں میں لٹکے ہوئے !!
ہیں اور دو ہزار فرشی جھاڑ زمین پر رکھے ہیں ان میں بے شمار کافوری
شمعیں روشن کی جاتی ہیں جب ان کی روشنی میں طلائی مرصع سامان
آرائش کا عکس پڑتا ہے تو نور کا دریا لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا
ہے۔

لاکھوں روپے کا سامان اور سونے کے تعزیئے یورپ سے تیار ہو کر آتے تھے، یہ تعزیے ساٹھ فٹ چوڑے دو
سو تیس فٹ لمبے اور تریسٹھ فٹ اونچے حال میں رکھے جاتے تھے۔ اس دور میں تعزیہ داری کو اتنی
مقبولیت ہوئی کہ دولت مند ہندوؤں نے عالی شان امام باڑے بنوائے جن میں مہاراجہ جاؤ لال
راجہ ٹکیت رائے، راجہ بلاس رائے، راجہ ہرا، راجہ میوہ رام[1] کے امام باڑے مشہور ہوئے۔

نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ میں عیش و عشرت کی محفلیں سجائیں جبکہ دوسری
جانب دہلی کی سلطنت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی، جنگ جو قوموں نے یورش کی، لوٹ مار

---

[1] راجہ میوہ رام کے امام باڑہ کا سالانہ خرچ تین لاکھ روپیہ تھا۔

کا بازار گرم ہوا رات دن کا سکون جاتا رہا روزگار نایاب ہو گیا اور یہ مثل مشہور ہو گئی "شاہ عالم ثانی نہ چوبیسے پہ توانہ گھڑے میں پانی" -

رام بابو سکسینہ کے مطابق [1]

اس بدامنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر جانے لگے۔ وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ تھے مثلاً میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ انشاؔ وغیرہ انہوں نے دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا جو اس وقت ان کا قدر شناس اور ان کے لیے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدر دانیوں میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔ شعرائے دہلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے۔ سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں وظائف، انعام و اکرام مرحمت ہوئے، نازک مزاجیاں اور بد دماغیاں تک کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر ان ہی اوصاف کی تعریف کی جاتی تھی۔ سلسلہ روابط کو مضبوط کرنے کے لیے نوابان عہد اور امرائے وقت نے اکثر شعراء کو دامنِ دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو اپنا رفیق و مصاحب بنا لیا۔

مولوی عبد الحلیم شرر کے مطابق :۔

اس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے نامور بزرگ لکھنؤ میں آ کر آباد ہونے لگے دلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایسا جوشِ قدر دانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

---

[1] رام بابو سکسینہ : "تاریخ ادب اردو" ، لاہور ، — ص - ۲۸۸

ے

یہی وہ دور تھا جب یہ نوبت پہنچی کہ شاہی خاندان کے افراد بھی لکھنؤ میں آکر آباد ہونے لگے پہلے مرزا جواں بخت شاہ عالم کے ولی عہد لکھنؤ آئے یہ کچھ دنوں رہ کر بنارس چلے گئے پھر ان کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ نے یہیں سکونت اختیار کی ۔ مرزا سلیمان شکوہ کو حکومت کی طرف سے اتنا کچھ ملتا تھا کہ وہ شاہانہ تزک و احتشام سے زندگی بسر کرتے تھے اور بڑے بڑے شعرا انکے دربار سے وابستہ تھے۔[1]

جہاں تک آصف الدولہ کے شعری رجحان کا تعلق ہے، تو یہ تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہونی چاہئیے کہ آصف الدولہ ایک باکمال شاعر اور تمام اصنافِ سخن پر قادر اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کا کلام اس زمانے میں میرؔ و سوداؔ کے کلام کی طرح مقبول و مشہور تھا۔[2] آصف الدولہ کی بیوی دلہن بیگم نواب شمس النساء شرمؔ بھی باکمال شاعرہ اور صاحبِ دیوان تھیں اکثر آصف الدولہ کی غزلوں پر غزلیں کہا کرتی تھیں نواب موصوف کی ایک مشہور غزل :۔

؎ جہاں تیغ اسکی علم دیکھتے ہیں ۔ وہاں سر ہم اپنا قلم دیکھتے ہیں

اس پر شرمؔ نے بھی طبع آزمائی کی تھی ۔ بیگم کی غزل بھی نواب کی ٹکر کی غزل ہے۔

نواب آصف الدولہ	شرمؔ
؎ جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں	خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
وہاں سر ہم اپنا قلم دیکھتے ہیں	اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ... ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں	نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں	نہ آنکھوں میں ہم اپنی نم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے	نگاہِ کرم جس جگہ پر کرے تو
بھلا ہم تو تیری قسم دیکھتے ہیں	ہم اس جا پہ باغِ ارم دیکھتے ہیں

---

[1] سید محمد باقر شمس لکھنوی : "آصف الدولہ کا عہد اور لکھنؤ کی زبان و شاعری" ، نگار پاکستان، اگست ۱۹۷۶ء، ص ۲-۷

[2] " " " " " " " " " "

جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال دل کا
تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ... ہیں

کرم سے ترے شاد و خرم ہیں یہ سب
مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ... ہیں

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے .... ہیں

کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے ... کی
اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے .... ہیں

جہاں آصف الدولہ کے عہد میں دل بہلانے کے لیے مرغ بازی، بٹیر بازی، شطرنج اور چوسر کے عام شوق پروان چڑھے، وہاں رقص و موسیقی کو بھی اتنا عروج ہوا کہ لکھنؤ اس کا مرکز بن گیا۔ طب یونانی کے بڑے بڑے کامل فن جمع ہوئے اور یہ علاقہ یونان کی مثال ہوا۔ بڑے بڑے علمائی کی قدر دانی کی گئی لیکن سب سے زیادہ توجہ شاعری کی جانب مبذول کی گئی۔ یہاں ان شعرا کی فہرست دی جاتی ہے جو دہلی سے اور دوسرے مقامات سے لکھنؤ آئے۔

میر تقی میر۔ اشرف علی خاں فغاں۔ صلاح الدین پاکباز۔ خواجہ حسین علی روشن۔ شاہ محبوب محمد علی راحم۔ میر حیدر علی حیران۔ میر ولی اللہ محب۔ میر محمد حسین منشی۔ کاظم علی جوان۔ میر قدرت اللہ رخصت۔ مرزا اصغر علی حسرت۔ میر محمد یعقوب عیاش۔ مرزا اکمل علی ثمر۔ رائے سرپ سنگھ دیوانہ۔ شیخ عبد الرحیم رعنا۔ میر قمر الدین منت۔ میاں عبد الرحیم زیبا۔ مرزا محمد علی شہرت۔ محمد حیات بیتاب۔ مرزا اسماعیل عشق۔ سعادت یار خاں رنگین۔ مرزا فاخر مکیں محمد علی رستم۔ خواجہ حسن حسن۔ حسن علی خاں یاس۔ میر غلام حسن فرشتہ۔ مرزا شرف الدین وفا۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔ مرزا محمد حسن قتیل۔ انشاء اللہ خاں انشا۔ میر امان اشتد۔ میر شاہ علی خان۔ قیام الدین قائم چاند پوری۔ سلام اللہ تسلیم (کشمیر)۔ میر امام علی۔ محمد خاں آگاہ۔ مرزا صفی الدین صفاتی۔ مرزا اکبر علی مونس، مرزا امامی (ایران)۔

اس فہرست میں ان لوگوں کو بھی شامل کر لیجیے جو نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد

نواب آصف الدولہ نے ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں انتقال کیا ان کے بعد وزیر علیؒ صرف چار ماہ اودھ کے نواب رہے۔ پھر سعادت علی خاں ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء تا ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء تک سلطنت اودھ کے عہدے پر فائز رہے۔ نواب سعادت علی خاں بھی شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور اہل علم کی قدر بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک منشی نے "نوع" کو نو لکھ دیا نواب نے اپنے خاص قلم سے یہ فقرہ تحریر کیا "منشی نو کہ لفظ "نوع" را بطرز نو نوشتہ عین خطا کرد لہذا ہفتاد روپیہ جرمانہ گیرند" اس میں لطف یہ رکھا کہ لفظ "ع" کے ۷۰ عدد ہیں۔ اسی طرح نواب کے قلم سے بھی ایک املا غلط لکھا گیا منشی بھولا ناتھ مہتمم منشی خانہ نے وہ کاغذ حضور میں لاکر عرض کیا کہ آج صحت اس لفظ کی خانہ زاد کو ہوئی کہ اس املا سے درست ہے۔ نواب نے اپنی نسبت اس طرح سے جرمانہ کیا کہ منشی خانہ کے جملہ منشیوں کی تنخواہ دو چند ہو گئی۔ ایک خیاط نوکر قدیم نے عرضی اضافہ معاش کی گذاری، نواب نے اس پر دستخط کیے۔

؎ گر زمیں با آسماں روزی ۔ نہ دھندت زیادہ از روزی

انشاء اللہ خاں نواب سعادت علی خاں کے دربار سے وابستہ تھے وہ نواب کی لسانی فصاحت کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ خود انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں جو گل کھلائے ہیں وہ سعادت علی خاں ہی کے دور کی بات ہے۔

نواب سعادت علی خاں سے نواب محبت خاں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ نواب محبت خاں کی بہت عزت کرتے تھے، دربار کے علاوہ محلِ خاص میں بھی آنا جانا تھا لیکن جب نواب سعادت علی خاں نے اپنے فرزندوں کے رشتے محبت خاں کی اولاد سے اور اپنی دختران کے رشتے محبت خاں کے فرزندوں سے کر کے رشتہ داری کا سلسلہ بڑھانے کا ارادہ ظاہر کیا تو نواب محبت خاں نے آنا جانا موقوف کر دیا۔ اس رویہ سے سعادت علی خاں کے شیشۂ دل میں بال پڑ گیا۔ یہ تھا لکھنؤ کا تہذیبی پس منظر جس میں محبت خاں محبت کی شاعری بھی پروان چڑھی، اس پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد یہی تھا کہ نواب محبت خاں کی شاعری پر تبصرہ کرنے قبل اس ماحول کا جائزہ لے لیا جائے۔

بابِ سوم

تصانیف کا تعارف

تعارف دیوان اردو

مثنوی اسرار محبت

ریاض المحبت "پشتو فارسی لغت"

دیوان محبت پشتو

تعارف ▬ دیوان اردو

محبت خاں محبت صاحبِ دیوان شاعر تھے، ان کا دیوانِ اردو انڈیا آفس لائبریری برطانیہ میں قلمی نسخہ کی شکل میں محفوظ ہے اس کی ایک نقل اردو لغت بورڈ میں موجود ہے جو انڈیا آفس لائبریری سے حاصل کی گئی ہے[1]۔ تقریباً دو سو نوے صفحات پر یہ دیوان مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر اوسطاً دس اشعار تحریر ہیں کاغذ کا سائز بڑا ہے اور کتابت صاف اور جلی حرفوں میں کی گئی ہے[2]۔ دیوان میں موجود اشعار و اصناف سخن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

صفحات کی تعداد اشعار	۲۹۰	دو سو نوے	
غزلیات	۲۲۵	دو سو پچیس	
رباعیات	۳۹	انتالیس	
منقبت درشان حضرت علیؑ	۰۱	ایک	چالیس اشعار پر مشتمل ہے
شجرے	۰۲	دو	بہتر اشعار پر مشتمل ہیں۔
مخمس	۹	نو	کل ایک سو پچیس اشعار
تعداد کل اشعار	۲۶۸۵	تقریباً دو ہزار چھ سو پچاسی	

ابتدا حمد و نعتیہ اشعار سے ہوتی ہے۔

ہوتا ہے ابھی حاصل سب کام محبت کا ۔ دے اس کو خداوندا تو جام محبت کا

اک میم کو احمد کی کہتا ہے زیادہ وہ ۔ گو کفر ہو یہ ہے اسلام محبت کا

---

[1] راقم نے اردو لغت بورڈ کراچی سے اس دیوان کی فوٹو اسٹیٹ کاپی حاصل کی ہے۔

[2] اردو کتابت کا وہی انداز اس دیوان محبت میں موجود ہے جو اس دور کے اکثر کاتبوں نے اختیار کیا ہے۔ کتابت اور املا کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ آخر میں کاتب نے اپنا نام اور سن کتابت بھی درج کیا ہے۔

دیوانِ محبت کی ابتدا اور آخر میں انڈیا آفس لائبریری لندن کی مہر ثبت ہے۔ دیوان کے شروع ہونے سے قبل کاتب کی یہ تحریر موجود ہے۔

"بیاض کار نواب صاحب ممتاز الدولہ فخر الملک حسام جنگ مسٹر رچارڈ جانسن صاحب بہادر دام اقبالہ"

آخری صفحہ کی تحریر یہ ہے:۔

"بخط ضعیف العباد بخش اللہ تاریخ دوازدہم شہر شعبان المعظم ۱۱۹۶ھ دیوانِ محبت خانصاحب اتمام پذیر فت"

محبت خان کے اردو دیوان کے حوالے سے ان کی شاعری پر آئندہ صفحات میں سیر حاصل بحث کی جائے گی۔

تعارف

"مثنوی اسرارِ محبت"

سسی پنوں کے قصے پر مشتمل مثنوی "اسرارِ محبت" نواب محبت خاں محبت ولد حافظ رحمت نے ۱۱۹۷ھ میں اس وقت نظم کی جب نواب موصوف لکھنؤ میں انگریز وظیفہ خوار کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس موضوع پر اردو زبان میں یہ پہلی مثنوی تھی۔ فارسی اور پنجابی زبان میں یہ قصہ پہلے بھی نظم کیا جا چکا تھا[1]
اس قصے کا مرکزی خیال پنجابی قصہ سے حاصل کیا تھا[2]۔ یہ قصہ اتنا مشہور ہے کہ اسے پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں یکساں اہمیت حاصل ہے یہانتک کہ پشتو زبان میں بھی اس کے بارے نظمیں ملتی ہیں اور اپنے اپنے علاقوں سے منسوب کر کے کرداروں کے نام اور اندازِ بیان میں تبدیلی کر لی گئی ہے۔

اس مثنوی کو محبت خاں نے ایک انگریز اہلکار مسٹر جانسن کی فرمائش پر منظوم کیا۔

کہ فرمائش ہے یہ اک نکتہ داں کی ۔ شفیق و قدرداں و مہرباں کی

وہ مثلِ جان و عالم جملہ تن ہے ۔ تبھی نام اس کا مسٹر جانسن ہے

"اسرارِ محبت" ۵۶ صفحات[3] پر مشتمل ہے اور اس میں ۵۹۲ اشعار[4] ہیں اور اس میں ۱۱ عنوانات[5] قائم کیے گئے ہیں

---

[1] میر معصوم بکھری نے "حسن و ناز" کے نام سے یہ قصہ نظم کیا۔
قاضی مرتضیٰ سورٹھی نے جو موضع کتیانہ، کاٹھیاواڑ سے تعلق رکھتے تھے، یہ قصہ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں (۱۱۳۰ - ۱۱۶۱) نظم کیا۔ ٹھٹھہ کے ایک شاعر رضائی نے اس مثنوی کو "زیبا و نگار" کے نام سے فارسی میں نظم کیا،
مولانا پیر محمد اودھی نے جو ۱۱۶۰ میں سندھ آئے تھے ۱۱۸۰/۱۷۶۶ء میں اس قصے کو "مہر و ماہ" کے نام سے منظوم کیا۔

[2] ڈاکٹر فرمان فتح پوری: "اردو کی منظوم داستانیں"، اشاعت اول، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۱، ص ۲۰۶

[3] اس مثنوی کے پیش نظر مخطوطہ میں ۲۱ عنوانات قائم کیے گئے ہیں، جبکہ طبع شدہ مثنوی جو کتب خانہ خاص کراچی میں ہے اس میں مع غزل ۱۶ عنوانات ہیں۔

[3] ۵۷ ویں صفحہ پر کاتب اس کی تاریخ کتابت مقام اور اپنا نام وغیرہ تحریر کیا ہے۔

[4] ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ساڑھے چھ سو لکھی ہے جو درست نہیں ہے۔ بلکہ اشعار کی صحیح تعداد ۵۹۲ ہے۔

[5] عنوانات کی ترتیب اور الفاظ میں فرق ہے، جو نسخہ غیر طبع شدہ ہے اور ہم نے قومی عجائب گھر کراچی سے اس کی فوٹو اسٹیٹ حاصل کی ہے یہ دراصل اصل مثنوی سے ہی نقل کیا گیا ہے۔

مثنوی کے آخری شعر کے دوسرے مصرعے سے اس کا سال تصنیف نکلتا ہے ۔

؎ کہی تاریخ اس کی یہ بہ صنعت ۔ عجب قصہ ہے اسرار محبت
۱۱۹۷ھ

مولوی عبدالحق کے ذاتی کتب خانہ کی اس پر مہر موجود ہے اور اس کے آخری یعنی ۵۷ ویں صفحہ پر یہ تحریر موجود ہے ۔

تمت تمام شد مثنوی نواب محبت خاں ولد حافظ رحمت خاں در قصۂ سیپے بتوپے التاریخ دوئم شہر شوال بروز چہار شنبہ بوقت چاشت بدستخط حقیر پر تقصیر لالہ ٹکارام ولد ڈالچند موقوم ساکن اصالت پور چارٹ پرگنہ نزدے مضاف صوبہ دارالخلافت شاہجہاں آباد ۱۲۰۳ ھجری برائے خاطر داشت اخوندزادہ

خود قلمی شد فقط ۔

قاریائے من مکن چندیں عتاب ۔ کہ خطائے رفتہ باشد در کتاب
آں خطائے رفتہ را تصحیح کن ۔ از کرم واللہ عالم بالصواب ۔

اس مثنوی کا کاتب زیادہ پڑھا لکھا شخص معلوم نہیں ہوتا اس کتابت کا قدیم انداز اختیار کیا ہے اور اس کا خط بھی صاف نہیں ۔ اس مثنوی پر سیر حاصل بحث آئندہ ابواب میں کی جائے گی ۔

تعارف

ریاض المحبت (پشتو لغت)

پشتو میں لغت نامے لکھنے کی ابتدا انیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ ایک لغت ان میں ایسی بھی ہے جسے روسی علومِ شرقیہ کے مرکز کے لیے ایک مستشرق گولڈن نیسٹ نے تیار کی تھی اور ۱۷۹۱ء میں سینٹ پیٹرز برگ "لینن گراڈ" سے شائع ہوئی۔ غالباً یہی پشتو زبان کی اولین شائع شدہ لغت ہے۔[1]

مقامی لوگوں میں ہندی النسل پشتون یعنی روہیل کھنڈ کے پشتو محققین اس ضمن میں پہل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان ہی روہیلہ نوابوں کے گھرانے کی لغت سازی کا کام مستقبل کی لغت نویسی کی بنیاد گردانی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حافظ الملک حافظ رحمت خاں روہیلہ شہید کے دو صاحبزادے نواب محبت خاں اور نواب اللہ یار خاں پشتو لغت نویسی کی تاریخ میں تمام مقامی لغت نویسوں سے قبل قابل ذکر ہیں۔ انکے تالیف کردہ دو لغت نامے "ریاض المحبت"[2] اور اس کے چودہ[3] سال بعد انکے چھوٹے بھائی اللہ یار خان نے "عجائب اللغات" لکھ کر اپنی علمی قابلیت کا لوہا منوایا۔

نواب محبت خان نے پشتو فارسی لغت "ریاض المحبت" ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶-۷) میں تالیف کی۔ اس کتاب کے آخر میں ایک فارسی قطعہ کے ذریعے اسکی تاریخ نکالی گئی ہے:-

ایں تحفۂ نسخۂ نو تصنیف شد چو از من ۔ آمد نداز سر سو صد آفریں و رحمت
اتمام سال آں را ہر گہ ز غیب جستم ۔ تاریخ گفت ہاتف "نو نسخۂ محبت"[3]

۱۲۲۱ھ

بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ لغت "سر جارج ھلارو بارلو" کی خواہش پر تالیف کی گئی جو اس دور میں برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کے قائم گورنر جنرل تھے۔ نواب محبت خان نے اس بات کا ذکر خود نہیں کیا۔

۱۔ راورٹی کی لغت کا دیباچہ دیکھیے۔ ۲۔ راقم نے انڈیا آفس لائبریری سے یہ صفحات حاصل کیے ہیں۔

۳۔ نواب اللہ یار خان کی تالیف عجائب اللغات میں یہ واضح طور پر درج ہے کہ یہ جارج بارلو کے لیے دوستی کی سوغات ہے۔

اس لغت کی ابتدا ان حمدیہ و نعتیہ کلمات سے ہوتی ہے :-

ستائش بیکراں و نیایش فراواں نخل بندی را می باید کہ حدائق جہاں را بگلہای بوقلمون و نہالہائے گوناگوں آراستگی و پیراستگی بخشید و حمد بیحد و ثنائی لعبد خالق را می شاید کہ بہ نفحات سحاب مکرمت خویش لا تعد بران خالق مطلق و خالق برحق

"کون و مکاں را سرسبز و شاداب ساختہ چہچہہ عندلیبان چمن حمدیت و نغمۂ طوطیان گلبن الوہیت برنوا کہ درانید ....

اینجا کی پیر صاحب راچہ یارا کہ خامۂ عجز شمامہ خود را در ترقیم صنعت والائش بر صفحۂ قرطاس جادہ دہد و من نحیف ضعیف راچہ توانا کہ دست خود را بنگارش نگارید و لا جرم از ان گلشن لا انتہا گذشتہ بگلزار نعت جناب رسالت مآب خاتم الانبیا زبدۃ الاصفیا خلاصتہ الاتقیا صلعم طبع نیاز طویت را مراغہ برائے مرغزار طرب سعادت سرمدی میگرداند الوف الوف صلواۃ و صنوف صنوف تحلیات ذاکیات بر ارواح طیبہ آنمہر سپہر شریعت و بدر منیر طریقت کہ نوح ہدایت و الائش تیرہ بختان بادیہ ضلالت و تاریک ضمیران سرمایہ جہالت را ضیای ظاہر و باطن ....

اس لغت کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے نواب موصوف فرماتے ہیں

"مصنف این نسخہ را ، روزی در خدمت فیض موہبت اشتیاق درجت کل گلزار فراست سرو جویبار کیاست صاحب و الاسناقب معالی مناصب ظہیر الملک ممتاز الدولہ کرنیل جان کالنس صاحب بہادر صولت جنگ دام الطاف الفاق صحبت بود چند صاحبان نیز مجلس عالت سیدا شدہ تذکرہ علمیت و سخن وری بمیان آمد کہ اکثر سخنوران ۔ دانشوران دہر کتب ہائے فرہنگ لغت را ترتیب دادہ اند مگر احدی از زبان اوران روزگار فرہنگ زبان افغانی کہ بحسن مطالعہ اش توضیح

این زبان منصۂ شہود رسد مرتب نہ کردہ کہ باعث یادگارش بریں خطۂ خاک وہم
بمطالعہ اش موجب افزاح میمنت امتزاج رئیسان نامدار وصاحبان والا اقتدار
کہ اشتیاق سیر کتب بامیدارند در جواب صاحب والا مناقب ممدوح لب بنطق
کشاد کہ اگرچہ در سوالف زمان فرہنگ افغانی بجنس حالش نیز وہان مرتب نکردید
مخلص بہ توضیح قواعد این زبان حق الامکان خواہد کوشید۔

ریاض المحبت کے پہلے حصے میں تمہید یا التعارف ہے جسے مؤلف نے فائدہ کہا ہے پھر کتاب کو بارہ حصوں میں منقسم کیا ہے پہلے حصے میں مشتقات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مشتقات حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب وار لائے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں متفرقات ہیں، اس میں پشتو زبان کے عام اور مروجہ الفاظ کی توضیح و تشریح کی گئی ہے یہ بھی حروف تہجی کی ترتیب سے ہیں۔ "ریاض المحبت" ایک ضخیم کتاب ہے یہ حصوں پر مشتمل ہے صفحات کی کل تعداد ۱۴۵۲ ہے اس میں ابتدائی ۱۱۹۰ صفحات تمہید اور مشتقات کے ہیں۔ اور آخری ۲۶۲ صفحات فرہنگ نامے کے ہیں اس لغت کے تین نسخے انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں[1] ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں بھی موجود ہے[2]۔

"ریاض المحبت" کی ایک نقل رضا لائبریری رامپور میں بھی موجود ہے اس میں ۱۰۱۵ پشتو الفاظ کے معنی فارسی میں بیان کیے گئے ہیں صفحات کی تعداد ۲۶۱ ہے یہ نسخہ ۱۲۴۴ھ میں مکمل ہوا[3]۔ اس لغت کے چند حصے بطور نمونہ آئندہ ابواب میں پیش کیے جائیں گے۔

---

[1] انڈیا آفس لائبریری لندن کے حوالے بعض کتابوں میں غلط لکھے گئے ہیں جبکہ صحیح حوالے اس طرح ہیں۔ 2452, 53, 54 – اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی پشتو اکیڈمی میں بھی موجود ہے۔ ہم نے پشتو اکیڈمی سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ یہ فوٹو نگیٹو ہے جس کو صرف سلائیڈ ویور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

"تعارف"

دیوانِ محبت (پشتو)[1]

نواب محبت خاں کا پشتو دیوان ۳۸۱ صفحات پر مشتمل ہے، یہ دیوان سر جارج کو یزلی کی خدمت میں نواب موصوف نے اپنے دستخطوں کے ساتھ پہلے اکتوبر ۱۸۰۱ء میں پیش کیا تھا۔ اس دیوان میں پشتو غزلیات اور چار بیتی ہیں، چار بیتی صنف شاعری صرف اردو اور پشتو زبان شاعری کی صنف ہے، ورنہ دیگر زبانوں میں یہ نہیں پائی جاتی۔

دیوان کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

العیی آہ و نالہ د محبت را - اور دینیی پر کالہ د محبت را
لکہ گل یغم د عشق مي ځګر خون گړه - داغ بیزرہ لکہ لالہ د محبت را
تشنہ لب د ہیي د ینې عمر نفس یم - پہ کرم لورہ پیالہ د محبت را

---

[1] Catalogue of Pashto Manuscripts by D. N. MacKenzie (1965)

106
Bodleian Ouseley Add 111 - Foll. 381
Size 27.5x18 cm; 12 lines in a page; large and clear Nastalik; c. A.D 1800
Diwan-I-Mahabbat دیوان محبت
The pashto poems of Nawab Mahabbat Xan see No. 57
Begins
الیی .....
The manuscripts is the authors' autograph and was presented to Sir Gore Ouseley at Lucknow, 1 oct A.D 1801.
The Yazals are followed, on fol - 378 a, by two carbeits.

باب چہارم

(۱) محبت کی اردو شاعری

(۲) کلام محبت میں صنائع بدائع

(۳) محبت اور اردو غزل

(۴) رباعیات محبت

(۵) مخمس در منقبت حضرت علی

(۶) مثنوی کا تعارف "اسرار محبت"

(۷) محبت بحیثیت فارسی گو شاعر

نواب محبت خاں محبتؔ کی اردو شاعری

نواب محبت خاں کی اردو شاعری پر تبصرہ کرنے سے قبل ہم یہ دہراتے چلیں کہ نوّاب موصوف ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو علم وادب کی بدولت روہیل کھنڈ میں شہرت رکھتا تھا۔محبت خاں ۱۷۵۰ء میں پشاور کے مضافات میں پیدا ہوئے، ۱۷۷۴ء تک روہیل کھنڈ میں ان کا قیام رہا اور جب وہ لکھنؤ پہنچے تو اس وقت ان کی عمر چوبیس برس سے تجاوز کر چکی تھی، ان کی شاعرانہ صلاحیتیں پختگی کو پہنچ چکی تھیں۔ روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کی تاریخ قدیم ہے جس کا جائزہ ہم نے ایک علیحدہ باب میں پیش کیا ہے۔ جہاں تک محبت خاں کی روہیل کھنڈ میں شاعرانہ اہلیت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ایک قطعہ بطور سند پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان شعراء اور مصاحبین کا مختصر ذکر بھی ہوگا جو اس دور کے نمائندہ شاعر کہلاتے ہیں۔ نواب محبت خاں نے یہ قطعہ اپنے والد نواب حافظ رحمت خاں کی شہادت پر تحریر کیا تھا، عربی زبان میں کہا گیا یہ قطعہ اس بات کی دلیل پیش کرتا ہے کہ محبت خاں روہیل کھنڈ کے قیام کے دوران ہی ایک پختہ گو شاعر بن چکے تھے۔

قطعہ یہ ہے ؎ اذا ماتہ خان النصیر الکبیر ۔ سُئلنا من اللہ تاریخہ

علی سنۃ المصطفیٰ عاملٌ ۔ فقد قال فی جنتی داخلٌ

حافظ رحمت خاں کے زمانے میں بریلی میں شعراء کا اجتماع ہوگیا تھا[1] حافظ الملک اور ان کے معتمد واہل خاندان شعراء اور ادیبوں کی قدر دانی کرتے تھے۔ محبت خاں قیامِ روہیل کھنڈ کے دوران باقاعدگی سے شعر وسخن کی محافل میں اس لیے شریک نہیں ہوتے ہونگے، کیونکہ اس دور میں ان کے والد حافظ الملک حافظ رحمت خاں اکثر میدانِ کارزار میں رہتے تھے، لہذا انہوں نے انتظامی امور کے سلسلے میں، آنولہ سے بریلی اور پھر پیلی بھیت اپنے اہل خانہ اور لواحقین کو کو بھی منتقل کیا تھا۔ محبت خاں کے بڑے بھائی نواب عنایت خاں کے انتقال کے بعد محبت خاں کو بریلی میں سکونت اختیار کرنی پڑی اور وہ بریلی کے صوبیدار و جاگیر دار مقرر ہوئے۔

---

[1] ڈاکٹر لطیف حسین ادیب: "چند شعرائے بریلی"، طبع اوّل، ایڈیشن اوّل، لکھنؤ، تنویر پریس — ۱۲

قیامِ بریلی کے دوران نواب محبت خاں کے شاعرانہ ذوق کو جلا ملی، خواجہ حسن جو کہ دہلی کے مشہور درویش تھے محلہ پہاڑ گنج سے ترک سکونت کرکے بریلی چلے آئے تھے[1] ان کا سلسلہ نسب خواجہ کمال چشتی مودودی سے ملتا تھا۔ محبت خاں بھی اسی سلسلہ سے نسبت رکھتے تھے لہٰذا خاندانِ روہیلہ میں خواجہ حسن کی بے حد قدر و منزلت تھی، وہ ایک بذلہ سنج شخص، پُرگو شاعر، لطیفہ گوئی، موسیقی اور تصوف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ محبت خان نے ان کی صحبت سے بھی کسبِ فیض کیا۔

آنولہ اور بریلی میں نواب علی محمد خاں جیسے علم کے قدرداں موجود تھے جبکہ روہیل کھنڈ میں مصحفی اور قائم الدین چاندپوری جیسے بلند مرتبہ شاعر اردو شاعری کی تاریخ سازی کر رہے تھے۔

روہیل کھنڈ کی تباہی کے بعد محبت خاں فیض آباد اور پھر لکھنؤ پہنچے تو خواجہ حسن بھی ان کے ہمراہ تھے۔ لکھنؤ میں اردو کی جو بساط بچھی وہ اردو شاعری میں ایک علیحدہ باب کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی ہے۔ لکھنؤ کا یہ دور علمی، ادبی رنگینی اور دلفریبی کے اعتبار سے ایک اہم تاریخی دور کہلاتا ہے یہاں کی گلی گلی اور گھر گھر میں علم و ادب کے چرچے تھے۔ ہر بزم بزمِ ادب اور ہر محفل علمی محفل تھی جس جگہ چار اشخاص جمع ہوتے علمی و ادبی تذکرے چھڑ جاتے جہاں چند باذوق افراد یکجا ہوتے شعر و سخن کی محفل سج جاتی۔ مشاعروں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا ہر سرکار اور ہر ڈیوڑھی پر آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے، عمائدینِ شہر کے دولت کدوں اور محلات میں مشاعروں کی یہ تقریبات محافل شادمانی کا کھلا ثبوت پیش کرتی تھیں۔ روہیل کھنڈ اور دلّی کے شعراء لکھنؤ میں جمع ہوئے ان میں اشرف علی فغاں، خان آرزو سید میر سوز، مرزا رفیع سودا، خواجہ حسن، شیخ ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خاں انشا، میر جعفر علی حسرت[2] لقا اللہ خاں لقا، مرزا حیدر علی حیران، قلندر بخش جرأت، مرزا فاخر مکین[3]، میر ضاحک، میر حسن دہلوی، میر قمرالدین منت، میر شیر علی افسوس، نواب محبت خاں محبت اور میر ضیاء الدین شامل ہیں ۔ ان شعراء کے

---

[1] ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب: "
روہیلوں کی حکومت میں اردو شاعری کا فروغ"، معارف جلد ۹۶/ص ۱۰۰

[2] جعفر علی حسرت اردو شاعری میں نواب محبت کے استاد تھے۔

[3] استاد فارسی گو شاعر مرزا فاخر مکین نواب محبت خاں کے استاد تھے، محبت ان سے فارسی میں اصلاح لیتے تھے

ساتھ دیگر اہلِ کمال حضرات نے لکھنؤ میں اردو شاعری کے فروغ میں حصہ لیا۔

نواب محبت کی شاعری نے روہیل کھنڈ میں جنم لیا لیکن قیامِ لکھنؤ کے دوران انہیں علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا پورا موقع ملا۔ یہاں پر انہوں نے انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے اپنی زندگی کے بقیہ ایام بسر کیے اور اردو، فارسی، پشتو اور عربی میں مشقِ سخن جاری رکھی۔ ان کے اردو دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے دلی کے استاد شعراء کی تقلید کی اور لکھنؤ میں رہتے ہوئے دلّی کے دبستانِ شاعری کی ترویج کی۔ محبت خاں نے لکھنؤ میں رہنے والے دیگر شعراء کی طرح درباداری کے لیے شاعری نہیں کی ان کے اردو دیوان میں نواب شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور نہ ہی کسی اور شخصیت کا قصیدہ ملتا ہے جو اس دور کے تقاضے اور روایت کے خلاف ہے جبکہ میر تقی میر اپنی خودداری کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن ان کے اردو دیوان میں قصائد در مدحِ آصف الدولہ موجود ہیں۔ قیامِ لکھنؤ کے دوران نواب محبت خاں نے ایک مثنوی "اسرارِ محبت"[1] تحریر کی جو سسی پنوں کی عشقیہ داستان پر مشتمل ہے اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں دبستانِ لکھنؤ کی جھلک موجود ہے۔ محبت کے اردو دیوان کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ انہوں نے اردو شاعری میں نہ صرف کمال حاصل کیا بلکہ اپنے معاصرین اور اس دور کے مشہور استاد شعراء، میر تقی میر، جعفر علی حسرت، قلندر بخش جرأت[2]، مصحفی اور فاخر مکیں جیسے اساتذہ میں رہ کر اپنا ایک منفرد مقام بنایا اور اپنے کلام پر لکھنؤ کی چھاپ نہیں پڑنے دی، حالانکہ انشاء اور جرأت کے علاوہ جعفر علی حسرت کے دیوان میں ہم نے ایسے معاملہ بندی کے اشعار دیکھے ہیں جو ابتذال اور فحش گوئی کے زمرے میں آتے ہیں خود نواب آصف الدولہ بھی اس سلسلے میں پیش پیش نظر آتے ہیں دراصل محبت خاں اپنا علیحدہ مزاج رکھتے تھے نہ وہ دربارِ اودھ کے زیرِ اثر تھے اور نہ وہ نوابانِ اودھ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے، نوابانِ لکھنؤ سے تو ان کی چپقلش اندرونی طور پر تھی[3]۔

---

[1] "مثنوی اسرارِ محبت" ۵۹۲ اشعار پر مشتمل ہے اس عشقیہ داستان کا تعلق سندھ اور بلوچستان سے ہے

[2] شیخ قلندر بخش جرأت محبت خاں کی سرکار میں ملازم تھے، بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں محبت کا استاد بھی لکھا ہے

[3] شجاع الدولہ نے انگریزوں سے ساز باز کر کے محبت کے والد حافظ رحمت خاں کو [illegible]

محبت خان کی اردو شاعری کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ زمانے کی عام روش کے خلاف امارد پرستی، شیخ و زاہد کی ہجوِ رکیک سے اپنے کلام کو پاک رکھا ۔ ایک عظیم شاعر کی طرح اپنا علیحدہ اور جداگانہ راستہ اختیار کیا اور اپنے مخصوص لب و لہجہ کی بنا پر اپنے آپ کو اس دور کے استاد شعراء کی صف میں لا کھڑا کیا انکی غزلیات میں بہت کم ہجرتی کے اشعار ملیں گے جبکہ انکے دیوانِ اردو میں تین ہزار چھ سو سے زیادہ اشعار موجود ہیں ۔ پورے دیوان میں چند اشعار ایسے ملیں گے جو معاملہ بندی کے زمرے میں آتے ہیں ورنہ وہ تو شہنشاہِ غزل اور خدائے سخن کو بھی اپنے رنگ شاعری سے یہ کہہ کر شرمندہ کرتے ہیں ؎

اب محبت کی غزل پڑھ کر خجالت سے بہت
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

لکھنؤ کی معاشرتی زندگی میں نواب محبت خان کا ایک اپنا مقام تھا وہ والی روہیل کھنڈ کے ہونہار فرزند تھے لہٰذا وہ عام محافلِ شعر و سخن میں بہت کم شریک ہوتے تھے ۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق انکے دولت خانہ پر ہی شعر و سخن کی محفل ہوتی تھی، ان کے دامنِ دولت سے بڑے بڑے شعراء وابستہ تھے ان میں جعفر علی حسرتؔ اور قلندر بخش جرأتؔ کے اسمائے گرامی بطورِ خاص شامل ہیں ۔
محبت خاں کے مقابلے میں انشاء اور جرأت کی شہرت کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ خاص طور پر شاہانہ چشمک میں حصہ لیتے تھے اور دربار کو خوش کرنے کے لیے بھانڈوں کا کردار ادا کرنے میں بھی عار نہیں محسوس کرتے تھے جبکہ محبت نے کبھی سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور اسی لیے وہ اپنے دور میں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے پہچانے گئے ۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اپنی تصنیف "چند شعرائے بریلی" میں رقمطراز ہیں :-

"ماہتاب کی روشنی میں تاروں کی ضیا ماند پڑ جاتی ہے یہی عمل تاریخ اردو ادب میں جاری ہے جب بھی افقِ شاعری پر ماہتاب ابھر کر آئے تاروں کی روشنی ماند پڑ گئی میرؔ و سوداؔ اپنے عہد کے ماہتاب و آفتاب تھے جن کی عظمت و شہرت کے سامنے کتنے ہی شعراء جو ان سے ارفع نہ ہوتے ہوئے بھی داد و ناموری کے متقاضی تھے غیر محتشم رہ گئے ۔"

تاریخ شاہد ہے کہ قدماء کے دور میں اردو شاعری پر تصوف کا غلبہ رہا اس دور کے شعراء درباداری کے تکلفات سے ناآشنا تھے حمدیہ، نعتیہ اشعار کے بعد چکی نامے تحریر کیے جاتے جن میں معرفتِ الٰہی کے اسرار و رموز کے ساتھ ساتھ خواتین کے لیے نصیحت آموز باتیں بیان کی جاتیں، لیکن جب لکھنؤ میں اردو شاعری کا آغاز ہوا تو ایک جانب تو یہ درباری شاعری ایک صحت مند رجحان کی حامی بنی تو دوسری جانب وہ ناخوش گوار امور بھی اپنے دامن میں چھپائے ہوئے تھی جو کہ دبستان لکھنؤ کی تعمیر اور فنی انحطاط کا سبب بنے۔ آصف الدولہ کے ابتدائی عہد میں یہ کیفیت اتنی بگڑی نہیں تھی، لیکن جب شاعری خانقاہوں سے نکل کر لکھنؤ کے گلی کوچوں میں آگئی تو اس کا مزاج ہی بدل گیا۔ میر نے آصف الدولہ کی نوازشوں کے باوجود خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، جب کہ جرأت کو دیکھیے جو دلی میں معاملہ بندی کے مضامین باندھتے ہوئے شرماتے تھے، لکھنؤ پہنچنے کے بعد فحش گوئی میں سب سے آگے نکل گئے، انشا ایک عالم فاضل شخص تھے دربارِ اودھ سے وابستہ ہوئے تو بھانڈ، نقال اور مسخرہ کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔

اردو شاعری کے انحطاط کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ شعراء میں رقابت کی آگ بھڑکنے لگی تھی، انشاء اور مصحفی سلیمان شکوہ کے وظیفہ خوار تھے، دونوں دربار کی قربت چاہتے تھے۔ اس قربت کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے غیر مہذبانہ طریقے اختیار کیے، طبیعت میں جاہ طلبی، مکاری، مردم آزاری پیدا ہوئی اور سنجیدگی جاتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو غزل بھی زوال پذیر ہوگئی۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے مطابق:۔

"شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ اس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں، شاعر اپنے سرپرستوں کے چشم و ابرو دیکھتے تھے اور چونکہ ان کا دل خوش کرنا منظور تھا لہٰذا اشعار بھی ان ہی کے مزاج اور مذاق کے موافق کہے جاتے تھے، مختصر یہ کہ اس دور کے شعراء نقال اور مسخرے پہلے تھے شاعر بعد کو"۔

فراق گورکھپوری کے مطابق:۔

الغرض اس وقت کی نام نہاد شاعری میں نہ کہیں بذلہ سنجی ہے نہ حقیقی طنز
بدمزہ کرنے والی سستی اور اوچھی باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لکھنؤ کے دبستان شاعری کی ایک جھلک اشعار کے آئینہ میں دیکھیے تاکہ اس تناظر میں محبت خاں کے اردو دیوان کو دیکھا جاسکے۔

ہمارے ہاتھ خنجر سے کہو قطع ۔ نہ کھلوایا کبھو اس کا کمربند — میر
منت جل جائے گا پرے بھی سرک ۔ ارے میں آگ اور تو ہے خس — جرأت
جب یہ دیکھا کہ چھوڑتا ہی نہیں ۔ تب یہ ٹھہری کہ بوسے دیں گے دس — ”
ہاتھا پائی ہوئی یہاں تک تو ۔ ان کی انگلی کی مڑ گئی چٹ نس — ”
عالم ہے جوانی کا یہ ابھرا ہوا سینہ ۔ کیا گات ہے کیا گات ہے کیا گات ہے واللہ — ”
لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں — ”
جب تو نے جاتی تھی دھڑی مسی کی کافر۔ واللہ اسی دن میرا ایمان گیا تھا
عشق اس ناف کا نہیں اچھا ۔ ڈوبتا ہے بھنور میں جا کر ناؤ
غش ہوا جاتا ہے بس جی عطر کی بو باس سے ۔ جھٹ سے جرأت کے گلے تو آکے جب لگ جائے ہے ۔ جرأت
یاد جب آتا ہے یہ کہنا ہے تو اڑ جاتی ہے نیند ۔ اپنی ہٹ تو کر چکے بس اب تو ہٹ کر سوئیے

ہم نے لکھنؤ دبستان شاعری کے اشعار پیش کیے جو معاملہ بندی سے بڑھ کر ابتذال کی زد میں آتے ہیں۔ دیوان محبت میں کچھ اشعار ایسے ضرور موجود ہیں جو معاملہ بندی کے زمرے میں آتے ہیں جہاں تک ان کی اردو مثنوی "اسرار محبت" کا سوال ہے تو اس بارے میں اس حقیقت کا آپ کو علم ہے کہ اس دور میں عشق و محبت کے مضامین کے لیے مثنوی مخصوص ہو گئی تھی ۔ اس بات کا اندازہ اس دور کی مثنویوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوتا ہے ۔ محبت خاں بھی اس عشقیہ داستان کو نظم کرتے وقت اس وقت مجبور رہتے جہاں انہوں نے سستی اور ہیروں کا سراپا پیش کیا ہے ۔

کلام محبت میں صنائع بدائع

صنائع بدائع کا استعمال ارادی و غیر ارادی طور پر ہوتا رہا ہے۔ عہد قدیم میں استاد شعرائ کا یہ وطیرہ رہا کہ وہ خاص طور پر اپنے کلام میں صنائع بدائع کا التزام کرتے تھے اور شاعری کو علم بیان و بدیع اور صنائع لفظی و معنوی سے بجاتے تھے۔ اس ضمن میں محبت خاں محبت بھی اپنے ہم عصر شعرائ سے پیچھے نہیں رہے انہوں نے اپنے کلام میں بہتر انداز سے صنائع بدائع کا استعمال کیا ہے اس کو ہم قدرے مختصراً بیان کرتے ہیں۔

صنعت تشبیہ

میر نے تشبیہ کی اچھی مثال پیش کی ہے

؎ نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے ۔ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

؎ میر ان نیم باز آنکھوں میں ۔ ساری مستی شراب کی سی ہے

تشبیہ کی امثال میں محبت خاں کے اشعار ملاحظہ کیجے۔

؎ تن دولت کی دولت اے ماہ ۔ تنِ لاغر مرا ہلال ہوا

محبت کا یہ انداز تشبیہ کے استعمال کے اچھے ڈھنگ کو ظاہر کرتا ہے، کسی شعر میں جب مصرع اولیٰ اور مصرع ثانی میں ایک ہی لفظ سے ابتدا کی جائے تو اکثر ذہن سلیم پر گراں گذرتا ہے، لیکن محولہ بالا شعر میں عاشق کے لاغرپن میں بھی ایک خوبی پیدا کر کے ہجر کا اچھا حاصل ظاہر کیا ہے، پھر تنِ لاغر کو ہلال سے تشبیہ دے کر محب اور محبوب کا درجہ تو ایک ہی رکھا لیکن ان میں اتنا ہی فرق واضح کیا جو ماہ اور ہلال میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ شعر بلاغت کی بھی اچھی مثال پیش کر رہا ہے۔

؎ دیکھتے ہی تیری آنکھوں کو حلاوت پائی ۔ یہ تو ظاہر ہے میاں ہووے ہے بادام لذیذ

آنکھوں کو بادام سے تشبیہ دے کر بادام کی لذّت کا ذکر کر دیا گیا، لیکن اگر آنکھوں کو کھا کر بادام کی لذّت کا ذکر کیا جاتا تو شعر معنوی اعتبار سے معیار سے گر جاتا۔

؎ تشبیہ اس کے ساتھ نہ دے مجھ کو بوالہوس ۔ آنسو میرا کچھ اور ہے دُرِ عدن جدا

محبت کے خیال میں یہ رائے کسی بوالہوس کی ہو سکتی ہے کہ آنسو اور موتی یکساں شے ہیں، آنسوؤں کی ہمسری کے لیے مادّی اشیاء کا ذکر اشکوں کی قیمت کو گھٹانے کے مترادف ہے، پھر آنسوؤں کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنے کے بجائے "کچھ اور" کہہ کر بات میں اور زیادہ وزن پیدا کر دیا۔

؎ ہمارا قتل مت رکھ تیغ پر تو ۔ یہ کام اس ابروئے خمدار کو سونپ

؎ شدتِ گریہ سے سونا محبت کا ہے ۔ آئے کس کے تئیں طغیانیٔ سیلاب میں خواب

شدتِ گریہ کو سیلاب کی طغیانی کے ساتھ ساتھ نیند نہ آنے کا کتنا عمدہ جواز بنایا ہے ۔

؎ تو اپنے ساتھ غیر کو لے آیا کس لیے ۔ مجھ کو طلب ہے گل کی نہیں خار کی طلب

مندرجہ بالا تشبیہ کتنا بیباکانہ انداز لیے ہوئے ہے ۔

؎ شاید آئی بادہ نوشی کی بہار ۔ اشک میرا مینہ سا برسا گیا

؎ کیا خوشی کیجے کہ وہ خورشید تھا ۔ صبح آوے گا تو پھر شام نہیں آنے کا

تشبیہ کے ساتھ تضاد بھی موجود ہے ۔

؎ کیا کہوں ناوکِ مژگاں کی حقیقت تیرے ۔ کون سا تیر تھا جو دل کے میرے پار نہ تھا

؎ مارِ سیاہ انسان سے رکھتا ہے عداوت ۔ مخفی نہیں زلف اس کی عیاں دشمنِ جاں ہے

؎ رات کو پوشیدہ رہنا مثل مہر ۔ صبح کو ہونا نمایاں واہ واہ!

؎ زیرِ ابرو نہیں آنکھیں یہ تری پوشیدہ ۔ مست ہیں دونوں کہ کرتی ہیں یہ محراب میں خواب

صنعتِ تشبیہ کی سند میں پیش کیے گئے چند اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ محبت نے تشبیہ کے ساتھ ساتھ نکتہ و معنی آفرینی کا پہلو بھی اجاگر کیا ہے ان کے اشعار میں ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ چند خوبیوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور اشعار پر مختلف پہلوؤں سے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں ۔ ان کے اشعار میں ابہام و اشکال بہت کم ہوتا ہے ۔

استعارہ

استعارہ تشبیہ سے زیادہ بلند پروازیِ تخیل کا اظہار کرتا ہے اور کلام میں بلاغت کا سبب بنتا ہے محبت خان نے استعارہ کے استعمال میں بھی اپنی جودتِ طبع دکھائی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

؎ مخمور جب تمہاری دیکھی ہے انکھڑیوں کو ۔ کھینچے ہے اس نشے کا کیا ہی خمار نرگس

نرگس کا خمار آلود ہونا محبوب کی چشم قرار دی ہیں ۔

؎ ویران تب جگر کو کیا غم کی فوج نے ۔ جب ملکِ دل کو کر لیا پہلے خراب خوب

اشکوں کی جگہ استعارہ کے طور پر غم کی فوج استعمال کیا ہے اسے استعارہ بالکنایہ بھی کہتے ہیں ۔

؎ ڈرتا جو نہ اس ظالمِ مظلوم نما سے ۔ لیتا میں تری نرگسِ بیمار کا بوسہ

کنایہ

علم بیان کے اس رکن میں بھی محبت خان نے اپنے فکر کی جولانی دکھائی ہے اور ذہنِ رسا کا ثبوت فراہم کیا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے "

؎ کچھ زلف کے تو ہاتھ لگانے کا ڈھب نہیں ۔ اور میں جو دیکھتا ہوں تو اک دم میں شب نہیں

زلف کو ہاتھ لگانے کا موقع تلاش کرنے میں رات بیت گئی اور یہ رات دم میں گذر گئی ، دوسرا نکتہ یہ کہ جب زلف کو چھونے کی کوشش کی جاتی تو زلف کو رخ سے ہٹا کر دوسری جانب کر لیا جاتا ہے نہایت فکر انگیز شعر ہے :

؎ اے جان نہ جا دیدۂ گوہر میں سوئے چشم ۔ گو نفع بہت ہو پر ہے دریا کا سفر منع

نفع تو یہ ہے کہ محبوب دیدار عاشق کے وقت اس کی آنکھوں سے موتی ابلتے دیکھے گا لیکن یہ بھی خیال رہے کہ چشم عاشق میں دریا کی روانی بھی تو ہو گی جو بڑی بڑی اشیاء کو بہا لے جا سکتی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

؎ اس یار سے کچھ مجھ کو نہیں شکوہ جفا کا ۔ جو ہے سو یہ ہے ستم ایجاد بغل میں

کنایتہً دل کو ستم ایجاد کہہ رہے ہیں ، لیکن دل کے ہاتھوں ان ن مجبور ہے ۔

ؔ جوں مہر کے حضور نہ انجم میں تم رہو ۔ ظاہر یہ داغ دل ہو تو پنہاں ہو شب چراغ

ؔ رونے کو میرے جاتے ہیں تو گھر سے مت نکل ۔ ممکن نہیں کہ آج یہ برسات ہو چکے

ؔ کچھ دوستیِ شمع رخاں دشمن جاں ہے ۔ کچھ شمع صفت اپنی زباں دشمن جاں ہے

ؔ سینے میں تیر لگایا ہے کہ جھگڑا ڈالا ۔ دل جگر دونوں کی باہم ہے ترے تیر سے بحث

ؔ میں کہاں اور کہاں حرفِ محبت ناصح ۔ ہے اک استاد لبغل میں کہ پڑھاتا ہے مجھے

ؔ لگے ہیں تیر جو سینے پہ جیسے ۔ سو تم اس کی صفِ مژگاں سے پوچھو

ؔ کرتا تھا مجھ کو منع کہ تو اس کے گھر نہ جا ۔ ناصح نے یار و دیکھیو کھائے ہیں سنگ رات

ؔ دل ہے یا لالہ زار ہے کیا ہے ۔ سینہ یا باغ و بہار ہے کیا ہے

تضاد

محبت خاں محبت کے کلام میں صنائع لفظی کی بھی اچھی مثالیں پائی جاتی ہیں ، وہ متضاد الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ اشعار کو پر معنی بنانے میں کمال رکھتے ہیں ۔ صنعت تضاد کے چند اشعار دیکھیے

ؔ کل تو کیا تھا وعدۂ وصل آج کامیاں ۔ کہتے ہو آج ملیئے گا کل اک نہ شد دو شد

تضاد کے ساتھ محاورہ بھی استعمال کیا ہے ۔

ؔ لیلیٰ سے دور دور پھرا قیس دشت میں ۔ تجھ سے قریب ہے نہ یہ مجھ سے لبعید ہے

ؔ ہمارے گریہ کا ہونا بھی نہ وہ مانع ۔ شعور کچھ بھی جو ناصح میں بیش و کم ہوتا

ؔ کرتے ہیں جو راتنا سمجھتے نہیں صنم ۔ کل کو ہمیں بھی کام پڑے گا خدا کے ساتھ

ؔ کھولے جو رخ پہ زلفِ پریشاں اِدھر اُدھر ۔ اسلام سے ہو کفر نمایاں اِدھر اُدھر

ؔ عشق ہے مشکل بہت اے بوالہوس ۔ اسکو تو سمجھا ہے آساں واہ واہ

ؔ نیکی ہوئی کسی سے کسی سے بدی ہوئی ۔ تجھ سے تو کچھ جہاں میں محبت نہ ہو سکا

ؔ گرچہ ہیں اغیار کے ہم پر بہت ظلم و ستم ۔ اے کریمِ عاشقاں تیرے کرم کو کیا ہوا

سے جا کے اسکی زلف کو دیکھا کیا کر رات دن - چاہتا ہے دل اگر تو سیر شام و روم کی

مولر بالا شعر میں تضاد کے ساتھ تشبیہ بھی موجود ہے -

سے مجنوں نے میں نے درسِ محبت پڑھا و لے - میں نے پڑھا صحیح اور اس نے پڑھا غلط

سے میں کہا آنے کا وعدہ سچ ہے تو کھا تو قسم - ورنہ کہنے کو ترے جانیں گے ہم اے یار جھوٹ

سے الغا کر اب تو وعدہ شب میں نے صبح سے - کھینچا ہے انتظار بہت شام کے لیے

سے ہے زمانہ کا کام کچھ کا کچھ - صبح کچھ اور شام کچھ کا کچھ

سے میں وہ نا داں ہوں جس کے شور سے سب عرش ہل جاوے

نہ لرزے آہ سے میری زمین و آسماں کیوں کر

سے سچ یہ ہے کہ اے دوست جفا تجھ میں نہیں ہے

اتنا ستم اپنے کسی دشمن میں نہیں ہے

مراعاۃ النظیر

نواب محبت خاں محبتؔ کسی ایک شعر میں ایک لفظ کو اصل شعر قرار دے

کر اس کی مناسبات کا ذکر بہتر انداز سے کرتے ہیں -

سے آتش سے میں بھی کم تو نہیں ہوں کہ میرے ہے - سینے میں کلیجے میں دل و جان میں آتش

سے اے ہمصفیر چشم میں اس گل کے خار ہوں - بلبل کی طرح باغ میں گو میں ہزار ہوں

سے کیوں باغبانِ دہر میرا تخم دوستی - اس بے وفا کے مزرع دل میں نہ بو سکا

مراعاۃ النظیر کے ساتھ گن یہ بھی ہے -

سے اے محبت اب قفس میں یاد کر کہتے ہیں ہم - آہ گل افسوس سنبل ہائے گلشن وائے باغ

گل، سنبل، گلشن، باغ کے علاوہ قفس، آہ، افسوس، ہائے وائے پر غور کیجے شعر کو دو مختلف ماحول دے کر

داخلی اور خارجی اعتبار سے پرکشش بنا دیا ہے -

؎ یہ زلف اور کاکل بنی ہے کم صیاد - پھنسانے کو دلِ عشاق خط کو دام نہ کر

؎ عجب دلچسپ گلزارِ محبت ہے کہ واں مجھ کو - گل و بلبل تو کیا واں کے ہر اک ہے خار سے الفت

؎ رخ و زلف و نگاہ و غمزہ سب اس کے قیامت ہیں - ولے قامت کی اس کی گھات کہنے میں نہیں آتی

؎ دل ہے یا لالہ زار ہے کیا ہے - سینہ باغ و بہار ہے کیا ہے ؟

؎ اپنی قسمت میں دیکھیے بلبل - گل ہے یا نوکِ خار ہے کیا ہے ؟

؎ وہ بت میرے خانۂ دل میں ہے جلوہ گر - ڈھونڈے ہے جس کو شیخ جدا برہمن جدا

؎ شیشہ و جام و شراب اور گزک بھی ساقی - رکھیو موجود کہ یہ موسمِ برسات آیا

حسنِ تعلیل

شاعر کی قوت تخیلّہ کا اظہار حسنِ تعلیل سے بھی ہوتا ہے کائنات کا مشاہدہ اسباب و علل کو سمجھنے اور تلاش کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے ایک شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ کیوں اور کیسے کے سوالات اپنے ذہن میں پیدا کرے تاکہ طبع رسا سے اشعار میں معنویت و مقصدیت اجاگر ہو - محبت خاں کی شاعرانہ تعلیاں ملاحظہ فرمائیے -

؎ بے فصل گل جو چلتی ہے ہمدم نسیم صبح - ہے عاشقوں کے حق میں یہی تو ہوائے درد

؎ گر تلخ تیرے رو کا عرق ہے خفا نہ ہو - اے گل عذار ہووے ہے اکثر گلاب تلخ

؎ خطِ شعاع دیدۂ خورشید تو نہ جان - ہے تیرے دیکھنے کے لیے دوربین صبح

؎ نالہ بلبل کی ہے تاثیر یہ شبنم نہیں - ہر سحر روتے ہیں گل سن کر فغانِ عندلیب

؎ تیری تلاش میں ہی تو ہے اس کو تمام روز - ایسا جو ہو گیا ہے جہاں گرد آفتاب

؎ شب لبِ دریا سے تو ہم کو اٹھا یا تھا ولے - بحر کی ہر موج اپنی ناؤ کی زنجیر تھی

محبت نے اپنی قوت متخیلہ کے ذریعے اشیائے کائنات کے حقیقی علل سے ہٹ کر نئی علتیں اچھے انداز سے تراشی ہیں جس سے کلام میں لطافت میں اضافہ ہو گیا ہے - اس ضمن میں چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے :-

؎ ابرو کو تیرے سجدہ نہ کیوں کر کریں سبھی ۔ نقشہ یہ حق نے کھینچا ہے کعبہ کے طاق کا

؎ نہ رکھ دریغ ذرا مجھ سے آبِ خنجر کو ۔ کہ تشنہ حلق میرا بھی ہے آب کے لائق

؎ جو پہنچا مصحفِ رو تک ترے یہ ہند و خال ۔ تو کافر اس سے سوا ہوگا اور کیا گستاخ

تلمیح

جس زبان میں تلمیحات کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں وہ بلاغت کے درجے سے گری ہوئی ہے[1] اردو تلمیحات میں تاریخی واقعات، قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے اشعار کو مستند بنا دیتے ہیں، محبت خان نے اس ضمن میں زیادہ تر اپنے آپ کو، مجنوں، کوہکن، یوسف زلیخا اور عیسیٰ علیہ السلّام تک محدود رکھا ہے ۔

؎ زلیخا کی کوئی آنکھوں سے دیکھے ۔ کہ اب ثانی ہے یوسف کا مرا یار

؎ پاویگا یہ شفا دلِ بیمار دیکھ جا ۔ اے عیسیٰ زماں اسے اک بار دیکھ جا

؎ گر چاہ نہ ہوتی تری اے غیرتِ یوسف ۔ تو گریہ میرا صورتِ یعقوب نہ ہوتا

؎ یوسف کو گرایا تھا عزیزوں نے کنوئیں میں ۔ ہر آن ڈبوتی ہے مجھے چاہ کسی کی

؎ ہم نشیں دارا و کیکا مجھ سے افسانہ نہ کہہ ۔ قصہ پروانہ کہہ یا داستانِ عندلیب

؎ شہرہ ہے سخاوت کا تری بوسہ تو ایک دے ۔ تا ہم کو یقیں ہووے کہ تو حاتم طے ہے

؎ پتھر کو تو پھوڑے ہے تری آہ سے فرہاد ۔ شیریں کا نہ دل نرم ہو یہ سنگ بنا ہے

؎ عاشقِ مفلس ہوں یہ پہنچا میرا سر دار پر ۔ میں طرح منصور کے سردار ہوں بھی اور نہیں

؎ کوہکن نے ہی نہ کچھ عشق میں لذت پائی ۔ گرچہ شیریں کا بہت کہنے کو تھا نام لذیذ

؎ مجنوں کا شور اب تو محبت کہیں نہیں ۔ ہے آج تیرے عشق کا غوغہ جدھر تدھر

؎ باتیں سنیں جو تیری محبت شکر سے خوب ۔ ہرگز رہا نہ طوطیٔ ہندوستاں کا ہوش

محولہ بالا شعر میں تلمیح بالکنایہ ہے، طوطیٔ ہندوستاں حضرت امیر خسرو کو کہا جاتا ہے

اس مرقع سے شکلِ مجنوں کی ۔ ہائے بہزاد مجھ کو یاد آئے

دیکھیئے دو تاریخی کرداروں کو محبت نے کس خوبی سے یکجا کیا ہے ۔ چند اشعار اور دیکھئے ۔

طوفاں ہو تو ہووے بھی اسکا علاج کچھ ۔ اے نوح میرے اشکِ رواں کا نہیں علاج

یوسف کی طرح خواب میں آجائے تو اگر ۔ اس وقت جانیں ہم کہ یوں ہوتا ہے خواب خوب

دکھادوں گا سبھی یہ لن ترانی ۔ اگر کچھ دل میں آئی یاد دیکھیو

مندرجہ بالا تلمیحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے جو تلمیحات اپنے اشعار میں اختیار کی ہیں ان کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں وہ محض چند تاریخی کرداروں کو ہی دہراتے ہیں ۔

تجنیس تام

صنائع لفظی میں تجنیس تام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، محبت کے کلام میں سے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔

عاشقِ مفلس ہوں یہ پہنچا میرا سر دار پر ۔ میں طرح منصور کے سردار ہوں بھی اور نہیں

گم نہ برسے ابر کو ہمت کہو اس کو برس ۔ اب کے برسے ہیں یہ مژگاں اس برس چپکے رہو

بیداری کی خوبی ہے وہ سونے کی نہیں ۔ تیری سی چمک دیکھی تو سونے کی نہیں

تب ساتھ بھی سونا میرے اور منہ بھی چھپانا ۔ قربان ترے سنگ کے یہ سنگ نیا ہے

نہ رکھ دریغ ذرا مجھ سے آبِ خنجر کو ۔ کہ تشنہ حلق میرا بھی ہے آب کے لائق

یہ کافر قشقہ درخشاں ان میں وہ مانگ
دلِ مجنوں کو جو لیلیٰ سے لے مانگ

صنعت تکرار

اشعار میں بعض مرتبہ الفاظ کی تکرار حسین معلوم ہوتی ہے اور بعض مرتبہ قبیح کی مثال بن جاتی ہے
محبت کے کلام میں تکرار الفاظ ملاحظہ فرمائیے ۔

ـ ہو درد اور ہم ہوں خدا ہم ہوں اور درد ۔ ایسا تو رکھ مدام ہمیں مبتلائے درد
ـ کل تو کیا تھا وعدۂ وصل آج کا میاں ۔ کہتے ہو آج ملئے گا کل ایک نہ شد دو شد
ـ سخت جانی پہ محبت کی کہیں سب دم بدم ۔ دم نہیں اس کا نکلتا اس کے دم کو کیا ہوا
ـ خونِ دل پیتے تھے ہم کھاتے تھے غم دیکھیں تجھے ۔ خونِ دل کیوں کر پیئے گا کس طرح تم کھائے گا
ـ جوں ہمارا دل ہمیں لاتا تھا کوچے میں ترے ۔ اس کے کوچے میں ترا دل بھی تجھے لے جائے گا
ـ تو جان ہے میری و میری جان کا دشمن ۔ یہ سخت تعجب ہے کہ جاں دشمنِ جاں ہے
ـ گو نہ برسے ابر کوئی مت کہو اس کو برس ۔ اب کے برسے ہیں یہ مژگاں اس برس چھپکے رہو
ـ ہرگز نہیں ہے میری محبت میں شک گلے تو بدگماں ہے تیرے گماں کا نہیں علاج

تکرار الفاظ میں ہم نے محبت خاں کے چند اشعار پیش کیئے ، ان اشعار میں سادگی ، روانی اور روزمرہ کی مثالیں موجود ہیں ۔

سیاق الاعداد

ـ روزمرہ اور محاورہ کے طور پر محبت خاں نے زیادہ تر اشعار سیاق الاعداد کے استعمال کیے ہیں ۔

ـ میں اپنے دل کو روؤں سو کیا کل اسی طرح ۔ کوچے میں اس کے دیکھے پڑے سو ہزار دل
ـ دو چار باتیں تجھ سے تو کرتے پہ کیا کریں ۔ ہم بھولے سات پانچ تیری ہفت ہشت سے
ـ مت کرو اس پنجۂ مژگاں سے لافِ جنگ اب ۔ دل جگر تم دو ، ادھر ہیں پانچ دس چھپکے رہو
ـ کرتی ہے خوں وہ ابروئے خمدار ایک دو ۔ کھینچی ہے اس کے حسن پہ تلوار ایک دو
ـ باتیں تو سبھی اس نے کہیں ہم سے پہ یارب ۔ دو چار رکھیں یاد اور دو چار فراموش
ـ وعدہ پہ ایک تو ، یار نہ آنا کیا تھا ۔ دوسرے آج ہی اٹھنے کا بہانا کیا تھا

مبالغہ

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ مبالغہ آرائی پر مشتمل ہے، غزلیات و قصائد خاص طور پر مبالغہ آرائی سے بھرے پڑے ہیں، محبت کے اردو دیوان میں اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔

ے مثلِ باراں ابر سے سو برس تک رات دن - پر نہ ہو سے تیرے آنسو کے تسلسل کا حریف۔

ے ہوتے اگر اس وقت میرے گر یہ آنسو - لگ اٹھتی وہیں نوح کے طوفان میں آتش

ے اٹھا طوفان آنکھوں سے میری عالم ڈبو دے گا - بچے گا دیکھئے اے دل تیرا یہ خانماں کیوں کر

ے میں اپنے سر کو جو پٹکا تھا ہجر میں تیرے - لہو ہر اک در و دیوار سے تھا جاری آج

ے شبِ وصال میں بھی مجھ پہ اک بلا ٹوٹی - محبت اس نے جو کاکل سنوارے ساری رات

ے بسکہ تنگی کے سبب اس کا دہاں ملتا نہیں - جیسا ناپیدا دہاں ہے ویسا ناپیدا جواب

محبت کے کلامِ اردو میں سے ہم نے چند صنائع لفظی و معنوی کی مثالیں مختصراً پیش کیں تاکہ محبت کے کلام میں سے کچھ اشعار بھی سامنے آجائیں اور آئندہ باب میں مختلف شعراء کے کلام سے انکا تقابل کرنے میں بھی آسانی ہو۔

—— × —— × ——

محبتؔ حسرتؔ کے شاگرد تھے، بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں جراُتؔ کا شاگرد بھی لکھا ہے[1]۔
نواب آصف الدولہ نے میر تقی میرؔ اور محبت خاں دونوں کی قدر دانی کی۔ دہلی اجڑنے کے بعد ۱۷۸۲ء مطابق ۱۱۹۷ھ میرؔ لکھنؤ چلے آئے اور دربارِ اودھ سے وابستہ ہوئے، لیکن جلد ہی دربار سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنی شاعری کو درباری داری کے اثرات سے بچا لیا۔ محبت خاں کو انگریزوں کی جانب سے وظیفہ نواب آصف الدولہ کے دربار کے توسط سے ملتا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی خودداری کو قائم رکھا۔ ایک مرتبہ گورنر کی خدمت میں استغاثہ پیش کر کے انگریزوں سے بلا واسطہ وظیفہ حاصل کرنے لگے۔
میرؔ اور اس دور کے دیگر شعراء کے دواوین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے اس دور کے شعراء نے نواب شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور دیگر نوابین کی مدح سرائی کی ہے، لیکن محبت خاں کے اردو دیوان میں کسی شخصیت کے بارے میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔ خواجہ میر دردؔ تمام عمر دہلی میں رہے وہ بھی اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں، دردؔ کا انتقال ۱۷۸۵ء ۱۱۹۹ھ میں ہوا ان کا فیضانِ شاعری اس انداز سے بھی جاری رہا کہ وہ خود دہلی میں رہے اور لوگ ان کی تقلید روہیل کھنڈ اور لکھنؤ میں کرتے رہے۔
محبت خاں نے، میرؔ، دردؔ، حسرتؔ، جراُتؔ سب ہی کسبِ فیض کیا ہوگا لیکن انہوں نے کسی بھی شاعر کی پوری طرح تقلید نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنا ایک منفرد مقام بنایا۔ اس دور کے سب سے بڑے شاعر یعنی میرؔ کے بارے میں محبت کا یہ شعر دیکھئے۔

؎ اب محبت کی غزل سن کر خجالت سے بہت ۔ رنگ اڑ جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا[2]

محبت کے بعد آنے والے غالبؔ نے بھی اپنے قدما اور بزرگ شعراء کا تتبع اس انداز سے کیا کہ جہاں انہوں نے غزل کو چھوڑا تھا وہاں سے غالبؔ نے آگے بڑھایا۔ میرؔ کو شہنشاہِ غزل کہا گیا اور غالبؔ کو بھی غزل گو کی حیثیت سے مسلم الثبوت استاد مانا گیا، محبت خاں غالب سے تقریباً ۴۶ سال پیشتر اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ ہم اس باب میں محبت خاں کے ہم عصر شعراء اور محبت خاں کی ان غزلیات کو سامنے رکھیں گے جو ایک ہی زمین، قافیہ، ردیف یا فکر انگیزی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں۔ محبتؔ اور میرؔ کی ہم غزل

---

[1] محبت کے اساتذہ کے بارے ایک علیحدہ باب میں بحث کی گئی ہے [2] میرؔ کی غزل کے شعر کا مصرع ثانی ہے۔

دیکھئے ۔

"غزل" محبت خاں محبت

کام تھا لانا تجھے یاں نالۂ شب گیر کا ۔ میں تو دیوانہ ہوا ہوں آہِ بے تاثیر کا

سونپ دی تقدیر پہ بیمار ہو ان کو طبیب ۔ ہاتھ سے جاتا رہا ہے وقت اب تدبیر کا

زلف میں تیری جو ہو پابند دل تو ہے بجا ۔ تھا یہ دیوانہ بہت مشتاق اس زنجیر کا

تو نہ مل لیکن لگا سینہ پہ اک تیرِ نگاہ ۔ کاش ہو جاوے وصال اس دل کو تیرے تیر کا

تو تو ہے خود محبت کی صورت اور میں حیرت زدہ ۔ روز ہی نقشہ بندھا ہے عالمِ تصویر کا

جو تری چشم و نگہ کا زخمی ہو مجروح ہو ۔ ہے خوشا احوال اے صیاد اس نخچیر کا

سلسلے میں زلف کے اس کی ہوا میں دست بیچ ۔ شیخ تجھ پہ کیا کھلے حال اس مرید و پیر کا

اب محبت کی غزل سن کر خجالت سے بہت
رنگ اڑا جاتا ہے تک چہرہ تو دیکھو میر کا

محبت کے سامنے میر کی درج ذیل غزل رہی ہوگی انہوں نے اپنے مقطع کا مصرعہ ثانی بعینہٖ تحریر کر کے ایک مشاق شاعر ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے اور میر پر چوٹ بھی کر گئے ۔

"غزل" میر تقی میر

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا ۔ جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا

سب کھلا باغِ جہاں الا یہ حیران و خفا ۔ جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

بوئے خوں سے جی رکا جاتا ہے اے ابر بہار ۔ ہو گیا ہے چاک دل شاید کسو دل گیر کا

کیونکہ نقاشِ ازل نے نقش ابرو کا کیا ۔ کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا

رہ گذر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر ۔ اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

بس طبیب اٹھ جا مری بالیں سے مت دے دردِ سر ۔ کام جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا

نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی تیرے در پہ ہم ۔ قد خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

جو تیرے کوچے میں آیا پھر وہیں گاڑا اسے ۔ تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامن گیر کا

خون سے میرے ہوئی یک دم خوشی تم کو تو لیک ۔ منت میں جاتا رہا جی ایک بے تقصیر کا

لختِ دل سے جوں چھڑی پھولوں کی گوندھی ہے ولے ۔ فائدہ کچھ اے جگر اس آہِ بے تاثیر کا

گورِ مجنوں سے نہ جاویں گے کہیں ہم بے نوا ۔ عیب ہے ہم میں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا

کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں

رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

محبت اور میر کی غزلیں توجہ سے پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ دونوں شعراء کا کلام تفکر اور اور انداز بیان کے لحاظ سے کس قدر یکسانیت لیے ہوئے ہے ۔ محبت کی غزل کے تمام قوافی میر کی غزل میں موجود ہیں میر نے ۱۲ اشعار کی غزل کہی ہے جب کہ محبت کی غزل میں ۱۸ اشعار ہیں اور بھرتی کے اشعار بھی نہیں۔

اب اسی ردیف و بحر میں غالب کی غزل ملاحظہ فرمائیے جو میر اور محبت کی غزلیات سے بہت بعد میں کہی گئی ہے۔ غالب کے اردو دیوان میں یہ پہلی غزل ہے ۔

"غزل" غالب

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ ۔ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے ۔ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ۔ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

میر، محبت، اور غالب کی غزلیات آپ کے سامنے ہیں میر اور محبت کا رنگ تغزل ملتا جلتا ہے، سادگی اور روانی کے لحاظ سے محبت کی غزل ان دونوں غزل گو شعراء سے سبقت لے جاتی ہے ۔

یہ اشعار دیکھئے ۔

؎ زلف میں تیری جو ہو پابند دل تو ہے بجا ۔ تھا یہ دیوانہ بہت مشتاق اس زنجیر کا ۔ محبتؔ

؎ نالہ کش ہیں عہد پیری میں بھی تیرے در پہ ہم ۔ قد خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا ۔ میرؔ

؎ بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا ۔ موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا ۔ غالبؔ

فکر کے اعتبار سے تو آپ غالبؔ کے شعر کو میرؔ اور محبتؔ کے اشعار پر ترجیح دے سکتے ہیں لیکن رنگِ تغزل اور سادگی کے لحاظ سے محبتؔ کا شعر علیحدہ نظر آتا ہے ۔

ردیف "شمع" میں محبتؔ، غالبؔ اور مصحفیؔ کی غزلیات دیکھئے ۔

محبتؔ "ردیف شمع"

؎ ٹھہرے حضور اس کے کہاں ہے مجالِ شمع ۔ گرمی سے حسنِ شمع کی ہووے وبالِ شمع

؎ جس نے کسی کو سوخت کیا وہ بھی جل گیا ۔ پروانہ جوں جلا ہوا ویسا ہی حالِ شمع

؎ پیارے کسی کے دل کے تئیں مت جلائیو ۔ کیا ہوا تپنگ باعثِ ملالِ شمع

؎ ہستی کو اپنی اس نے کیا صرفِ اشک و آہ ۔ دیکھا ہے ہم نے یہ تو عجب ہے کمالِ شمع

؎ عاشق تو بت ہے سنیو محبت کی جس گھڑی
ہو وے گداز جسم ترا سب مثالِ شمع

غالبؔ "ردیف شمع"

؎ رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع ۔ ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

؎ غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ ۔ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

؎ کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام ۔ بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

؎ ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے ۔ بجلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

؎ نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ ۔ شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

؎ جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پہ مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

مصحفی "ردیف شمع"

ء روبرو اس کی جو تھی شب فندقِ گُل رنگ و شمع ۔ تا کہ کرتا تھا میں سیرِ گل اور رنگِ شمع

ء وہ تو ہو اس پر تصدق یہ کرے اس سے گریز ۔ دیدنی ہے صحبتِ پروانۂ بے ننگ و شمع

ء جانتا گر میں کہ پانی تیری کھینچے گا شبیہ ۔ متصل ہونے نہ دیتا کاغذِ بے رنگ و شمع

ء داغ سینے کا وہی ہے سختیٔ ہجراں وہی ۔ قبرِ عاشق نہیں کچھ احتیاجِ سنگ و شمع

غالبؔ، مصحفیؔ اور محبتؔ کی غزلیات آپ نے ملاحظہ فرمائیں سادگی اور روانی کے لحاظ سے محبتؔ کی غزل ان دونوں استاد شعراء سے آگے بڑھ گئی ہے۔ محبت کا انداز جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ غزل کا واضح اور صاف لہجہ کسی خاص دبستان سے متعلق نہیں لیکن اس کے اوصاف کا آئینہ دار ہے۔

ذیل میں نواب محبتؔ خاں اور غالبؔ کے چند اشعار کی معنویت و انداز کی مماثلت دیکھئے۔

ء ہجر آیا آہ اور جاتا رہا صبر و قرار ۔ آ بنی ہے جان پر اب دیکھیے کیسے بنے "محبتؔ"

ء میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل ۔ اس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے "غالبؔ"

ء رونے کو تیرے ہم تبھی پائیں گے محبتؔ ۔ ہر دم جو تیرے اشک میں لختِ جگر آوے "محبتؔ"

ء تب نازِ گراں مایگیٔ عشق بجا ہے ۔ جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے "غالبؔ"

ء ٹکڑوں میں میرے دل کے تماشا جو کرے تو ۔ جوں آئینہ خانہ میں تو ہی تو نظر آوے "محبتؔ"

ء اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ ۔ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے "غالبؔ"

ء سینے سے پہنچ سکتی نہیں میرے لبوں تک ۔ اس آہ کے نزدیک کہاں سے اثر آوے "محبتؔ"

ء تب چاک گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں ۔ جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے "غالبؔ"

ء ہجر کی اس شب میں ٹک اے ابر تو مت آئیو ۔ رات کٹتی ہے ذرا اختر شماری کے سبب "محبتؔ"

ء کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال ۔ ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے "غالبؔ"

ء یہ لطف تب ہے کہ ہووے کنارۂ دریا ۔ نشہ ہو آنکھوں میں اور سیرِ آب اور شراب "محبتؔ"

ء ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر ۔ موج ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

ؔ غم اور جنبوں کے ہاتھ سے میں کیا کہوں کہ آہ۔ دل چاک ہو گیا ہے جدا پیرہن جدا۔ محبت

ؔ اب کے جنبوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے۔ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں۔ غالب

ؔ اے فلک پیدا کیا ہے تو نے غم میرے لیے۔ راحت اوروں کے لیے درد والم میرے لیے۔ محبت

ؔ نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے۔ رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے۔ غالب

ردیف "الف" میں محبت اور غالب کی ایک غزل ایک ہی زمین میں موجود ہے۔ محبت کی یہ غزل ۱۵ اشعار پر مشتمل ہے اس غزل کی خاص اور اہم بات یہ ہے محبت اور غالب کا پہلا شعر معنویت وتخیل کے اعتبار سے یکساں ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غالب کے پیش نظر محبت کی یہ غزل ضرور رہی ہوگی، اور وہ اس غزل کے پہلے شعر سے اتنے متاثر ہوئے کہ محبت کے تخیل سے دامن نہیں بچا سکے، محبت اور غالب کی غزل کا پہلا شعر دیکھئے۔

ؔ ظالم یہاں کوئی آپ سا پیدا نہ ہوا تھا۔ اور خلق میں مظلوم بھی مجھ سا نہ ہوا تھا۔ محبت

ؔ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا۔ اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا۔ غالب

اس غزل کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے اور ان کی یکسانیت پر غور کیجیے۔

ؔ کوچے میں تڑپتے ہیں تیرے سیکڑوں بسمل۔ ایسا تو کبھی رقص وتماشا نہ ہوا تھا۔ محبت

ؔ جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم۔ میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا غالب

ؔ جتنا کہ کف پا ہیں تیری نور ہے اے ماہ۔ روشن کبھی اتنا ید بیضا نہ ہوا تھا محبت

ؔ چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے۔ خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا غالب

محبت خاں کی اس غزل کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس طویل غزل میں محبوب کی بے اعتنائیاں، مظالم تسلسل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور کوئی مضمون نہیں باندھا ہے، مجولہ بالا محبت کا آخری شعر اس غزل کا بھی آخری شعر ہے جس میں محبوب کے کف پا کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ شعر مبالغہ کی مثال ضرور ہے لیکن ایک اچھے شعر کے زمرے میں آتا ہے۔ چند اشعار اور پیش خدمت ہیں۔

ے ہم آبلہ پا جب سے ہوئے بادیہ پیما ۔ افسوس کہ کانٹا بھی کوئی بن میں نہیں ہے — محبت
ے کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ۔ اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے — غالب
ے دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا یہ ۔ میرا غبار کیجو برباد اس طرح کا — محبت
ے جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی ۔ لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی — غالب
ے گل زخو اس دل دیوانہ کو زنجیر کرو ۔ اس کی زنجیر وُوے زلف گرہ گیر کرو — محبت
ے قید میں بھی تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد ۔ ہاں کچھ اک رنج گرانباریٔ زنجیر بھی تھا — غالب

اشعار کی روشنی میں ہم بلا تردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے زیر مطالعہ دیگر اساتذہ کے دواوین کے ساتھ ساتھ محبت کا کلام اردو بھی رہا ہوگا ۔ غالب محبت کے بعد کے[1] شعراء میں سے ہیں لیکن انہوں نے اپنے پیش رو اہل سخن سے استفادہ کرنے کے بارے میں خود ہی کہا ہے ۔ محبت اور غالب کے خیالات میں کافی یکسانیت موجود ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے دونوں شعراء کے کلام میں پختگی پائی جاتی ہے، غالب کے دور تک اردو زبان میں مزید ترقی ہوگئی تھی اور اس میں نکھار پیدا ہو گیا تھا ۔ بعض تنقید نگاروں کے مطابق غالب جدید غزل کے بانیوں میں سے ہیں اور جدت طرازی و نکتہ آفرینی میں اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ محبت کے اشعار سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ متاخرین اور غالب کے درمیان محبت ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ محبت کی اردو شاعری کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک فارسی گو شاعر ہوتے ہوئے بھی اردو میں فارسی الفاظ کا استعمال کم کرتے ہیں جبکہ غالب نے فارسی تراکیب کو اردو شاعری میں اس طرح مستعمل کیا کہ انہیں اردو کا حصہ بنا دیا ۔ دونوں اساتذہ کا فارسی کا مطالعہ وسیع ہے اسی لئے فارسی غزل کی خوبیاں ان کی اردو غزلیات میں موجود ہیں ۔ محبت یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ انکی مادری زبان پشتو ہے وہ غزل میں اپنے دور کی مروجہ تراکیب اور الفاظ استعمال کرتے ہیں ان کی غزل کی سہل انگیزی اور غالب کی غزل کی مشکل پسندی کا قدرے ثقیل الفاظ کا استعمال دونوں شعراء کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے غالب، محبت سے تقریباً آدھی صدی بعد پیدا ہوئے اس کے باوجود غالب کا تتبع کرنا، محبت کی عظمت اور

---

[1] غالب کا سن پیدائش ۱۷۹۷ء اور محبت خاں کا سن پیدائش ۱۷۵۰ء ہے ۔

اور غالب کی خوش چینی کی دلیل ہے۔ جن شعرا کی خوبی غالب سے ملتی تھی انہوں نے ان کے خیالات میں جدت پیدا کرکے نیا انداز اختیار کیا۔ محبت کے بارے میں ہمیں ایک اور بات ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ جس دور میں وہ پاکیزہ شاعری کو اختیار کرتے ہیں وہ دور انشاؔ اور جرأت کا دور ہے اور جس دبستانِ شاعری میں ان کی اردو شاعری پروان چڑھ رہی ہے وہ لکھنوٴ دبستان شاعری کے نام سے مشہور ہے اور وہی شاعر زیادہ شہرت یافتہ ہوئے جو دربار سے نزدیک رہے اور دربار کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔ اپنے ہم عصر شعرا میں مقبول نہ ہونے کا ایک سبب یہی تھا کہ محبت دربار سے دور رہتے تھے ان کا آصف الدولہ سے تعلق تھا ضرور مگر وہ ایک نواب بھی تھے لہذا آپ نے دیکھا کہ میرؔ اور غالب کی خودداری کے قصے مشہور ضرور ہیں لیکن ان میں اتنی سچائی نہیں ہے جتنی محبت کی خوددار طبیعت میں پائی جاتی ہے، ان کے دیوان میں اس دور کے نوابین تک کا کوئی قصیدہ نہیں ملتا جن کے توسط سے انہیں انگریز سرکار کی سے انہیں وظیفہ ملتا تھا، انہوں نے کسی سے انعام واکرام وصول نہیں کیے اور قناعت پسندانہ زندگی بسر کی اور وہ نوابانہ روش اختیار کی جو نوابین روہیل کھنڈ کا طرۂ امتیاز تھا۔

اب ہم محبت، حسرت[2] اور درد کی ردیف "د" میں یہ غزلیات دیکھتے ہیں۔

حسرت[1]

- نازک دلوں کے زخم کا مرہم کبھو نہ ہو ۔ پیرہنِ حباب پھٹے تو رفو نہ ہو
- ساقی کہاں ہے خندۂ قلقل کی اب امید ۔ شیشہ کو دیکھ کر یہ کرہ گر گلو نہ ہو
- سچ مچ کے بت ہیں ناز وتکبر سے یہ صنم ۔ آپس میں یہ ملیں تو بہم گفتگو نہ ہو
- جتنا ہو داغ داغ یہ اتنا ہی خوف ہے ۔ وہ دل نہیں کہ جس میں محبت کی بو نہ ہو
- جسکی نہاد ہی میں کجی ہے کماں کی طرح ۔ رو اس کا مثلِ تیر کبھی ایک سو نہ ہو
- یا رو یہ میری حسن پرستی ہے جی کے ساتھ ۔ ہر چند جان جائے یہ تبدیل خو نہ ہو

---

[1] محبت خاں کے دور میں شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خاں نوابین لکھنوٴ رہے۔
[2] جعفر علی حسرت اردو شاعری میں محبت خاں کے استاد تھے۔

ے یہ ہو سکے ہے یار جہاں تو ہو ہم نہ ہوں - پر یہ نہ ہو سکے کہ جہاں ہم ہوں تو نہ ہو

ے حسرت کے دل میں کب سے تمنائے قتل ہے - ہر چند حاصل اس کی کبھی آرزو نہ ہو

ے لیکن ڈرا تو دے اسے شمشیر کھینچ کر - شرمندگی سے تا یہ کبھی روبرو نہ ہو

غزل دہ محبت ملا

ے الفت میں جس کے اشک بہانے کی خو نہ ہو - اس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

ے اب جو ڑسر میں آگے نہ کہتا تھا تجھ سے دل - معشوق اور ستم نہ کرے یہ کبھو نہ ہو

ے اس کو نہ جان چاک گریباں کی طرح تو - ناصح یہ چاک دل ہے کہ ہرگز رفو نہ ہو

ے حیراں ہیں تیرے حسن پہ سب پوچھنا ہے کیا - بولوں تب آئینہ جو ترے روبرو نہ ہو

ے مانند بوئے گل کہ ہمیشہ ہے گل کے ساتھ - کیا دخل ہے کہ یار میرے دل میں تو نہ ہو

دل میں میرے خدا سے محبت بقول درد

یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو[1]

غزل[1] میر درد

ے کیا فرق داغ و گل میں کہ جس گل میں بو نہ ہو - کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

ے ہووے نہ حول و قوت اگر درمیاں ترے - جو ہم سے ہو سکے ہے سو ہم سے کبھو نہ ہو

ے جو کچھ کہ ہم نے کی ہے تمنا ملی مگر - یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو

ے جوں شمع جمع ہوویں گر اہل زباں ہزار - آپس میں چاہئیے کہ کبھی گفتگو نہ ہو

ے جوں صبح چاک سینہ مرا اے رفوگراں - یاں تو کسو کے ہاتھ سے ہرگز رفو نہ ہو

ے اے درد زنگ صورت اگر اس میں جا کرے

اہل صفا میں آئینۂ دل کو رو نہ ہو

---

[1] خواجہ میر درد: اردو دیوانِ درد: لاہور - ص - ۷۰

حسرت، درد اور محبت کی ایک ہی زمین میں موجود غزلیات آپ کے پیشِ نظر ہیں، محبت کی غزل سادگی و روانی کے لحاظ سے ان دونوں اساتذہ کی غزلوں سے سبقت لے گئی ہے۔ درد کی محولہ بالا غزل محبت کے زیرِ مطالعہ تھی، محبت نے مقطع میں آن کا مصرع بعینہٖ استعمال کرکے اپنی غزل کے مقطع کو ایک مشاق شاعر کی طرح مکمل کیا ہے۔ اس غزل سے حسرت، درد اور محبت کا اپنا اپنا منفرد انداز نمایاں ہے، حسرت اور محبت کی غزل سے رنگ تغزل جھلکتا ہے تو میر درد تصوف کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ محبت کے کلام میں حسرت اور جراُت کا رنگ کسی حد تک پایا جاتا ہے، اس حقیقت کو انھوں اپنے اشعار کے ذریعے یوں ظاہر کیا ہے۔ محبت خاں اپنے استاد حسرت کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے البتہ وہ اپنے ملازم و ہمعصر جراُت کے بارے میں بھی یہ فرماتے ہیں کہ قوافی کی نشست کی خوبی وہ خود اور یا پھر جراُت بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ فی الحال ہم محبت اور میر تقی کے اشعار پیش کرتے ہیں تاکہ میر اور محبت کا موازنہ اشعار کے آئینہ میں کیا جاسکے، اس کے بعد جراُت اور حسرت کے علاوہ دیگر محبت کے ہمعصر شعراء سے ان کا موازنہ کیا جائے گا۔

ردیف "و" اور "ے" میں محبت اور میر کے اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

؎ کرتی ہے خوں وہ ابروئے خمدار ایک دو۔ کھینچی ہے اس کے حسن پہ تلوار ایک دو۔	محبت
؎ تک چشم میں وہ سرمہ کا دنبالہ کھینچئے۔ اس مست کے بھی ہاتھ میں تلوار ایک دو۔	میر
؎ دل گاہ گاہ میں کبھی دونوں غرض کہ یار۔ رہتے ہیں تیری چشم سے بیمار ایک دو۔	محبت
؎ کس کس پہ اس کو ہووے نظریاں پر ایک شب۔ جیویں ہیں اس کی چشم کے بیمار ایک دو۔	میر
؎ فرہاد و قیس آگے تھے میں اور محبت اب۔ یہ عشق کر رہے ہے گرفتار ایک دو۔	محبت
؎ کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں۔ کچھ اس گلی میں ہم ہی نہیں خوار ایک دو۔	میر
؎ روؤں تو ابر رونے کا دعویٰ نہ کر سکے۔ ہم چشمی میرے اشک سے دریا نہ کر سکے۔	محبت
؎ مت سرسری کم سے میری چشم تر کو دیکھ۔ چشم ہے یہ وہ جس سے کہ دریا ابل سکے۔	میر
؎ وہ مہر یہ ہے جس پہ ٹھہرتی نہیں نگاہ۔ اب دید اس کا کر سکے کوئی نہ کر سکے۔	محبت
؎ خورشید تیرے چشم کے آگو نہ آسکے۔ اس کو جگر بھی شرط ہے جو تاب لا سکے۔	میر

گذشتہ اشعارِ محبت اور میرؔ کس قدر یکسانیت رکھتے ہیں! اندازِ فکر اور تخیل ایک خاص عہد کی ترجمانی کر رہا ہے جس میں اردو غزل زبان و بیان کے اعتبار سے ترقی کی منازل طے کرتی نظر آتی ہے۔ معنویت کے لحاظ سے بھی میرؔ اور محبتؔ کے اشعار ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔

محبتؔ کے دیوانِ اردو میں چند غزلیں ایسی بھی ہیں جو سوداؔ، حسرتؔ، میر دردؔ اور دیگر شعرا کے دواوین میں ایک ہی زمین میں موجود ہیں۔ اس ضمن میں ردیف "م" میں ایک غزل پیشِ خدمت ہے۔

غزل[۱] ردیف "م" سوداؔ

بے دیدۂ تر جدھر گئے ہم ۔ ڈیرے تھے جو خشک بھر گئے ہم

تجھ عشق میں روزِ خوش نہ دیکھا ۔ دکھ بھرتے ہی بھرتے مر گئے ہم

تیرا جو ستم ہے اس کو تو جان ۔ اپنی سی تو خوب کر گئے ہم

یہ قطعہ پڑھے تھا سوزِ دل سے ۔ سوداؔ کے جو رات گھر گئے ہم

جوں شمع لبوں پہ آرہا جی ۔ تھا تن سو گداز کر گئے ہم

اتنی بھی پتنگ پیش قدمی ۔ گر شام نہیں سحر گئے ہم

ہوگی نہ کسی کو یہ خبر بھی
اس بزم سے آکدھر گئے ہم

غزل[۲] ردیف "م" حسرتؔ

کٹ بھی چکتی غم میں مر گئے ہم ۔ بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم

عقبیٰ کی بھی کچھ خبر نہیں ہے ۔ دنیا سے تو بے خبر گئے ہم

شبنم کی مثال اس چمن میں ۔ شب آئے تھے پھر سحر گئے ہم

کر ملک تو اثر کہ اپنے جی سے ۔ اے نالۂ بے اثر گئے ہم

کل روتے ہوئے جو اتفاقاً ۔ حسرتؔ کے مزار پر گئے ہم

---

[۱] کلیاتِ سوداؔ: مطبع نامی گرامی پریس منشی نولکشور کانپور۔ ص ۳۱۷۔
[۲] دیوانِ حسرتؔ مرتبہ فضل الحسن موہانی میں یہ شعر اس طرح ہے ۔ آخر تیرے غم میں مر گئے ہم ۔ بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم

ے پڑھتا تھا یہ شعر تہہِ خاک - بس سنتے ہی جس کے مر گئے ہم
ے واماندوں پہ دیکھیے کہ کیا ہو - دنیا سے تو نباہ کر گئے ہم

غزل ردیف "م" محبتؔ

ے دنیا سے تو کر گئے سفر ہم - افسوس پر کچھ نہ کر گئے ہم
ے جو اشک بدیدہ ہائے مردم - آئے کہ وہیں گذر گئے ہم
ے خاطر سے تیری میاں نہ بولے - اغیار سے کہہ تو ڈر گئے ہم
ے تجھ سے نہ ہوا علاج افسوس - اور یونہی مسیح مر گئے ہم
ے آنکھوں سے تجھے کہیں نہ دیکھا - گویا اِدھر اُدھر گئے ہم
ے اٹھتے ہی محبتؔ اس کے در سے
افسوس کہ در بدر گئے... ہم

غزل ردیف "م" دردؔ

ے اب کے تیرے در سے گر گئے ہم - پھر یہ سمجھ کہ مر گئے ہم
ے جوں نور بصر تیرا تصوّر - تھا پیش نظر جدھر گئے ہم
ے کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے - معلوم نہیں کدھر گئے ہم
ے تھا عالمِ جبر کیا بتا ویں - کس طور سے زیست کر گئے ہم
ے جس طرح سے ہوا اسی طرح سے - پیمانۂ عمر بھر گئے ہم
افسوس دردؔ اس کو جب تک
ہو ملے ہی خبر گذر گئے ہم

ان چاروں غزلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب محبتؔ خاں سوز و گداز اور آہ و فغاں کے مضامین اپنی غزل میں اختیار کرتے ہیں تو ان کی غزل میرؔ کے رنگ سے ملتا جلتا رنگ قائم کرتی ہے لیکن جب وہ حوصلہ مندی اور جگرداری

کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ان کا رنگ میر اور درد سے جدا ہوتا ہے، محبت کی محولہ غزل سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سودا
حضرت درد، حسرت اور محبت نے درد کے رنگ ہی کو اپنایا ہے جس میں حسن وعشق، واردات قلبی کے ساتھ ساتھ
تصوف کا رنگ بھی غالب ہے۔ درد کی غزلوں کی زمین میں محبت کی چند غزلوں اور چھوٹی بحروں کا درد
کا انداز محبت نے اپنایا تھا — غالباً یہی سبب ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں نے محبت کو درد کا شاگرد لکھ دیا ہے۔
جذبات کی پاکیزگی، دنیا کی بے ثباتی کے مضامین باندھتے وقت جذبے کی سچائی، دنیا کو مختصر مدت کے قیام
کی جگہ ہونے کا دونوں شاعر احساس دلاتے ہیں۔ درد اپنی زندگی کو عالم جبر گردانتے ہیں تو محبت کے غم کا
علاج کرنے والا کوئی مسیحا نظر نہیں آتا اور مرض عشق ہی کی شدت سے اس دار فانی سے کوچ کر جاتے
ہیں۔ محبت اور درد کا اسلوب ملتا جلتا ہے حالانکہ درد تمام عمر دہلی میں رہے جبکہ محبت کا قیام
روہیل کھنڈ اور لکھنؤ میں رہا لیکن یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ درد کے اشعار ہی نہیں
بلکہ درد کا اردو دیوان محبت کے زیر مطالعہ رہا، انہوں نے ایک ہی قافیہ ردیف میں جو غزلیں کہی ہیں
وہ اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ محبت درد سے متاثر تھے۔ محبت اور درد کی یہ غزلیں دیکھئے۔

غزل۔ محبت

~ اگر دیکھے ذرا آ کر ہماری چشم حیراں کو ۔ کہے نوح الاماں اور بھول جاوے اپنے طوفاں کو
~ جو ایسا سامنے بڑھ بڑھ کے اے دل امنے ہوتا ہے ۔ نہیں دیکھا ہے کیا تو نے مگر اس تیر مژگاں کو
~ ہوا آدم تب آدم جب ہوا اجمالِ یار نجم ۔ یہی تو فرق ہے گر ہے ذرا حیواں سے انساں کو
~ نہ واقف دیر سے ہوں میں نہ ہوں آگاہ کعبے سے ۔ جو دل کا آشنا ہو جانے کیا گبر و مسلماں کو
~ اِدھر گر سیکڑوں اوراق دل کے کر دیے ابتر ۔ اُدھر منہ پر جو کھولا تو نے اس زلف پریشاں کو
~ یہاں ہر داغ گل اور سینہ بہتر ہے گلستاں سے ۔ کروں گا کیا میں اے بلبل ترے گل اور گلستاں کو
~ یہی ہے مدعا تیرا نہ دیکھوں میں سوا تیرے حال ۔ لو وقت ذبح تو مت باندھ میری چشم حیراں کو

محبت آبلہ پا کو ہوئی ہے اب کے پھر وحشت
یہ مژدہ جا کے پہنچا دو کوئی خار بیاباں کو

غزل۔ درد

ملاؤں کس کی آنکھوں سے کہو اس چشمِ حیراں کو ۔ عیاں جب ہر جگہ دیکھوں اسی کے رازِ پنہاں کو

تجھے اے شمع کیا دیکھیں زمانہ تو دکھاتا ہے ۔ ہمیں جو کاغذِ آتش زدہ اور ہے چراغاں کو

نہ تنہا کچھ یہی اطفال دشمن ہیں دوانوں کے ۔ بھرے ہے کوہ بھی دیکھا تو یاں پتھروں سے داماں کو

چمکتے ہیں ستاروں کی طرح سوراخ سینے کے ۔ چھپایا گو کہ جوں خورشید میں داغِ نمایاں کو

نہ واجب ہی کہا جاوے نہ صادق ممتنع اس پر
کیا تشخیص کچھ ہم نے نہ ہرگز شخص امکاں کو

مندرجہ بالا غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبت کی غزل بھرپور اندازِ غزل لیے ہوئے ہے، دونوں غزلیات میں استعمال ہونے والے قوافی مختلف ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبت نے ان قوافی سے دانستہ اجتناب کیا ہے اور توارد سے دامن بچاتے ہوئے بطریقِ احسن اس غزل کو بہتر غزل کے درجے تک پہنچایا ہے۔ درد کے مقابلے میں محبت کی غزل ممکنہ حد تک سادہ اور واضح ہے اور اس غزل کے نکھارنے میں محبت پیش پیش نظر آتے ہیں۔

محبت اور درد کے چند ایسے اشعار دیکھئے جو ملتا جلتا تخیل رکھتے ہیں۔

دل کو گنوایا جان و جگر کو نہ کھو سکا ۔ مجنوں سے ہوں زیادہ پہ مجنوں نہ ہو سکا۔	محبت
تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا ۔ میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا۔	درد
ہم چشمی ابر مجھ سے تو کرتا ہے رات دن ۔ اک آن میرے ساتھ پر دیکھو نہ رو سکا	محبت
وحشتِ عدم میں جا کے نکالوں گا جی کا غم ۔ کنجِ جہاں میں کھول کے دل میں نہ رو سکا	درد
کیا مرتے مرتے لے موا مجھ کو بھی یارِ دل ۔ دل کا شکار میں ہوا تیر اشکار دل	محبت
بارے یہ داغِ عشق ہوا شہریارِ دل ۔ مدت سے بے چراغ پڑا تھا دیارِ دل	درد

~ تیری بس گلی سے گیا تھا خیال میں - کرتا ہوں اب تلک میں پڑا انتظارِ دل — درد

~ میں اپنے دل کو روؤں سو کیا کل اسی طرح - کوچے میں اس کے دیکھے پڑے سو ہزار دل — محبت

~ اٹھتا ہے بعدِ مرگ بھی مانند گرد باد - اے درد خاک سے میری اب تک غبارِ دل — درد

~ لالہ کی نو بہار گلستاں میں ہے ولے - تیرا عجب رکھے ہے محبت بہار دل — محبت

~ نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو - الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضیِ الٰہی ہو — درد

~ جنوں ہے میں ہوں اور رسوا اگرچہ جگ ہنسائی ہو - ہوا ہیں اک طرف کو اک طرف ساری خدائی ہو — محبت

~ پیاسی مرے لہو کی وہ رہتی ہے دم بدم - بر لائیے کبھو تو میاں آرزوئے تیغ — درد

~ رکھتی ہے یہ بہار کے عاشق کے خون سے - کر دے زمیں کو غیرتِ گلزار تیری تیغ — محبت

~ لایا نہ تھا تو آج تلک ہاتھ سوئے تیغ - وابستہ میرے قتل سے تھی آبروئے تیغ — درد

~ شمشیر کھینچنے کی نہیں احتیاج کچھ - ہے میرے حق میں ابروئے خمدار تیری تیغ — محبت

محولہ بالا اشعار کے تناظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ درد کے اشعار سے تصوف اور رضائے الٰہی کے ساتھ صبر و استغنا کی عکاسی ہوتی ہے تو محبت کے اشعار غزل کے دھنک رنگ بکھیرنے کے ساتھ زندگی کی ترجمانی بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں کے کلام میں غم و اندوہ زندگی کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ درد اور محبت دونوں کے کلام میں پاکیزگی اور زبان و بیان کا لطف موجود ہے۔ جہاں تک فکر و اسلوب کا تعلق ہے تو ہم درد اور محبت کے فرق کو ایک شعر کے ذریعے واضح کرتے ہیں جو محولہ بالا اشعار میں موجود ہے۔ درد فرماتے ہیں،

~ اٹھتا ہے بعدِ مرگ بھی مانندِ گرد باد - اے درد خاک سے مری اب تک غبارِ دل

اس شعر سے درد کا عارفانہ انداز غم و اندوہ کا سماں بھی پیدا کر دیتا ہے۔ محبت کا انداز دیکھیے۔

~ لالہ کی نو بہار گلستاں میں ہے ولے - تیرا عجب رکھے ہے محبت بہار دل

محبت درد کے مقابلے میں ماحول کو رنگین اور پر بہار بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور مختصر مگر جامع گفتگو ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا پہلو نمایاں کرتی ہے۔ اب ہم اس دور کے ایک اور مشہور شاعر جرأت

جو کہ نواب محبت کی سرکار میں ملازم تھے اور یہ دونوں حضرت کے شاگرد بھی تھے، کے اشعار سے محبت کے کلام کا موازنہ کرتے ہیں۔ پہلے وہ شعر ملاحظہ فرمائیے جس کے قافیہ ردیف میں حضرت کے تمام شاگردوں کی غزل موجود ہے۔

- جاں بخشی کو آیا نہ وہ دم نزع حسن ۔ اس نے اس وقت بھی ہم سے چھپائیں آنکھیں — حسن
- ہو غضبناک جو قاتل نے دکھائیں آنکھیں ۔ اور تو بس نہ چلا میری بھر آئیں آنکھیں — جرأت
- فتنہ گر تو نے جو ٹک ہم سے ملائیں آنکھیں ۔ ایسے ہم روئے کہ آشوب کر آئیں آنکھیں — محبت

محبت اور جرأت کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے، ان میں کس قدر مطابقت پائی جاتی ہے

- بستا تھا کب چمن میں صیاد اس طرح کا ۔ ہے اپنے دم قدم سے آباد اس طرح کا — جرأت
- کرتا ہے بند مجھ پر خاکِ قفس بھی ظالم ۔ مجھ کو ملا ہے بلبل صیاد اس طرح کا — محبت
- تھی جائے عیش و عشرت اب خاک بھی نہیں ہے ۔ کوئی نگر کرے گا برباد اس طرح کا — جرأت
- دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا یہ ۔ میرا غبار کیجو برباد اس طرح کا — محبت
- یوں دل کو چھین لینا سیکھا ہے کس سے تو نے ۔ ہرگز نہیں کسی کو ڈھب یاد اس طرح کا — جرأت
- یاں کس کو قتل کا ڈھب ہے یاد اس طرح کا ۔ ہے تو ہی اس جہاں میں جلاد اس طرح کا — محبت
- ہو گیا وہ مجھ سے برہم آہ و زاری کے سبب ۔ مجھ پہ جو گزرا سو گزرا بے قراری کے سبب — جرأت
- نیند کھونے سے مجھے ہمسایوں کی کیا کام تھا ۔ کیا کہوں کرتا ہوں نالے بے قراری کے سبب — محبت
- کیا کہوں اے ماہ تجھ بن شغل کیا رہتا ہے آہ ۔ دن کٹے نالوں سے شب اختر شماری کے سبب — جرأت
- ہجر کی اس شب میں ٹک اے ابر تو مت آئیو ۔ رات کٹتی ہے ذرا اختر شماری کے سبب — محبت
- مت خفا ہو ہم ابھی آ نکلے جو محفل میں تری ۔ اختیار اپنا نہیں بے اختیاری کے سبب — جرأت
- مت خفا ہو مجھ سے تو واللہ میرا ہاتھ یار ۔ جا پڑا تیرے گلے بے اختیاری کے سبب — محبت
- ہم کئی دن سے نہیں سنتے فغانِ عندلیب ۔ کیا گرا آخر چمن سے آشیانِ عندلیب — جرأت
- نالۂ بلبل کی ہے تاثیر یہ شبنم نہیں ۔ ہر سحر روتے ہیں گل سن کر فغانِ عندلیب — محبت

ـــ بر ہم کبھی قاصد سے وہ محبوب نہ ہوتا ۔ گر نالہ ہمارا سرِ مکتوب نہ ہوتا — جرأت

ـــ تب نالے کے کچھ کہنے کی ہوتی ہمیں حاجت ۔ جب لختِ جگر صورتِ مکتوب نہ ہوتا — محبت

ـــ مجھ کو روتے ہی گذری ساری رات ۔ ہجر کی بھی بلا ہے بھاری رات — جرأت

ـــ شبِ فراق ہے یا آسمان نجم لوٹا ۔ الٰہی ہو گئی یہ آج کیسی بھاری رات — محبت

ـــ رونے ہی سے ہے یہ گرم بازارِ لختِ دل ۔ یعنی ہیں طفلِ اشک خریدارِ لختِ دل — جرأت

ـــ کیوں کر لہو نہ روؤں محبت فراق میں ۔ اس کا تو غم ہے مجھ سے طلبگارِ لختِ دل — محبت

ـــ ہم کیا کہیں گے سیرِ چمن کر کے ہم نشیں ۔ ہے سو لالہ ہوا ہے چشم میں گل زارِ لختِ دل — جرأت

ـــ جھولی میں بھر کے گل میں چمن سے نہ لاؤں گا ۔ دامن میں میرے ہو لالہ ہے گل زارِ لختِ دل — محبت

ـــ نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا ۔ ، غالباً یہ مصرع کسی مشاعرے میں طرح کے طور پر دیا گیا ہو گا لہٰذا اس پر محبت اور جرأت دونوں نے گرہ لگائی ہے ۔

ـــ دردِ دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا ۔ نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا — جرأت

محبت نے اس مصرع کو ایک جگہ اس طرح استعمال کیا ہے ۔

ـــ کون سے روز میں سر سنگ سے مارا نہ کیا ۔ ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا — محبت

ـــ یہ مرض کا مرے تو نے کبھی چارا نہ کیا ۔ دردِ دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا — ؍؍

نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا [1] — ؍؍

لکھنؤ میں محبت اور جرأت کا ساتھ رہا ۔ جرأت شعر و سخن کے علاوہ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے ، دونوں کا ایک ہی دور اور ایک ہی استاد رکھنے کے باوجود اپنی اپنی علیحدہ فکر اور ڈھنگ ہے ۔ اس دور کے طرحی مشاعروں میں محبت حصہ نہ بھی لیتے ہوں لیکن مصرع طرح پر طبع آزمائی ضرور کرتے تھے لہٰذا ، توارد کا ہونا قرین از قیاس ہے ۔

---

[1] محبت نے جرأت کا یہ مکمل شعر اس مخمس میں استعمال کیا ہے ۔

محبت کے ہم عصر اور اس دور کے مشہور لکھنوی شاعر جرأت جو دلی میں بھی ایک عرصہ گزار چکے تھے اور دلی میں وہ معاملہ بندی کے اشعار کہتے ہوئے شرماتے تھے جب لکھنؤ پہنچتے ہیں تو وہاں کے ماحول کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔ ہم نے محبت اور جرأت کے جو اشعار پیش کیے وہ تخیل کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ زیادہ تر ایک ہی بحر و وزن میں ہیں۔ ان اشعار کو دیکھ کر ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ محبت کے اشعار ہر اعتبار سے بلند معیار رکھتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں جرأت تذکرہ نگاروں کے قلم کی زد میں آتے رہے اور ان کا ذکر محبت سے زیادہ تفصیل سے آپ کو دستیاب ہو گا۔ اس کا ایک سبب تو یہ نظر آتا ہے کہ جرأت معاملہ بندی کے شاعر تھے اور لکھنؤ شاعری پر اس دور میں دربار کا اثر تھا، عوام و خواص کا مزاج اس طرح کا بن چکا تھا کہ وہ ایسی شاعری کو پسند کرنے لگے تھے جو لوگوں کے جذبات ابھارے یا کسی پر پھبتیاں کسی جائیں اور دوسرے حضرات اس سے محظوظ ہوں۔ عوام کی اخلاق پستی نے شعراء کو بھی اپنی جانب کھینچ لیا لیکن ان شعراء میں محبت خاں شامل نہیں۔ جرأت زود گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عام مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے لہٰذا ان کی وجہ شہرت ان کا عوامی انداز تھا جو انہوں نے اپنی شاعری کے علاوہ اپنی ذات میں بھی بسا لیا تھا۔ محبت اور جرأت کے کلام کا فرق تخیل، معنی آفرینی اور روانی و سادگی کا فرق ہے جو ان چند اشعار سے ہم دوبارہ نمایاں کرتے ہیں۔

؎ کیا کہوں اے ماہ تجھ بن شغل کیا رہتا ہے آہ ۔ دن کٹے نالوں سے شب اختر شماری کے سبب ۔ جرأت

؎ ہجر کی اس شب میں ٹک اے ابر تو مت آئیو ۔ رات کٹتی ہے ذرا اختر شماری کے سبب ۔ محبت

معنی آفرینی اور سادگی و روانی محبت کے شعر کی قابلِ داد ہے۔

؎ بہ ہم کبھی قاصد سے وہ محبوب نہ ہوتا ۔ گر نالہ ہمارا سرِ مکتوب نہ ہوتا — جرأت

؎ تب نامے کے لکھنے کی ہوتی ہمیں حاجت ۔ جب لختِ جگر صورتِ مکتوب نہ ہوتا — محبت

یہ شعر بھی دونوں کے اندازِ فکر کی وضاحت کرتا ہے۔ محبت اپنے اشعار کو زیادہ پُر فکر بناتے ہیں۔

محبت اور اردو غزل

محبت خاں کی اردو غزل پر تبصرہ کرنے سے پہلے اگر ہم برصغیر کے تاریخی پس منظر کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ برصغیر میں بہت سی نسلیں آ آ کر آباد ہوتی رہیں ہر آنے والی قوم اپنے ساتھ اپنا مذہب اپنی زبان اور تہذیب و تمدن لائی لہذا اس نے یہاں کے باشندوں کی طرزِ معاشرت پر بھی اثرات چھوڑے ۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کو عظیم تر بنانے میں مسلمان فاتحین کا بڑا ہاتھ ہے ۔ عرب محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ میں داخل ہوئے اور اس حصے کو خالص عربی تہذیب کے رنگ میں رنگ دیا یہی وجہ ہے کہ سندھی رسم الخط بھی عربی ہے اور سندھی زبان میں عربی کے الفاظ کی بڑی تعداد موجود ہے مسلمانوں کی آمد کا دوسرا راستہ درۂ خیبر تھا ، یہ مسلمان ترک ، ایرانی اور افغانی تھے جو اپنے ساتھ عربی مذہب لائے تھے لیکن انکا تمدن عجمی تھا ۔ نواب محبت خاں کے آباو اجداد پشاور کے سرحدی علاقے سے مغلیہ دور میں ہندوستان آئے ، ان کی مادری زبان پشتو تھی لیکن ان کی تعلیمی زبان فارسی تھی یہ لوگ دیندار ہونے کے ناطے عربی زبان سے شغف رکھتے تھے ان کے خاندان میں اہل اللہ اور عالم و فاضل اشخاص موجود تھے۔

اردو شاعری اور غزل کا جب بھی ذکر آئے گا تو حضرت امیر خسرو[۱] کا اسمِ گرامی بھی ضرور لیا جائے گا۔
حضرت امیر خسرو غیاث الدین تغلق کے عہد میں اسکے سردار ملک چھجو کی سرکار سے وابستہ تھے اور یہ تغلق کے عہد میں فوت ہوئے انکی فارسی اردو غزل " اردو غزل کی ابتدا کہلاتی ہے ۔

؎ زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں ۔
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں ۔

؎ شبانِ ہجراں دراز چو زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کاٹوں کیسے اندھیری رتیاں ۔

دکن کے قدیم شعراء میں وجہی اور محمد قلی قطب شاہ شامل ہیں ، قلی قطب شاہ صاحبِ دیوان شاعر ہیں اور وجہی ان ہی قطب شاہیوں کے دربار کا شاعر تھا ۔ ولی کو نسبتاً ترقی یافتہ زبان

---
۱ حضرت امیر خسرو کا دور ۸ ویں صدی ہجری مطابق ۱۴ ویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا

گذشتہ صفحات میں ہم نے میرؔ، دردؔ، حسرتؔ، جرأتؔ اور غالبؔ کے اشعار و غزلیات کے ساتھ محبتؔ کے کلام سے موازنہ کیا، یہ شعراء اس دور کے نمائندہ شاعر تھے جبکہ غالبؔ بعد میں آنے والے وہ عظیم شاعر ہیں جن کا دور آج تک ختم نہیں ہوا۔ محبتؔ نے دردؔ کا اثر قبول کیا لہٰذا دردؔ کے جب وہ اشعار ملتے ہیں جن میں عشق کی کارفرمائیاں پائی جاتی ہیں تو ایسے اشعار محبتؔ کے اُن اشعار کی طرح ہیں جن میں سہلِ ممتنع کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے محبتؔ کی اردو غزل اپنے استاد حسرتؔ اور ہم عصر جرأتؔ سے بھی ایک قدم آگے نظر آتی ہے۔ حسرت و جرأت کے کلام میں معاملہ بندی کے اشعار پائے جاتے ہیں خاص طور پر جرأت تو اس میدان کے شہسوار ہیں لیکن محبتؔ کی غزل ان آلائشوں سے مکمل طور پر پاک ہے۔ چند اشعار ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جن میں "بوسے" تک بات پہنچ جاتی ہے۔ محبتؔ میرؔ کو تو خاطر میں ہی نہیں لاتے البتہ میرؔ سے زیادہ وہ دردؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ محبتؔ کا انداز ان تمام شعراء سے منفرد ہے اور یہی ایک بڑے شاعر کا کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ محبتؔ فرماتے ہیں :-

؎ اب محبتؔ کی غزل سن کر خجالت سے بہت ۔ رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

؎ کہنے میں شعر کے اب جتنا ہے تو محبتؔ ۔ میں ایک بھی نہ دیکھا استاد اس طرح کا

———x———

ملی اور انھوں نے غزل کے لیے ایک زبان بنائی بھی[1] - ولی کی اردو غزل کو غزل کی نکھری صورت کہا جاسکتا ہے، اسی لیے ولی کو اردو کا پہلا مستند شاعر کہتے ہیں - ولی عالمگیر کے عہد میں ایک مرتبہ دلی آئے تو سعد اللہ گلشن نے مشورہ دیا تھا کہ وہ فارسی کے بھی مضامین کو کام میں لائیں لہٰذا اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد ہی اردو شاعری فارسی اور ہندی شاعری کے اثرات کا سنگم ٹھہری - یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ولی نے تراکیب کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کیا جو پہلے اردو شاعری میں موجود تھا -

اردو غزل مغلیہ دور کے اس حصے میں پروان چڑھی جبکہ مغل اقتدار یا اسلامی ہندوستان دور بہ زوال تھا - یہ ہندوستانی معاشرہ سوگوار ماحول لیے ہوئے تھا، اسی معاشرے اور ماحول میں اردو غزل پھلی پھولی - ولی کے بعد میرؔ، سوداؔ، اور دردؔ اردو غزل کے ستون ٹھہرے لیکن میرؔ ہی کے ایک ہم عصر جو غالباً نوابینِ اودھ کی سیاحت و عدمِ توجہ کا شکار رہے اُن کو نواب محبت خاں محبتؔ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - محبت نے اردو غزل کی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس لکھنوی معاشرے میں جہاں انشاؔ اور جرأتؔ معاملہ بندی کی شاعری کرکے واہ! واہ! سمیٹ رہے تھے، محبت نے غزل کے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا اور جس وقت ہندوستان میں میرؔ کا طوطی بولتا تھا اس وقت آپ نے فرمایا ہے

ے اب محبت کی غزل سن کر خجالت سے بہت - رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

غزلیاتِ محبت سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ محبتؔ خاں کی اردو شاعری اس دور کے بڑے بڑے غزل گو شعراء سے کسی طرح بھی کم نہیں، اس بات کا اعتراف استادِ محبت، جعفر علی حسرتؔ اور محبت کے شاگردِ رشید میر ضیاالدین عبرتؔ نے اپنی مشہور مثنوی پدماوت میں بھی کیا ہے، جسکا ذکر ہم محبت خاں کی علمی قابلیت کے باب میں کر چکے ہیں - علاوہ ازیں بیشتر تذکروں میں بھی محبتؔ کی اردو و فارسی غزلیں انہیں ایک نمائندہ شاعر ہونے کی حیثیت سے ظاہر کرتی ہے -

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ: طیفِ غزل، طبع ثانی، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۵ء؛ ص - ۱۲

ہم نے محبت اور ان کے چند ہم عصر شعراء کا نمونہ کلام اس لیے پیش کیا تھا تاکہ اُس دور کے شعراء کے کلام سے محبت کے کلام کا موازنہ کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں اگر ہم جرأت اور چند دیگر استاد شعراء کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بیشتر کے کلام میں ستمِ سخن پائے جاتے ہیں جبکہ محبت کا کلام ستمِ شاعرانہ اور فنی خامیوں سے کسی حد تک پاک ہے۔ محبت کی غزل میں مشکل سے مشکل مضامین باندھے گئے ہیں اور جہاں کہیں مشکل ردیف یا قوافی کا استعمال آگیا محبت اس سے بطریقِ احسن گذر جاتے ہیں۔ ان کے اردو دیوان میں ہر "حرف" کی ردیف موجود ہے جبکہ غالب، درد وغیرہ کے اردو دیوان میں بھی چند ردیفوں میں اشعار نہیں ملتے۔

محبت کی غزل میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو غزل کے عناصرِ ترکیبی میں شامل ہوتے ہیں۔ قلب کی پاکیزگی تجربے کی سچائی، خلوص کی گرمی زبان و بیان کی حلاوت، فنی ریاضت اور لہجے کی نرمی سب ہی کچھ محبت کی غزلیات میں موجود ہے۔ محبت کی شاعری کا آغاز تو قیامِ روہیل کھنڈ کے دوران ہی ہو گیا تھا۔ محبت سستی شہرت کے قائل نہیں تھے لہذا انہوں نے نہ عوامی شاعری کی اور نہ ہی عام مشاعروں میں حصہ لیا۔ مصحفی، انشا، حسرت، جرأت ان سب کا لکھنؤ میں بول بالا رہا، میر بھی لکھنؤ چلے آئے اور کچھ عرصے نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ آصف الدولہ کے دور میں درباری شاعری کا لکھنؤ میں آغاز ہوا اور پھر درباری نوک جھوک کا سلسلہ شروع ہو گیا، انشا اور مصحفی کے غیر اخلاقی معرکوں کا حال "آبِ حیات" میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ادبی محافل اکھاڑے بن گیئں۔ جرأت لوگوں اور دربار کو خوش کرنے کے لیے عجب عجب بہروپ دھار لیتے تھے اور فحش نگاری کو اصلِ شاعری سمجھنے لگے تھے یہ وہی جرأت تھے جو دہلی میں جب رہتے تھے معاملہ بندی کے اشعار کہتے ہوئے شرماتے تھے۔ نواب آصف الدولہ محبت خاں سے نہایت شفقت سے پیش آتے تھے لیکن نواب محبت خاں اپنی حیثیت کے مطابق اپنی خودداری قائم رکھے ہوئے تھے، وہ دربار سے دور رہنا پسند فرماتے تھے، گو کہ دربارِ اودھ میں ان کی تشریف آوری کا طریقہ اور ایام بھی مخصوص تھے لیکن ان تمام مراعات کے باوجود

آپ نے نوابینِ لکھنؤ کی بے جا خوشامد نہیں کی اور نہ ہی کسی نواب کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا بلکہ ایک مرتبہ تو نواب آصف الدولہ کی ریذیڈنٹ سے شکایت کرنے کی غرض سے کلکتہ بھی گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز سرکار کی جانب سے ملنے والا وظیفہ نواب لکھنؤ کے توسط سے ملتا تھا جس میں تاخیر ہونے لگی اور نواب موصوف کو تنگ کیا گیا لیکن آپ نے کوئی دباؤ قبول نہیں کیا ۔ آصف الدولہ[1] اور انکے فرزند سعادت علی خاں بھی نہ صرف شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے بلکہ وہ شاعر بھی تھے ۔

محبت خاں محبّت نہ صرف اردو کے صاحبِ دیوان شاعر تھے بلکہ فارسی، عربی اور پشتو کے بھی قادرالکلام شاعر تھے انہوں نے بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق اردو کے علاوہ فارسی اور پشتو[2] زبان میں بھی دیوان ترتیب دئے تھے ۔ محبّت کی شاعری کا دور وہ دور تھا جب فارسی غزل کے مضامین اردو شاعری میں مروج ہو چکے تھے لہذا محبّت کی اردو غزل میں زیادہ تر مضامین تو وہی ہیں جنہیں انکے دیگر ہم عصر شعراء نے بھی اختیار کیا، لیکن بعض نئے مضامین کو بھی اختیار کرکے جدید اردو غزل کی ابتدا کرنے والوں میں شامل کرا لیا ہے۔ فرماتے ہیں

؎ دامن جھٹک جھٹک نہ گزر اس گلی سے تو ۔ آخر تو تیری راہ کا میں اک غبار ہوں

جہاں تک اردو غزل کی ترقی کا تعلق ہے تو یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ محبّت نے اردو غزل کا وقار مجروح نہیں ہونے دیا اور اس راستہ کو ہموار کیا جس پر آئندہ آنے والے غزل گو شعراء کو چلنے میں آسانی ہوئی، یہی وجہ ہے کہ جب غالب نے مشکل پسندی کو اپنایا تو اس دور کے شعراء اور دیگر اہلِ ذوق حضرات[3] نے ان کی حوصلہ شکنی کی اور بعد غالب کو اپنے فیصلے سے رجوع کرنا پڑا ۔ غالبؔ مشکل پسندی سے یکسر دامن نہیں بچا سکے کیوں کہ یہ رجحان ان کی سرشت میں شامل تھا البتہ وہ ایک نئم البدل راستے پر چل نکلے یعنی مشکل پسندی نے نکتہ آفرینی کی جگہ لے لی جس سے اردو غزل کو چار چاند لگ گئے اور غالب نے غزل کا معیار بھی بلند کیا ۔ یہ ذکر تو غالب کا تھا جو محبت سے کافی بعد کے شاعر ہیں

---

[1] نواب آصف الدولہ صاحبِ دیوان شاعر تھے ۔ [2] پشتو دیوان آکسفورڈ لائبریری میں موجود ہے ۔
[3] ان حضرات میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی بھی شامل ہیں جو شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور غالب کو دوست تھے ۔

لیکن ان شعراء کو دیکھئے جو محبت کے ہم عصر بھی تھے اور ان کے دور کے نمائندہ شاعر بھی! ان میں میرؔ
مصحفی، انشاء، جرأت اور محبتؔ کے استاد حسرتؔ بھی شامل ہیں جنکے دواوین میں قصائد بھی ملیں
گے اور معاملہ بندی کے اشعار بھی دیکھنے میں آئیں گے۔ ایک جگہ خدائے سخن میر تقی میرؔ فرماتے ہیں ۔

؎ ہمارے ہاتھ خنجر سے کرو قطع ۔ نہ کھلوایا کبھو اس کا کمربند

محبتؔ نے غزل کو پاکیزگی عطا کی ان کی غزلیات میں عشق و محبت کے جذبات کی وہی ترجمانی ہے
جو غزل کی روح ہے ۔ محبتؔ نے محبت کے اسی جذبے کو اپنی غزل کی اساس ٹھہرایا جو سچا اور
پاکیزہ ہے، وہ فحش نگاری سے اس ماحول میں دور رہے جس میں انکے ہم عصر، خاص طور پر جرأت
سستی شہرت حاصل کر رہے تھے۔ انکی غزل اس دور کے بڑے بڑے شعراء سے کسی بھی طرح کم درجہ
نہیں رکھتی بلکہ بندشِ مضمون، سلاست اور روانی کے لحاظ سے وہ اپنے دور کے تمام شعراء سے ایک
قدم آگے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

؎ کل تری مجلس میں میرے قتل کی تدبیر تھی ۔ جنبشِ ابرو نہیں تھے کام میں شمشیر تھی
؎ کچھ اثر ہرگز نہ پایا دل میں تیرے ہم نے یار ۔ کیا ہمارے دل سے نکلی آہ بے تاثیر تھی
؎ کیا نہ تھی قسمت میں اس دل کی غذائے عشق اور ۔
جب سے یہ پیدا ہوا افسوس غم کھاتا رہا ۔

محبت کی غزل کا انداز منفرد ہے ان کو بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے اور یہی سلیقہ ان کا ایک اسلوب بن جاتا ہے.
اپنی اسی طرز سے متعلق فرماتے ہیں :۔

؎ اگرچہ شعر کہنے کی سبھوں کی طرز ہے بہتر ۔ محبتؔ پر ترا ہر ایک یہ انداز کیا سمجھے ۔

غالبؔ سے تقریباً ۵۰ برس پہلے محبتؔ نے کہا :۔

؎ ہجر کی اس شب میں ٹک اے ابر تو مت آئیو ۔ رات کٹتی ہے ذرا اختر شماری کے سبب

پھر غالب نے اپنے انداز میں اسطرح فرمایا ۔

؎ کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشگال ۔ ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

غالب کے شعر میں "ہائے ہائے" نے وارفتگی ضرور پیدا کر دی ہے لیکن محبت نے ابر سے نہ آنے کے لیے کہا اور پھر اس کا جواز بھی پیدا کیا اور شعر کو سادگی، زور بیان اور روزمرہ کا پیکر بنا کر غزل کو آسان فہم بھی بنانے کی کوشش کی، وہ اسی شعر میں کنایے میں یہ بھی کہہ گئے کہ اختر شماری کیوں کی جاتی ہے، رات کیوں نہیں کٹتی، یہ سب تخیلات، فکر، سوچ قاری کو ایسی نفسیات سے دوچار کرتی ہے جس کا وہ خود بھی شکار ہو سکتا ہے۔ محبت کی غزلیات کے چند اشعار دیکھئے، پھر غزل کی خوبیوں کے تناظر میں محبت کی غزل کا معیار بھی تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

کو بہ کو رسوا ہوں میں اے یار دل کے ہاتھ سے ۔ کس کا جی چاہے ہے یہ ناچار دل کے ہاتھ سے

سچ کہی ہے مثل یہ بیمار ہو تیمار دار ۔ دیکھ لو میں بھی ہوا بیمار دل کے ہاتھ سے

جوش مارے ہے ہر اک دم خون دل کا کیا کروں ۔ ہیں مری آنکھیں صدا خونبار دل کے ہاتھ سے

میں کہاں اور آہ یار و اس قدر وحشت کہاں ۔ میں نے دیکھے دشت اور کہسار دل کے ہاتھ سے

کچھ محبت نے کیا بیزار عالم سے مجھے ۔ کچھ ہوا عالم سے میں بیزار دل کے ہاتھ سے

جھولی میں بھر کے گل میں چمن سے نہ لاؤنگا ۔ دامن میں میرے پھولا ہے گلزار لخت دل

پہلو سے گیا میرے وہ دلدار سفر کو ۔ جاں گرم سفر کیوں نہ ہو صحبت کا اثر ہے

ان اشعار میں غزل کی کونسی خوبی ہے جو نہیں ہے، زبان و بیان کی حلاوت، روزمرہ و محاورہ، نکتہ آفرینی سلاست و روانی سب کچھ موجود ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ محبت کا اپنا منفرد انداز نمایاں ہے

فراق گورکھپوری غزل کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے، یعنی حیات و کائنات کے مرکزی حقائق جو انسانی زندگی کو متاثر کرتے ہیں، تاثرات کی ان ہی انتہاؤں یا منتہاؤں کا ترنم خیالات اور محسوسات بن جانا اور مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و انداز بیان میں ان کا صورت پکڑ لینا اسی کا نام غزل ہے"

مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں:-

مختصر یہ کہ شاعری کی ترکیب میں غالب اور حاوی عنصر وہی ہے جس کو رقص، صوتی
یا موسیقیت کہتے ہیں اور سر تا سر داخلی ہے غنایت مزماریت، یا نغمگی شاعری کی اصل
روح ہے۔

غزل کی ان مختصر مگر جامع تعریفوں کے تناظر میں محبت کی غزل کے اوصاف ڈھونڈ نکالے جا سکتے ہیں، اس سلسلے میں
محبت کی غزل کے اشعار کو سامنے رکھتے ہوئے محبت کے کلام خاص طور پر غزل کی فنی خوبیوں کو دیکھتے ہیں۔

نکتہ آفرینی

محبت کی غزل کی خاص خوبی ان کی نکتہ آفرینی ہے، ان کی غزل میں یہ پہلو بہت کھل
کر سامنے آتا ہے۔ اس نکتہ آفرینی کی بدولت ان کی غزل زیادہ پُر اعتماد بن جاتی ہے۔

گر محبت ملے تو سرمہ صفت - اس کو جا دیجے یار آنکھوں میں

یہ مہ نہیں فلک پہ تجھے ڈھونڈتا مدام - پھرتا ہے آسماں لیے ہر ایک شب چراغ

پہنچا نہ ہوتا اس کے کف پا تلک بھلا - ملتا ترا جو خون محبت حنا کے ساتھ

اے شیخ مسلماں سمجھتا میں تجھے تب - تسبیح میں جب رشتۂ زنار نہ ہوتا

جوں ہمارا دل ہمیں لاتا تھا کوچے میں ترے - اس کے کوچے میں ترا دل بھی تجھے لیجائے گا

کیا خوشی کیجے کہ وہ خورشید تھا - صبح آگیا تو پھر شام نہیں آنے کا

محبوب کو خورشید تو کہا جاتا ہے لیکن خورشید کی ایک کمی محبت نے بیان کر دی کہ وہ صبح جب طلوع ہوتا ہے تو
شام کو غروب ہو جاتا ہے۔

اردو غزل نکتہ آفرینی کے بغیر غزل کا بھرپور انداز اختیار نہیں کر سکتی، محبوب کی تعریف ہو یا اس کے سراپا
کا ذکر مقصود ہو، محبوب کے حسن و ادا کا بیان ہو ان کے لئے مختلف تشبیہات، بانکپن اور دلکشی کے جواز تلاش
کیے جاتے ہیں، یہی نکتہ آفرینی شاعر کے ذہن رسا کا پتہ بھی دیتی ہے ۔ انسان کائنات کے حسن کا مظہر ہے

قاری کو جب اس عالمِ رنگ و بو میں ہی اپنے محبوب کے حسن کا جواز ملتا ہے تو اسے روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے ۔ محبت فرماتے ہیں :-

؎ زیر ابرو نہیں آنکھیں تیری خواب آلودہ ۔ مست ہیں دونوں کہ کرتی ہیں یہ محراب میں خواب

؎ شب لبِ دریا سے تو ہم کو اٹھایا تھا و لے ۔ بحر کی ہر موج اپنی ناؤ کی زنجیر تھی

؎ نہ رکھ دریغ ذرا مجھ سے آبِ خنجر کو ۔ کہ تشنہ حلق صراحی ہے آب کے لائق

؎ مندرجہ بالا شعر میں نکتہ آفرینی کے ساتھ تجنیس تام بھی ہے ۔

؎ شاید کہ دل پہنچ گیا کوئی فنا کو آہ ۔ لختِ دل اشک لائے یہ اسکی رسید ہے

؎ چلتے نہیں ہیں اشک ذرا لختِ دل بغیر ۔ کیوں کر نہ ہووے فوج کو سردار کی طلب

؎ گر تلخ تیرے رو کا عرق ہے خفا نہ ہو ۔ اے گلعذار ہوتا ہے اکثر گلاب تلخ

؎ عشق آزار لگتا ہے مت چھو مجھکو ورنہ اے حبیب ۔ دیکھتے ہی نبض تجھ کو یہ مرض ہو جائے گا

؎ اب تلک دنیا میں کیا کیا نعمتیں کھاتے رہے ۔ عشق میں اب تیرے غم کو کھائیے یوں ہی سہی

؎ کھولے ہوئے مت زلف کو آ پرسشِ دل کو ۔ بیمار کی ہے پوچھنی شب کو خبر منع

؎ دامن جھٹک جھٹک نہ گزر اس گلی سے تو ۔ آخر تو تیری راہ کا میں اک غبار ہوں

سہل ممتنع

غزل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ آسان فہم ہونی چاہئیے ۔ غزل میں گنجلک مضامین، ابہام و اشکال قاری کے ذہن پر اچھا اثر نہیں چھوڑتے ۔ سہل ممتنع کے اشعار عام طور پر چھوٹی بحروں میں ہوتے ہیں اور ان میں سادہ و آسان الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، اس قسم کے اشعار میں حد درجہ غنائیت ہوتی ہے اس تناظر میں خواجہ میر درد اور نواب محبت خاں محبت سر فہرست نظر آتے ہیں. خاص طور پر محبت کے اشعار سہل ممتنع کی بہترین امثال پیش کرتے ہیں ۔ رنگ تغزل، دلکشی و بانکپن، الفاظ کا موزوں استعمال بیان

سہلِ
ممتنع کے ضمن میں محبت کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

~ غیر کے گھر قدم رکھا تو نے ۔ دل محبت کا پائمال کیا

~ خانماں عشق میں جلا دل کا ۔ ہے نگہبان اب خدا دل کا

~ مبارک رہے بوالہوس تجھ کو راحت ۔ ہمیں اپنا درد و الم ہے غنیمت

~ سمجھتا نہیں گرچہ تو اس کو زاہد ۔ وہ کافر خدا کی قسم ہے غنیمت

~ ہے وہ گلعذار آنکھوں میں ۔ تو سدا ہے بہار آنکھوں میں

~ جو کہ غواص ہو نہ سمجھے اشک ۔ ہیں دُرِ آب دار آنکھوں میں

~ لختِ دل تجھ بغیر آتے ہیں ۔ جانِ من بار بار آنکھوں میں

~ خواب عالم کا اڑ گیا اے دل ۔ غل مچانا تیرا قیامت ہے

~ ایک تو قتل بے گناہ کرنا ۔ پھر تجاہل تیرا قیامت ہے

~ دل کو ڈستی ہے ہر گھڑی آ کر ۔ زلف ہے یا کہ مار ہے کیا ہے

~ اپنی قسمت میں دیکھیے بلبل ۔ گل ہے یا نوکِ خار ہے کیا ہے

~ صبر کب تک بھلا کیا کیجے ۔ اور نہ کیجے تو آہ کیا کیجے

~ جور کو روز و شب سہا کیجے ۔ اس پہ راضی نہ ہو تو کیا کیجے

~ اتنی وعدہ خلافی کچھ بھی نہیں ۔ کہہ گیا شام کو سحر آیا

~ ہم نے چاروں طرف اٹھا کر آنکھ ۔ جب نظر کی تو ہی نظر آیا

~ اے محبت تمام عمر تجھے ۔ عاشقی کا نہ کچھ ہنر آیا

~ ستم ایجاد کو میں جانتا ہوں ۔ ہزاروں ظلم وہ پیدا کرے گا

~ مجھے آرام آوے گا اسی دم ۔ ترا جب تیر دل میں جا کرے گا

~ یہی ہوگا نہ جی لیوے گا آخر ۔ مرا تو اور اے غم کیا کرے گا

فائدہ کیا ہے نالہ کرنے سے ۔ حال سنتا ہے بے وفا کس کا
دل جگر دونوں اس نے قتل کیے ۔ دے محبت کو خوں بہا کس کا
جی میں ہے دل کو سرخرو کیجے ۔ تیغ قاتل کے روبرو کیجے
نالہ اپنا اثر نہیں کرتا ۔ فائدہ کیا جو ہائے ہُو کیجے
دیر و کعبہ میں تو نہیں ملتا ۔ کس جگہ تیری جستجو کیجے
ہم تو شبنم کی طرح رو دیں گے ۔ مثلِ گل آپ تو ہنسا کیجے
یا وفا کیجے یا میاں اپنا ۔ ہم کو اتنا نہ مبتلا کیجے

بندشِ مضمون

بندشِ مضمون کو اردو غزل میں ایک خاص درجہ حاصل ہے، اس سے شاعر کی طبع رسا کا پتہ چلتا ہے۔ وارداتِ حسن و عشق ایک قدیم مضمون ہے جس کو عہدِ قدیم سے لیکر آج تک شعراء مختلف پیرائے سے باندھتے چلے آئے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی انداز، طور طریقے، رسم و رواج اور اقدار میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ محبت کے کلام میں اس دور کے شعراء کی طرح ایہام نہیں پایا جاتا۔ پہلے مصحفی، حسرت اور محبت کے اشعار دیکھئے۔

کیا عہد کوئی اس بت سفاک سے باندھے ۔ سر کاٹ کے عاشق کا جو فتراک سے باندھے — مصحفی
جو اپنی نظر کو یاں گر تاک سے باندھے ۔ وہ تاک رکھے شیشے کو دل تاک سے باندھے — حسرت
گر طبع روشن اپنی مضمون چراغ باندھے ۔ ہے خانۂ فلک کا اس کو چراغ باندھے — محبت
طائر کو عرش کے یوں کرلے اسیر وہ یاں ۔ جوڑا وہ کہکے اپنے جب سر کے بال باندھے — ؍؍

بندشِ مضمون کی امثال میں محبت کے مزید اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

وہ تارِ زلف چھوٹ گیا بعد مرگ میں ۔ کیوں کر کروں غم تارہ سے تارِ کفن جدا — ؍؍

؎ شدتِ گریہ سے یہ سونا محبت کا ہے ۔ آئے کس کے تئیں طغیانیِ سیلاب میں خواب

شدتِ گریہ کا مضمون نے اس طرح باندھا تھا ۔

؎ جو اس زور سے میر روتا رہے گا ۔ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا میر

محبت نے اسے اپنے انداز سے باندھ کر نکتہ آفرینی کی مثال بھی اس میں پیش کردی ہے ۔

؎ شاید ہے موتیوں کے اسے ہار کی طلب ۔ کرتا ہے میری چشم گہر بار کی طلب

؎ الفت میں جسکے اشک بہانے کی خو نہ ہو ۔ اس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

؎ مانندِ بوئے گل کہ ہمیشہ ہے گل کے ساتھ ۔ کیا دخل ہے کہ یار میرے دل میں تو نہ ہو

محبوب کے دہن کو شعراء غنچہ سے تشبیہ دیتے ہی ہیں لیکن محبت نے اس مضمون کو انوکھے انداز سے باندھا ہے۔

؎ اے غنچہ دہاں اب تیری ہستی سے ہوا حل ۔ جو عقدہ میرے دل کا کبھی وا نہ ہوا تھا

؎ دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا یہ ۔ میرا غبار کیجو برباد اس طرح کا

؎ یہ زلف اور یہ کاکل نہیں ہے کم صیاد ۔ پھنسانے کو دلِ عشاق خط کو دام نہ کر

؎ اشک اڑ جائیں میرے پل میں تیرے منہ کو دیکھ ۔

مہر کے آگے کہاں رونقِ اختر ہووے

؎ منجم اپنی تو اختر شماری ۔ ہماری دیدہ بیدار کو سونپ

؎ شیشہ نہیں بغل میں میرے ہائے محتسب ۔ یہ آبلہ پڑا ہے میرے دل کے متصل

؎ ہچکیاں لے لے کے شیشہ روئے ہے میرے لیے ۔ سمجھو ہو تم میکدے میں قلقلِ مینا ہنوز

؎ شمشیر کھینچنے کی نہیں احتیاج کچھ ۔ ہے میرے حق میں ابروئے خمدار تیری تیغ

؎ سر جھکاتے ہیں وہاں جتنے بڑے ہیں سرفراز ۔ کیا ہوا اگر جام سے ہے گردنِ مینا بلند

محبت کے تخیل کے سامنے نئے نئے مضامین ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں ۔ محبت نے بندشِ مضمون میں کمال حاصل کیا ، مرزا غالب و سودا ، اور مصحفی نے بندشِ مضمون میں کمال ضرور حاصل کیا لیکن انکے مضامین ادق ہو جاتے ہیں ۔ محبت نے بندشِ مضمون میں ابہام و اشکال پیدا نہیں ہونے دیا ۔

سوز و گداز

غزل میں جذبے کی سچائی کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے ۔ شاعری انسانی جذبات و احساسات کا نام ہے ۔ ایک شاعر اپنے دکھ کے ساتھ ہی معاشرے کے غم و آلام پر بھی نظر رکھتا ہے، غزل میں عشق و محبت کی کار فرمائیاں ہجر و فراق کے صدمات کا خصوصیت سے بیان ہوتا ہے ۔ جہاں تک نواب محبت خاں کی زندگی میں غم و اندوہ کا سوال ہے تو ان کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ابتدائی زندگی تو نوابانہ ٹھاٹ سے بسر ہوئی لیکن کٹرہ میراں پور کی جنگ میں انکے والد کی شہادت کے بعد وہ دو سال تک الہ آباد کے قلعہ میں قید با مشقت گذارتے رہے اور پھر لکھنؤ میں انگریز وظیفہ خوار کی حیثیت سے نوابانِ لکھنؤ کی کڑی نگرانی میں زندگی کے بقیہ ایام بسر کیے ۔ انہیں روہیل کھنڈ کی یاد ستاتی رہی اور ایک حساس شاعر نے فلسفہ غم کو فطری طور پر اپنی غزل کے لیے پسند کیا ۔

اے محبّت اب قفس میں یاد کر کہتے ہیں ہم ۔ آہ گل افسوس سنبل ہائے گلشن وائے باغ

اے محبّت جلے ہے جس سے دل ۔ عشق ہے یا شرار ہے کیا ہے

دل تو اک مدت ہوئی جاتا رہا ہاتھوں سے اب ۔ جان بھی جاتی ہے اب میرے خدا میں کیا کروں

مندرجہ بالا شعر میں جو وارفتگی پائی جاتی ہے اس میں جذبے کی سچائی کی بو آ رہی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ محبّت نے محبّت کی چوٹ ضرور کھائی ہے ۔

شبِ فراق ہے یا آسمانِ غم ٹوٹا ۔ الہی ہو گئی یہ آج کیسی بھاری رات

اٹھا طوفان آنکھوں سے میری عالم ڈبو دے گا ۔ بچے گا دیکھیئے اے دل ترا اب خانماں کیونکر

اسکو نہ جان چاک گریباں کی طرح تو ۔ ناصح یہ چاک دل ہے کہ ہرگز رفو نہ ہو

میں وہ ناداں ہوں جس کے شور سے سب عرش ہل جاوے ۔

۔ نہ لرزے آہ سے میری زمین و آسماں کیونکر

جوش مارے ہے ہر اک دم خون دل کا کیا کروں ۔ ہیں مری آنکھیں سدا خونبار دل کے ہاتھ سے

- آتش کدہ سے کم نہیں میں بھی کہ میرے ہے ۔ سینہ میں کلیجے میں دل وجان میں آتش
- ہم نشیں واراو کے کا مجھ سے افسانہ نہ کہہ ۔ قصۂ بیرانہ کہہ یا داستانِ عندلیب
- درد کس کا میرے پہلو میں خلش کرتا ہے ۔ یاالٰہی مجھے کیوں رات دن آرام نہیں
- ہوا ہوں غم میں ترے بسکہ میں ضعیف و نزار ۔ عصائے آہ سوا نہیں کسی کی آس مجھے
- وہ کب کا مر چکا تو شوق سے بالیں پہ چل ایکے ۔ محبت میں ذرا باقی بھی دم ہو وے تو میں جانوں
- شب کو جو تیرے وصل کی میں نے سنی خبر ۔ بے اختیار کھول کے آغوش رہ گیا

روزمرہ اور محاورہ

محبت کی اردو غزل زبان وبیان کے اعتبار سے بھی ممتاز ہے۔ ان کی اردو شاعری میں انگیا، کُرتی، مسّی چوٹی سے ہٹ کر روزمرہ محاورہ کا موزوں استعمال ہے۔ اردو غزل کے ارتقا میں اس لحاظ سے بھی ان کا قابلِ قدر حصّہ ہے کہ انہوں نے اپنے مزاج کے مطابق مضامین کو نظم کیا اور اپنے ہم عصر شعراء کی شاعری کا روشن پہلو خود بھی اختیار کیا جبکہ تاریک پہلو یعنی لچر اور بے ہودہ گفتگو سے اپنی زبان وقلم کو آلودہ نہیں کیا۔ محبت خاں جسمانی طور پر لکھنؤ میں ضرور تھے لیکن ذہنی طور پر وہ ان شعراء سے متاثر تھے جو دلّی یا روہیل کھنڈ میں رہ کر اپنا ایک علیحدہ مقام بنا چکے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ محبت کی شاعری کا مزاج تو روہیل کھنڈ سے ہی بن چکا تھا لہٰذا انہوں نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی دبستانِ دلّی کے رنگ کو اپنی شاعری میں نمایاں کیا اسی لیے ان کی اردو شاعری داخلی شاعری کی اچھی مثال پیش کرتی ہے۔ بعض جگہ دلّی کے اساتذہ کی چھاپ محبت کے کلام پر اس قدر گہری ہے کہ چند تذکرہ نگاروں نے غلط فہمی کی بنا پر محبت کو درد کا شاگرد لکھا ہے۔ دراصل محبت کے پیشِ نظر وہ دواوین ضرور رہے ہونگے جو دبستانِ دلّی کی نمائندگی کرتے ہیں، جیسا کہ وہ غزلیات جو درد، میر تقی میر، حسرت اور دیگر شعراء کے کلام میں ملتی ہیں جو ایک ہی زمین میں ہیں۔ محبت نے اپنے کلام

کسی ایک شاعر کی چھاپ نہیں پڑنے دی - ان کی مادری زبان پشتو تھی لیکن انہوں نے اردو روزمرہ کا استعمال اس چابکدستی سے کیا کہ اس دور کے بڑے بڑے شعراء سے ان کا کلام داد وصول کرتا نظر آتا ہے۔

ــ دلا زباں پہ نہ لا اس کا شور شمع کی طرح ۔ کہ یاں کٹے ہے زباں گر کرے زباں فریاد

ــ دو گوش ایسے رکھے تھے وہ سمن بو ۔ کہ پکڑیں کان جس کے آگے گل رو

ــ ترے تیرِ نگاہ کے ہو مقابل ــ بغیر اپنے تو یہ کس کا جگر ہے

ــ ترے بغیر تھی یہ دل کو بے قراری رات ۔ کہ کل پڑی کسی پہلو نہ مجھ کو ساری رات

ــ اب جو ڈرسر میں آگے نہ کہتا تھا تجھ سے دل ۔ معشوق اور ستم نہ کرے یہ کبھو نہ ہو

ــ کیا نہ تھی قسمت میں اس دل کی غذائے عشق اور ۔

۔ جب سے یہ پیدا ہوا افسوس غم کھاتا رہا

ــ میں نے نالے کیے جو گلشن میں ۔ تھا ادھر ہی کو کان بلبل کا

ــ ترے آگے تو اوراقِ شجر بھی کم ہیں اے ظالم ۔ اگر ہر برگ میرے غم کا دفتر ہو تو کیا حاصل

ــ ذی روح کے رہنے کا نہیں کام زمیں پر ۔ ہے موت یونہی مفت میں بدنام زمیں پر

ــ چھاتی پہ نہ لے جائیں گے قاروں کی طرح ہم ۔ گو ہم نے کیا جمع سرانجام زمیں پر

ــ گرداب کے جیا عشق میں، میں اس کے محبت ۔ لاؤں نہ محبت کا کبھی نام زباں پر

ــ ہم کو جلا نہ غیر سے مل مل کے ورنہ ہم ۔ کچھ کر رہیں گے آہ شرر بار کھینچ کر

ــ ابر اور شبنم محبت روز و شب ۔ کتنے ہی روتے ہیں دکھیارے ہمیں

ــ زمیں میں گڑ گیا شمشاد تو بار خجالت سے ۔ صنوبر بھی اگر اس قد کا ہمسر ہو تو کیا حاصل

ــ کیا مرتے مرتے لے موا مجھ کو بھی یار دل ۔ دل کا شکار میں ہوا تیرا شکار دل

ــ میں اپنے دل کو رو رو کے سو گیا کل اسی طرح ۔ کوچے میں اس کے دیکھے پڑے سو ہزار دل

ــ جو دل ہیں بھر کے گل میں چمن سے نہ لاؤں گا ۔ دامن میں میرے پھولا ہے گلزار لختِ دل ×

- سہارے ہمارے پہلو سے کون اٹھ گیا ہے آج ۔ یوں جیسے چھوٹنے کو چلی جان یک بیک
- روشن جو داغِ دل ہے اسے آہ خوب ہے ۔ گھر کا میرے چراغ کبھی گل نہ کیجیو
- کس طرح ہم تیرے کوچے کے بھلا ہوویں غبار ۔ کون سی خاک وہاں ہے کہ جو برباد نہیں

تصوف

نہ صرف اردو شاعری بلکہ دنیا کی تمام زبانوں میں روحانیت اور تصوف پر کسی نہ کسی شکل میں اشعار اور نظمیں موجود ہیں[1] خدا اور کائنات کے متعلق مختلف نظریات ہیں ان نظریات کے ماننے والوں نے تصوف کو عملی شکل دی ۔ محبت خاں صاحبِ سلسلہ تھے اور اکبر علی مودودی سے بیعت تھے ۔ ان کے چند اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وحدت الشہود کے قائل تھے ۔ وہ رازِ وحدانیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ۔

- تعجب کچھ نہیں وحدت سے کثرت ہے اگر پیدا ۔ کہ اک ہی دانے سے ہو شاخ اور برگ و ثمر پیدا
- لے کر کتاب شیخ تو کعبہ تلک گیا ۔ لیکن وہ دل سے حرف دوئی کا نہ دھو سکا
- پایا محبت اس کو ابھی دل کے بیچ میں ۔ پھر آئے سب جہاں وہ ہمارے ہی گھر ملا
- تجھ میں اور اس میں ہر ذرۂ ہستی ۔ ہے محبت حباب کی مانند
- ہم نے چاروں طرف اٹھا کر آنکھ ۔ جب نظر کی تو ہی نظر آیا
- دیر و کعبہ میں تو نہیں ملتا ۔ کس قدر تری جستجو کیجے

صوفی کائنات کے دو روپ مانتے ہیں ایک ذات اور دوسرا صفات ذات نظر نہیں آتی مگر صفات کی جھلک مخلوقات کے پردے میں ملتی ہے گویا صفات خداوندی تعینات کے پردے میں نظر آتی ہے ۔ محبت فرماتے ہیں :-

- جزو کل میں فرق اتنا ہے فقط ہے اعتقاد ۔ ورنہ جس خرمن کو دیکھا فی الحقیقت دانہ تھا

---

۱ عامر فاروقی : "اصغر گونڈوی ایک جائزہ"، رفیق کتاب گھر، حیدرآباد - ص - ۶۱

خمریات و رندی مضمون

محبتؔ کے کلام میں خمریات و رندی مضمون کے اشعار زیادہ نہیں۔

محبتؔ کی زندگی کے حالات سے کوئی ایسا ثبوت فراہم نہیں ہوتا جو انکی شراب نوشی کی شہادت دیتا ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ رند مشرب نہ بھی تھے تو بھی وہ رند مشربی کے آداب و لوازمات سے پوری طرح واقف تھے اور انہیں اس قسم کے اشعار کہنے کا پورا پورا سلیقہ آتا تھا۔

وہ شیخ اور زاہد کی گفتگو کر کے قاری کو چونکاتے ہیں اور عشق و محبت کی بدمستی پر طنز کر کے مزاح کا پہلو بھی نکالتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار میں شیخ اور زاہد وغیرہ پر کیوں طنز کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب مولانا حالی نے یہ دیا تھا کہ اگر سفید کپڑے پر معمولی داغ بھی پڑ جائے تو وہ نمایاں اور صاف نظر آتا ہے اسی لئے شیخ اور زاہد کا تذکرہ کر کے بے عمل انسانوں کو چونکایا جاتا ہے مقصد ان پارسا حضرات کی تنقیص مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس طرح اصلاحِ معاشرہ کا کام کیا جاتا ہے۔

ـــ جبہ تیرا بھی تر نہ کریں رند زاہدا ۔ باور نہیں تو شیخ کی دستار دیکھ جا

ـــ ہم ترستے رہے ایک پیالی کو اور سب تو نے ۔ بزم میں کتنے رقیبوں کو دیئے جام شراب

ـــ قلقل سبو کی جیسے ہو ساقی برائے مے ۔ نکلے گا میرا دم بھی یونہی اب اٹک اٹک

ـــ ابد تلک نہیں ممکن ملے جو ساغر مے ۔ خمِ فلک سے ہوا ہے نصیب جامِ فراق

ـــ ہم مے کشوں کو خواہش طوبیٰ کی کچھ نہیں ۔ زاہد درختِ جنتِ انگور ہے ہمارا

محبتؔ ان اشعار میں بھی مضمون آفرینی کے نئے نئے پہلو نکالتے ہیں۔

ـــ ساقی نے کیا ہم پہ کرم آج یہ دیکھیں ۔ شیشہ میں سبھی خون ہے یا مل بنی گلفام

ـــ لازم ہے روویں قلقل مینا کے ساتھ ہم ۔ بارش کے وقت ہوتی ہے ساقی شراب خوب

ـــ مے کشی میں دردمندوں کو محبتؔ یہ ترا ۔ گریہ مستانہ ہے شیشہ کی قلقل کا حریف

ـــ خاموش محبتؔ کہ ذرا میں نہا بھی لوں ۔ مے سے کیا ہے میں نے ابھی تو وضو فقط

؎ مے کشی میں دردمندوں کو محبت یہ ترا ۔ گریۂ مستانہ ہے شیشہ کی قلقل کا حریف

؎ یہ دن برسات کے اور رہے پیتے تو مساقۂ عزروں کے ۔ اگر یہ ہے تو پھر آنکھوں سے خوں جاری ہے اور میں ہوں

؎ سیر ہے وہ چشم کے ساغر کی گردش میں مرے ۔ منفعل جس کے حضور اب جامِ جم ہونے لگا

؎ شیشہ و جام و شراب اور گزک بھی ساقی ۔ دیکھو موجود کے پھر موسمِ برسات آیا

؎ گردش میں چشمِ یار کی ہے سیرِ دو جہاں ۔ ایسا تو جام تجھ کو بھی پہنچا نہ جم بہم

؎ ہچکیاں لے لے کے شیشہ روتے ہے میرے لیے ۔ سمجھو ہو تم میکدے میں قلقلِ مینا ہنوز

لختِ دل و جگر کی اصطلاح

انسانی جذبۂ اخلاص جب عروج پر ہوتا ہے تو انسان اپنی زندگی کو بھی مقصدِ خاص کے حصول کے لیے قربان کر دیتا ہے۔ عشق و محبت کا حقیقی اور انمٹ جذبہ سخت کوشی کی طرف گامزن کرتا ہے۔ خونِ جگر کی اصطلاح اقبال کے یہاں بھی موجود ہے، فن کی آبیاری کے لیے جو مشقت فنکار کو اٹھانی پڑتی ہے" اس موقع پر یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ فن کو امر بنانے کے لیے ایک فن کار کو کیا کرنا پڑتا ہے پہلے اقبال کی زبانی سنیئے۔

؎ قطرۂ خوں جگر کو بناتا ہے دل ۔ خونِ جگر سے ہے صدا سوز و سرور و سرود

؎ نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر ۔ نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال کے یہاں فن کار کی عظمت کا یہی نشان ہے کہ جگر کا خون ہونے سے عشق کے عملِ تسخیر کی تکمیل ہوتی ہے۔

محبت خاں نے جہاں کہیں سوزِ غم، اندرونی خلش و تپش کا اظہار کیا ہے وہاں انہوں نے اشکوں کی شکل میں لختِ دل و جگر کو بہا دیا ہے اور یہ مناظر دیکھ کر وہ خود بھی محظوظ ہوتے ہیں۔

؎ تم خوش ہو گر نظارۂ گل سے میاں تو ہم ۔ آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں حیدارِ لختِ دل

سر لختِ جگر کا قافلہ سب ساتھ لے چلا - میرا بہ منزلِ اشک عجیب رہ نورد ہے

محبوب کی بے اعتنائی، محب کا طالبِ دیدار ہونا، محبوب کا مستقل اجتناب محب کو اس حد تک مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس انداز سے فنا کر لیتا ہے۔

~ میری اس بات کا دیکھا تماشا - کہ موجِ اشک میں آخر بہا دل

~ نوکِ مژہ پہ لختِ جگر آ رہا ہے اب - مل جائے خاک میں نہ کہیں لٹک رہے لگا ہ

~ ملک نامے کی کچھ لکھنے کی ہوتی نہیں حاجت - جب لختِ جگر صورتِ مکتوب نہ ہوتا

~ شاید کہ دل پہنچ گیا کوئی فنا کو آ ہ - لختِ دل اشک لائے یہ اس کی رسید ہے

~ نہ لختِ دل کو تو اے چشم جانے دے ہرگز - کہ پھر نہ آوے گا زنہار جو گیا سو گیا

~ کوئی ہی باقی ہے آنسو آبرو جس سے رہے - لختِ دل گو بہہ چکے اے چشم تجھ کو کیا ہوا

~ وہ تو نہ آیا اور محبت مرے سر شک - جاتے ہیں لختِ دل لیے ہمراہ الغیاث

~ عجائب سیلِ اشکِ چشمِ تر ہے - کہ جس میں جلوۂ لختِ جگر ہے

جنون و دیوانگی

غزل میں جب وفورِ شوق اور وارفتگی کا اظہار ہوتا ہے تو غزل شدتِ عشق کا وہ فلسفہ بیان کرتی ہے جو زندگی کی صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔ عشق تخمین و ظن کا محتاج نہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں وہ عقل کا تابع ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:-

~ گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور - چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

جنون و دیوانگی کی کیفیات کا اظہار عشق کو معتبر بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ کبھی بادِ بہاری بھی جنون کا سبب بن جاتی ہے اور کبھی بہار کا انتظار کرنے میں، برہنہ پائی، آبلہ پائی، غبارِ کوچہ یار، چاک گریباں

جیب اور داماں تار تار کرکے دنیائے عشق میں معتبر ہوا جاتا ہے ۔

؎ فصلِ گل آئی نہیں تقصیر میری ناصحا ۔ ہو گیا مجھ کو جنوں بادِ بہاری کے سبب

؎ بدن پہ رخت ہے سو ہے غبارِ کوچۂ یار ۔ جنوں نے پہننے کے لیے یہ دیا لباس مجھے

؎ جو مارِ زلف اُدھر روئے یار پر بکھرے ۔ اُدھر جنوں میرا جیب تار تار کرے

؎ کرے تو ہے تو گریباں کو چاک دستِ جنوں ۔ نہ ہو کہ چاک میرے دل کا آشکار کرے

؎ برہنہ پائی و زنجیر و آبلہ و آہ ۔ جنوں سے ہم کو سروکار دیکھیے کیا ہو

؎ جنوں ہے قید ہے زنجیر ہے خواری ہے اور میں ہوں ۔
غرض ہے زلف تری اور گرفتاری ہے اور میں ہوں

؎ جلدی کیا ہے تو بہار آنے دے اے دستِ جنوں
خود بخود چاک یہ ہو وے گا گریباں اپنا

؎ دیکھیں کہ جنوں کیا کرے پھر فصلِ گل آئی
صحرا کا وہ دے یا کہ سر انجام چمن کا

؎ کیا جنوں سے اس کے واقف ہو کوئی مجنوں بغیر
یاں محبت کا جو تھا ہمدرد سو جاتا رہا

—— x ——

معاملہ بندی

محبت خاں کا دور انشا و جرأت کا دور ہے، لکھنؤ کی شاعری کا یہ وہ دور ہے جو نوابینِ لکھنؤ کے زیر اثر پورا دبستانِ لکھنؤ آچکا تھا۔ انشا اور جرأت اس میدان کے شاہسوار تھے جس میں ابتذال و معاملہ بندی حد سے تجاوز کر چکی تھی، لکھنؤ میں قیام پذیر زیادہ تر شعرا اس سیلاب میں بہہ چکے تھے۔ میر فرماتے ہیں:۔

؎ ہمارے ہاتھ خنجر سے کرو قطع ۔ نہ کھلوایا کبھو اس کا کمر بند

محبت خاں نے دربار کے زیر اثر رہ کر شاعری نہیں کی البتہ اردو غزل کے اس دور میں بڑے بڑے اور نمائندہ شعراء کا بھی یہی انداز ہو چلا تھا خود نواب محبت خاں کے استاد حسرت کے کلام میں بھی آپکو ایسے اشعار ملیں گے جو معاملہ بندی ہی نہیں بلکہ فحش گوئی کے زمرے میں آتے ہیں۔ محبت کے ضخیم اردو دیوان میں معاملہ بندی کے یہ چند اشعار آپ کو ملیں گے جو بوس و کنار تک ہی محدود نظر آئیں گے لیکن ان اشعار میں بھی روزمرہ محاورہ، بندشِ مضمون اور نکتہ آفرینی کا دخل ہوگا۔

؎ غیر کو بے شرم ہم سمجھتے ہیں ۔ گو تری ناک کا وہ بال ہوا

؎ معلوم ہم کو ہووے محبت نہ نازکی ۔ جب تک نہ اتفاق ہو بوس و کنار کا

؎ لے جائیے کنار سے یا تو یہ میرا دل ۔ یا آئیے کہ آپ سے بوس و کنار ہو

؎ پہلے نہیں کر لیتے ہو پھر کہتے ہو ہاں لے ۔ ایسا نہیں بھاتا ہمیں انکار کا بوسہ

؎ کھولی گل روئے میری بند قبا ۔ اب تو اے غنچۂ دل وا ہونا

؎ گلوں کا رنگ بلبل تب اڑے گا ۔ قبا کے بند جب وہ وا کرے گا

؎ شہرہ ہے سخاوت کا تری بوسہ تو اک دے ۔ تا ہم کو یقیں ہووے کہ تو حاتم طے ہے

؎ میں چاہوں زلف کا بوسہ لوں خواہ رخ کا ترے ۔ تو بوسہ دیجئے میں اے یار صبح و شام کر

ے لذتِ جاں مجھے دیوے گا دمِ مرگ تلک ۔ ایسا بوسہ ہے ترے لب کا کُل اندام لذیذ

ے بیتاب ہوا میرے جو پہلو میں میرا دل ۔ شاید کہ وہ دل بر ہے ہم آغوش کسی کا

ے بارے سوال بوسے کا میں نے جو کل کیا ۔ کہنے لگا کہ کی ہے بھلا میں نے کب نہیں

ے عاشقِ شیدا میاں روزِ ازل سے ہے مریض ۔ رکھ دے لب پر لب کہ ہو چنگا ترا بیمارِ آج

ے کیا قہر ہے ہر دن کو تو وعدہ ہو میرے ساتھ ۔ اور سووے وہ جا عیش سے ہر رات کہیں اور

ے لطف و کرم ہے تب تو محبتؔ سے تُو میاں ۔ ہر وقت بوسہ دے مجھے اور میں لیا کروں

عربی الفاظ کا استعمال

نواب محبتؔ خاں اردو، فارسی اور پشتو کے علاوہ عربی زبان کے بھی شاعر تھے۔ اپنے والد نواب حافظ رحمت خان کی شہادت پر جو قطعۂ تاریخ آپ نے تحریر کیا ہے وہ آپ کی عربی دانی پر دلالت کرتا ہے۔ نواب محبت خاں کا عربی کلام دستیاب نہیں البتہ اردو شاعری میں آپ نے بعض عربی الفاظ نہایت التزام کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ حافظ رحمت خاں ایک عالم فاضل اور متقی و پرہیزگار شخص تھے انہیں نہ صرف شعر و شاعری سے دلچسپی تھی بلکہ وہ خود بھی ایک شاعر تھے۔ آپ نے روہیل کھنڈ میں سیکڑوں جیّد عالم تعلیم و تدریس کی غرض سے دور دراز علاقوں سے بلائے تھے، ان ہی علمائے عصر کی زیر نگرانی نواب محبت خاں محبتؔ نے بھی علومِ مشرقیہ کی تعلیم حاصل کی۔ محبتؔ کے اردو دیوان میں سے چند اشعار نقل کیے جاتے جن میں محبتؔ نے عربی الفاظ کو نہایت بہتر انداز سے استعمال کیا ہے ۔

ے پہنچے دل نالاں کی تب و تاب فلک پر ۔ تو رعدؔ[1] کا زہرہ ہو وہیں آب فلک پر

ے نرم نکیوں کی بھاں کرلیں تلاش اہلِ دُوَل[2] ۔ پھر تو خاک و خشت ہے سارے جہاں کے زیر پا

---

[1] بجلی کی گڑگڑاہٹ [2] دولت کی جمع

ہم ہیں اور زیست میں جنوں ہو — تیغ سے تیری انفصال[1] ہوا

تب رشتہ اس کے قرب کا گردن میں ہے میرے — اس کا گواہ آئینۂ حبل الورید[2] ہے

سنتے تھے ہم کہ جمع و نقیضین[3] ہے محال — تو غیر ساتھ آکے کرے عیش و غم بہم

الغیاث، مرخص، بنات، حاجب، منعم، ذقن، ذبح۔ وحش، محظوظ، اور حفظ وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں، ان عربی الفاظ کو بعض غزلوں میں ردیف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہم چند غزلیات نقل کرتے ہیں جن سے محبت کے ذوقِ عربی کا پتہ چلتا ہے۔

ردیف "ص" میں لفظ مرخص[4]

تو صبح ہوا مجھ سے جو اے ماہ مرخص — جاں تن سے میری ہو گئی ناگاہ مرخص

تم ساتھ چلے غیر کے اے یار جہاں سے — ہوتا ہے اب یہ بندۂ درگاہ مرخص

یوں دل سے چلے اشک میرے چشم کی جانب — جوں فوج کرے تاخت کے تیئں شاہ مرخص

یہ آہ میری گزرے کہ اس وقت فلک سے — جس وقت ہوا یاں سے تو اے آہ مرخص

گو نزع ہے پر نکلے گا دم کب ترے آگے — جیوں گا میں تو ہو ویگا ہر گاہ مرخص

دل لینا محبت کا تھا سو لے چکے تم بس
خواہ اس کو رکھو پاس کرو خواہ مرخص

ردیف "ظ" میں لفظ محظوظ[5]

ہم ایسے خلوص ہوئے بھلا کہاں محظوظ — کہ جیسے کوچے میں ترے ہوئے میاں محظوظ

عجب ہے قصۂ لیلیٰ سے خوش نہیں ہو تم — ہمیں تو کرتی ہے مجنوں کی داستاں محظوظ

نہ روزِ وصل دکھایا کبھی ہمیں ہیہات — رہے نہ دور میں تیرے آسماں محظوظ

جو خواب دیکھ زلیخا ہوئی تھی خوش تو میں — ترے خیال میں رہتا ہوں ہر زماں محظوظ

---

[1] جدا ہونا یا فیصلہ ہونا [2] شہ رگ [3] عربی میں ان دو باتوں کو کہتے ہیں جو نہ باہم جمع ہو سکیں اور نہ معدوم ہوں بلکہ ایک نہ ایک پائی جائے۔ [4] رخصت کیا گیا [5] خوش۔

ردیف "ح" لفظ صریح[۱]

- مجھ کو کہتا ہے کہ کرتا ہے تو بد نام صریح ۔ مکھ کے بھیجے ہے جو یوں نامہ و پیغام صریح ۔
- غیر کا وصف نہ کر اے بتِ خود کام صریح ۔ یہ تو گویا مجھے دیتا ہے تو دشنام صریح ۔

ردیف "ث" لفظ الغیاث[۲]

- کھینچوں ہوں روز نامۂ جانکاہ الغیاث ۔ اے آہ درد ہجر سے اے آہ الغیاث
- چاہِ ذقن میں تیرے نہ تنہا گرا ہوں میں ۔ یوسف کو ڈالے چاہ میں ہر چاہ الغیاث
- ساتھی تو میرے چھوڑ کر مجھ کو چلے گئے ۔ اور آگے میں نے دیکھی نہیں راہ الغیاث
- وہ تو نہ آیا اور محبت مرے سر تک ۔ جاتے ہیں لختِ دل لیے ہمراہ الغیاث

ٹک ۔ ٹک کبھو، تیئں، وے، ہووے، پاوے، آجاوے، سبھوں وغیرہ کا استعمال

محبت کے کلام میں قدمائے دہلی دبستانِ شاعری کی طرح مندرجہ بالا الفاظ کا استعمال موجود ہے ۔ اس قسم کے الفاظ میر تقی میر، میر درد کے کلام میں خاص طور پر ملتے ہیں ۔

- گو موسمِ گل نہیں مجھے صیاد تو لے چل ۔ ٹک جا کے ذرا دیکھ لوں میں خارِ چمن کا

- ہر چند دیکھا بہت اشکال تھا وے ۔ جس طرح ہو سکا ہم اسے لے گھور آج
- اک تبسم کر محبت کے تیئں بتلا دیا ۔ گل سے پوچھا میں نے جب نام و نشانِ غنچہ لب
- اب جو ڈر سے میں آگئے نہ کہتا تھا تجھے دل ۔ معشوق اور ستم نہ کرے یہ کبھو نہ ہو
- اگر وہ شوخ محبت کے گھر میں آجاوے ۔ تو اور کیا ہے مگر جان و دل نثار کرے
- پہنچا نہ ہوتا اس کے کف پا تلک بھلا ۔ ملتا ترا جو خون محبت حنائے ساتھ

؎ تیری مہربانی سن اے یار جانی ـ بہت گر نہ ہووے تو کم ہے غنیمت

؎ اے محبت دور کر غم کے تئیں گلشن کا آج ـ چل تماشا دیکھ لے جلدی کہ جاتی ہے بہار

؎ میرے تو پاس تھا اے شہ سوارِ حلقہ بچشم ـ وطے تیری نہ ہوئی یہ رکاب زیں افسوس

؎ اے یار تو میرے تئیں اغیار مت سمجھ ـ اغیار تو میرے تئیں اے یار مت سمجھ

؎ کچھ آپکا نہ جائے گا جی جائے گا میرا ـ یاں سے خدانخواستہ گر تم کبھو چلے

؎ جلوہ اس رو کا نہ ہو کیوں کر ہر ایک سے دل ـ روشنی سچ ہے کہ خورشید کے گھر گھر ہووے

؎ نوک مژہ پہ لختِ جگر آ رہا ہے اب ـ مل جائے خاک میں نہ ثمر ٹک رہے نگاہ

؎ بالیں تلک ابھی نہیں پہنچا وہ شمع رو ـ سب جل چکا میرا سر و سامان یک بیک

؎ دردِ سر دور نہ ہو دردِ دل آوے ابھی سے ـ صندلی رنگ ہے یہ صندلِ سائیدہ نہیں

؎ وہ بتِ کافر مرا جس وقت آجاوے یہاں ـ شیخ جی میں دیکھ لوں اس وقت ایمان آپکا

؎ اگر وہ بے بہا در کان کا موتی کرے اس کو ـ تو ہر اک اشک میرا گوہرِ یکدانہ ہو جاوے

؎ ~~[illegible]~~

؎ اگرچہ شعر کہنے کی سبھوں کی طرز ہے بہتر ـ محبت پر ترا ہر ایک یہ انداز کیا سمجھے

؎ قاتل جو میرا باندھ کر مجھ پر کمر آوے ـ کھل جائیں سبھی عقدے اور امید بر آوے

؎ جیوں یا مریں ولے ہمارے دل سے ـ یارب نہ کبھی جائے محبت کا درد

؎ جاں کنی کر سکے سو مجھ سے برابر ہووے ـ کوہکن کی ہے کیا جان جو ہمسر ہووے

"ہووے" ردیف میں مکمل غزل موجود ہے جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے :۔

؎ اشک اڑ جائیں میرے پل میں ترے منہ کو دیکھ ـ مہر کے آگے کہاں دیدۂ اختر ہووے

؎ یاد لگا یہ شفا دلِ بیمار دیکھ جا ـ اے عیسیٔ زماں اسے اک بار دیکھ جا

؎ مجنوں نے میں نے درس محبت پڑھا ولے ـ میں نے پڑھا صحیح اور اور اس نے پڑھا غلط

تعقیدِ لفظی اور شترگربہ کی مثالیں

شترگربہ

ــــ جس گھڑی گل رو صبرے تو جلوہ فرمانے لگا ۔ غنچۂ تصویر بھی خجلت سے مرجھانے لگا

ــــ ہمارا قتل تو فرمائیو مت اور کو ہرگز ۔ کہ اس گردن کو ہے ظالم تیری تلوار سے الفت

ــــ باغباں دیکھیں گے ہم بھی تماشائے چمن ۔ لائیگا تشریف جب وہ جلوہ آرائے چمن

ــــ جلوہ چمن میں اتنا نہ فرمائیو کہ یار ۔ بلبل چمن میں گل کا تماشا نہ کر سکے

ــــ زنخداں کی زلف وامیں خود نہیں دیکھی ادا ۔ گریہ نہ مخفی رہ سکا ہم کیا کریں تو کیا کرے

تعقیدِ لفظی ۔

ــــ ساقی ایسا بھی مجھے دیجو ایک جام لذیذ ۔ جسکے ہو جائیں پینے سے دہن و کام لذیذ

ــــ عاشقِ مفلس ہوں پہنچا میرا سر دار پر ۔ میں طرح منصور کے سردار ہوں بھی اور نہیں

ــــ خانۂ دل کو میرے یار کیا کیوں مسمار ۔ حق نے اس کی تو بنائی تھی یہ تعمیر کہ بس

اس شعر میں بنائی اور تعمیر ہم معنی لفظ استعمال کیے ہیں ۔

کلامِ محبت میں اس قسم کی فنی خامیاں نہ ہونے کے برابر ہیں ، آپ نہایت محتاط انداز سے اردو شاعری اور غزل کے معیار کو بلند کیا ۔

رباعیاتِ محبت

محبت کے اردو دیوان میں چالیس رباعیات موجود ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ رباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے اسکے لئے وسعتِ نظر اور شعور کی پختگی چاہئے ہوتی ہے۔ ایک کہنہ مشق شاعر ہی رباعی میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ فروغی اور غنی مولفین " رباعیات حکیم خیام نیشاپوری" لکھتے ہیں[1]

"رباعی مشکل ترین اقسامِ شعر است زیرا باشروط و قیود ے کہ برائے آں مقرر شدہ و بایں کہ چوں در بیت بیشتر نیست، مجالِ سخن در آں تنگ است"

جوش ملیح آبادی کے مطابق:-

"رباعی ایک کمبخت چیز ہے جو سارا جوبن کھا ئے تو ایک بانک بالے کی طرح چالیس پچاس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جاکر قابو میں آتی ہے"[2]۔

رباعی ایک مشکل ترین صنفِ سخن ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غزل، قصیدہ، اور مثنوی کے ہزاروں استاد شعراء گذرے ہیں لیکن رباعی گو شعراء کی تعداد صدیوں کی مدت میں صرف چار پانچ ہے، ان میں حضرت ابو سعید ابو الخیر، شیخ الاسلام انصاری، عمر خیام، سحابی، سنجق اور سرمد کو بھی شامل کر لو اس نے بھی ایک لطف پیدا کیا ہے[3]۔

اس طرح اردو ادب میں بھی یہی حال ہے صرف امجد حیدر آبادی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے صرف رباعیات کہی ہیں انکی نظمیں بھی رباعی کی بحر میں ہیں، البتہ اردو گو شعراء نے اس صنفِ سخن میں حصہ ضرور لیا ہے، غالب، میر تقی میر درد، میر انیس، حالی، اکبر الہ آبادی، حمید عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی وغیرہم نے اس صنف میں قابلِ قدر حصہ لیا ہے

---

[1] رباعیات حکیم نیشاپوری مولفہ فروغی و غنی مطبوعہ تہران ۱۳۲۱ - ص - ۹ - بحوالہ تنقیدی رس، ص - ۷۶۵
[2] تلوک چند محروم "رباعیات محروم"، دیباچہ جوش ملیح آبادی بحوالہ تنقیدی رس، ص - ۷۶۶
[3] کلیات عبد العزیز لکھنوی، دیباچہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی - بحوالہ بر وفیسر اے جی نیازی، تنقیدی رس، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، طبع اول ۱۹۶۵ء - ص - ۷۶۷

موجودہ دور کی رباعیات میں مصرع اولیٰ، مصرعہ دوم اور چہارم ہم قافیہ ہوتے ہیں مگر مصرعہ سوم ہم قافیہ نہیں ہوتا فارسی متاخرین اس طرز کو جائز سمجھتے تھے لیکن کبھی کبھی رودکی، فردوسی، عنصری، تیسرے مصرعے میں قافیہ استعمال کرتے اور کبھی نہیں کرتے تھے۔ بہرحال رباعی کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے تین مصرعوں میں تین باتیں کہی جاتی ہیں اور چوتھے مصرعے میں تینوں کا نچوڑ ہوتا ہے یہ مصرعہ سارے مضمون کا ماحصل ہوتا ہے اس لیے چوتھا مصرعہ تینوں کی نسبت زوردار ہونا چاہیئے۔

مولانا احسن مارہروی کے مطابق۔

"چاروں مصرعوں میں آخری مصرعہ رباعی کی جان ہوتا ہے اور اس کو زوردار بنانے کے لیے تین مصرعے بہم پہنچائے جاتے ہیں"

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے افاداتِ سلیم میں رباعی کے مصرعوں کی ترتیب کی مندرجہ ذیل الفاظ میں وضاحت فرمائی ہے۔

چاروں مصرعوں میں کوئی مضمون اس انداز سے بیان کرنا کہ سامعین پر اس کا اثر ہو ایک ہنر ہے اس میں کوئی مصرعہ بے کار اور برائے بیت نہیں ہونا چاہیئے اور چوتھا مصرعہ خاص کر پہلے والے مصرعوں سے زیادہ شاندار اور اہم ہو یہ مصرعہ ایسا ہونا چاہیئے کہ سننے والے کے دماغ میں اس کی گونج دیر تک باقی رہے[1]۔

مصرعوں کی ترتیب کے علاوہ رباعی کی زبان بھی اسکے کامیابی سے جس طرح قصیدے کے لیے پرشکوہ الفاظ کی ضرورت ہے، غزل کے لیے نرم و نازک اور شیریں الفاظ درکار ہوتے ہیں، رباعی کے لیے زبان کی بلاغت، سادگی و پرکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا افضل بیگ خنجر نے رباعی کی زبان کے لیے مندرجہ ذیل لوازمات ضروری قرار دیئے ہیں۔

---

[1] مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، افاداتِ سلیم، لاہور، ص ۱۹۳

"رباعی کی بہتری، حکمت، نعمت، اخلاق، ادب و فلسفہ اور اس طرح بعض مضامین کی خوش اسلوبی، بندش، دلچسپ ترتیب چستی اور صفائی پر منحصر ہے"

رباعی میں خیال کی پختگی کے ساتھ زبان بھی نہایت صاف ستھری اور اسلوب بیان بھی نہایت برجستہ اور شستہ و رفتہ ہونا چاہیئے تاکہ مضمون ازبر ہوجائے۔ رباعی گو شاعر کا مشاق ہونا بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ، بلند اور ادق سے ادق مضمون کو صرف چار مصرعوں میں باندھنا ہوتا ہے یا یوں کہیئے کہ کوزے میں سمندر بند کرنا ہوتا ہے۔ لہذا رباعی میں تخیل کی بلندی، بیان کی پختگی اور مضمون کی فصاحت کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں رباعی گو کو رباعی کے اوزان سے واقفیت ہونا ضروری ہے کیونکہ رباعی کے اوزان میں بڑے بڑے شعرا نے دھوکہ کھایا ہے۔ ہم یہاں محبت خاں محبت کی رباعیات کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔ محبتؔ نے رباعیات کی ابتدا حمدیہ اشعار سے کی ہے اور پھر عشق محمد پر قائم رکھنے کی دعا کرتے ہیں۔

؎ یا رب تو خداوند ہے انس و جاں کا ۔ خالق ہے جمادات کا اور حیوان کا
جب تک کہ یہ تیری ہے خدائی قائم ۔ رکھ عشق محمد پہ محبت خاں کا

دوسری رباعی میں عشق رسول اور صحابہ کرام سے اپنی عقیدت کا اظہار فرماتے ہیں۔

جس نے اصحاب باصفا کو دیکھا ۔ اسنے گویا کہ مصطفیٰ کو دیکھا
اور جس کی نظر پڑی نبی پر بااللہ ۔ اس نے تو بعینہ خدا کو دیکھا

عشق و دیوانگی کے مضمون کو اس انداز سے باندھا ہے کہ دیوانے کے علاج کا بھی ذکر کر دیا ہے

؎ گیسو جو ملا جو تہمت ہرجائی کا ۔ دل کرنے لگا کلام دانائی کا
معلوم ہوا یہ تجربہ سے کہ نہیں ۔ زنجیر سوا علاج سودائی کا

چوتھا مصرعہ پہلے تینوں مصرعوں کی بھرپور عکاسی کر رہا ہے۔ ہجر و فراق کے صدمات غزل کا طرۂ امتیاز رہے ہیں، محبت نے اردو غزل میں تو ان موضوعات کو کما حقہ، بیان کیا ہے۔ لیکن ان کی رباعیات میں بھی ہجر و فراق کے صدمات کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے محبتؔ کی

رباعیات دوسرے رباعی گو شعراء سے ذرا مختلف ہیں۔

رباعی

ہم کو تو تمام رات رو رو کے کٹی ۔ تجھ کو اے مست خواب سو سو کے کٹی
دل کی تیرے ہجر میں حقیقت نہ پوچھ ۔ میں کیا کہوں اس پہ آہ جو جو کے کٹی

غالب نے کہا ہے :۔

رباعی

دکھ جی کو پسند ہو گیا ہے غالب ۔ دل رک کے بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں ۔ سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

فلسفہ اخلاق کو بیان کرنے کا ایک بڑا ذریعہ رباعی کو تصور کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ بڑے بڑے رباعی گو شعراء نے اپنی رباعیات کا مرکز فلسفۂ اخلاق ہی کو بنایا ہے اور وعظ و نصیحت کا پہلو اسی صنفِ شاعری کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ اس ضمن میں محبت کا انداز دیکھیے۔

رباعی

لازم ہے ہر انسان کا ہر انساں کو لحاظ ۔ مفلس کا علی الخصوص سلطاں کو لحاظ
اے شاہ لحاظ کچھ تو رکھ تو میرا ۔ جب مور کا رہتا تھا سلیماں کو لحاظ

نیکی اور بدی کی قوتیں آپس میں برسرِ پیکار رہتی ہیں نیکی اور بدی کے ساتھ بیداری اور غفلت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

رباعی

بیداری کی خوب ہے وہ سونے کی نہیں ۔ تیری سے چمک دیکھی تو سونے کی نہیں
جو بدی کہلاوے گی وہ نیک نہیں ۔ آخر جو بدی ہے یار نیکی نہیں

محبت نے رباعیات میں بھی غزل کے مضامین زیادہ اختیار کیے ہیں۔

کب تک تو رہے گا تو دست دراز ۔ آتا نہیں اپنی خصلتوں سے کیوں باز
دل جان و خرد سکون لے ہی گئے ۔ عشوے، غمزے، ادا و انداز اور ناز

رباعی

اے قبلہ نظر آئے تیرے ابرو شب ۔ دیکھا میں نے کہ ہے یہ محراب عجب
تب اس کے حضور ہاتھ میں کرکے بلند ۔ کہتا رہا ساری رات یارب یارب

رباعی

~ کچھ شب دُرِ اشک اپنے کھوتے گذری ۔ کچھ رشتۂ مژگاں میں پروتے گذری
شبنم کی طرح خیالِ کاکل میں ترے ۔ افسوس کہ ساری ساری رات روتے گذری

رباعی

~ ہر روز کی ہم سے اشکباری نہ گئی ۔ ہر رات کی اپنی آہ و زاری نہ گئی
عقل و صبر و قرار و تاب و طاقت ۔ سب جاتے رہے پہ تیری یاری نہ گئی

رباعی

~ مرتے ہیں تو دم ترا ہی ہم بھرتے ہیں ۔ جیتے ہیں تو دم ترا ہی ہم بھرتے ہیں
اے جانِ جہاں نزع میں بھی دم کا شمار ۔ کرتے ہیں تو دم ترا ہی ہم بھرتے ہیں

تکرارِ الفاظ کا موزوں استعمال کے ساتھ ساتھ، سادگی و بلاغت ملاحظہ فرمائیے

رباعی

~ دل چھین لیا عشق نے اور ایمان کو ۔ کھویا پھر رفتہ رفتہ دل اور جان کو
بے دین ہے جن نے غرض کہ کیا کیا نہ کیا ۔ اس تیری محبت نے محبت خان کو

تصوف کے ساتھ وعظ و نصیحت کا پہلو اجاگر کرنے کے لیے بھی رباعیات کی مدد لی جاتی ہے محبت نے ان موضوعات کے بارے اس انداز سے کہا ہے ان دو رباعیات میں دیکھیے ۔

رباعی

~ ہستی کے تئیں کوئی نہ سمجھے معقول ۔ اور زر بھی ہوا تو پھر کیا اس سے حصول
دو دن کو خزاں کھڑی ہے تیرے سر پر ۔ اے گل اتنا تو اپنے جامے میں نہ پھول

رباعی

~ اترا جو خمار سر سے مستی نکلی ۔ سمجھا جو فنا کو خود پرستی نکلی
جب نیست ہوا سامنے تجھ کو دیکھا ۔ میرا ترا حجاب ہستی نکلی

وحدت الوجود کے فلسفہ کو کس خوبی سے اس رباعی کے ذریعے حل کر رہے ہیں، منتخب الفاظ سادگی اور

عمر خیام کی رباعیات میں خمریات کے مضمون کو ایک خاص درجہ و اہمیت حاصل ہے۔ دیگر رباعی گو شعراء نے بھی خمریات کے مضامین کو بیان کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبت خاں رند مشرب نہیں ہوتے ہوئے بھی رند مشربی کے لوازمات سے پوری طرح واقف تھے۔

رباعی

باقی نہیں تشنگی سے کچھ اپنا ہوش۔ اور خشکی لب سے دل لگا کرنے خروش
ساقی مے سے چھلکا دے ایسا۔ جو حشر کے دن کو بھی اٹھیں ہم مدہوش

محبت کے دیوانِ اردو میں چالیس رباعیات موجود ہیں جو اردو دیوان کی ضخامت کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہیں لیکن ان رباعیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی گو کے لیے جس شاعرانہ پختگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ محبت خاں میں موجود ہے۔ وہ ایک مشاق اور کہنہ مشق شاعر کی طرح اپنا مافی الضمیر پیش کرتے ہیں۔ ان کی رباعیات کی تعداد کم ہونے کے سبب وہ ایک رباعی گو شاعر کی حیثیت سے کوئی واضح مقام تو نہیں پا سکتے کیوں جدید جدید مضامین کو رباعیات کے ذریعہ انھوں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جو صرف اور صرف رباعیات کے موضوعات ہیں ان کو مکمل طور پر پیش کرنے میں محبت خاں کامیاب نظر نہیں آتے کیوں کہ جب پوری توجہ کے ساتھ یہ سوچتے ہیں کہ وہ ایک خاص صنفِ سخن پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ان کے تخیل میں رباعی کے مضامین آتے ہیں ورنہ وہ ایک غزل گو شاعر ہیں لہٰذا لاکھ دامن بچانا بھی چاہتے ہیں لیکن پھر اسی جگہ آجاتے ہیں جہاں سے گذر کر وہ ایک نئے چمن میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ محبت کے خمیر میں وارداتِ حسن و عشق کی دنیا مستو رہے اور اسی لیے وہ رباعیات میں بھی غزل کا وہی انداز اختیار کر جاتے ہیں جو صرف اور صرف غزل کا انداز کہلایا جا سکتا ہے رباعی کا نہیں۔ بہر حال ان کی وہ رباعیات جو رباعی کے موضوعات کے عین مطابق ہیں، محبت کو ایک کامیاب رباعی گو شاعر ثابت کرتی ہیں۔

مخمس در منقبت حضرت علیؓ

محبت کا یہ مخمس منقبت کے انداز میں حضرت علیؓ کی شان میں تحریر کیا گیا ہے اس منقبت میں جو فضائل و درجات حضرت علیؓ کے بارے میں بیان کیے گئے ہیں وہ عقائدِ اہلِ سنت کے منافی ہیں، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ محبت خاں کسی مصلحت کا شکار ہوئے ہیں البتہ اس دور میں شاعر جب کسی کی مدحت سرائی کرتے تھے تو مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل سنت عقیدہ کے افراد اور اہل سلسلہ حضرات اپنے تمام سلسلوں کو بالآخر حضرت علیؓ سے ہی ملاتے ہیں اور ان کا نہایت ادب و احترام کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ تھے، علاوہ ازیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد تھے، آپ بچپن سے ہی حضور کے پاس رہے تھے اور حضور نے انکی کفالت کی ذمہ داری لے لی تھی۔ حضرت علیؓ ایک بہادر، سادہ طبیعت عابد و زاہد اور بڑے عالم و مفکر خلیفہ گذرے ہیں۔

یہ منقبت ۱۲ بند پر مشتمل ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

ع تم شہ بدر الدجیٰ شمس الضحیٰ ہو یا علی۔ اور جسم و جان و روحِ مصطفیٰ ہو یا علیؓ
جو تمہارا مرتبہ ——— یا علی۔ کیا کہوں اپنی زباں سے میں کہ کیا ہو یا علیؓ
شیرِ حق حاجت روا مشکل کُشا ہو یا علیؓ

ع قلعۂ خیبر اکھاڑا تم نے ہی اک آن میں۔ اور سلیماں کو چھڑایا شیر سے میدان میں
جائے یوسف کی مدد کی چاہ اور زندان میں۔ سیکڑوں آیات نازل ہیں تمہاری شان میں
شیرِ حق حاجت روا مشکل کُشا ہو یا علیؓ

ع دور رکھی گرمیِ آتش خلیل اللہ سے۔ خضر و اسکندر کو لائے تم اندھیری راہ سے
راضی ہے اللہ تم سے اور تم اللہ سے۔ میں سنا ہے اور پڑھا ہے یہ ہر اک آگاہ سے
شیرِ حق حاجت روا مشکل کُشا ہو یا علیؓ

ع غرق کشتی نوح کی طوفان میں ہونے نہ دی۔ کھو دیا ایوب کا درد و الم تم نے .... سبھی
خلصی ماہی تھی یونس کے تئیں تم سے ہوئی۔ اس لیے کہتا ہوں میں ہر آن ہر دم ہر گھڑی
شیرِ حق حاجت روا مشکل کُشا ہو یا علیؓ

مندرجہ بالا چاروں بندوں میں سے آخری تین بندوں میں حضرت علی رضؓ کو پیغمبروں کی مدد کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جن انبیا کرام کے لیے اس مخمس میں اس انداز سے لکھا گیا ہے ان میں حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام شامل ہیں اور یہ تمام انبیا اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور جلیل القدر نبی گذرے ہیں۔ ظاہر یہ کیا گیا ہے کہ ان نبیوں کی دنیا میں آمد سے پہلے ہی حضرت علیؓ اس عالمِ امکاں میں موجود تھے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

ے حجت اللہ تمہیں اور دلیل اللہ تمہیں ۔ اور برہانِ خدا ہو اور وکیل اللہ تمہیں
ہم کلیم اللہ تمہیں ہو ہم خلیل اللہ تمہیں ۔ ہم جمال اللہ تمہیں ہو ہم جمیل اللہ تمہیں
شیرِ حق حاجت روا مشکل کشا ہو یا علیؓ

ے دی تھی حق نے جو سلیماں کے تئیں انگشتری ۔ اور محمدؐ کو کیا مہرِ نبوت دے نبی
ایسے ہی خاتم بنایا تم کو کیا اُن کا وصی ۔ بےشک ولی اور لاریب تم حق کے ولی
شیرِ حق حاجت روا مشکل کشا ہو یا علیؓ

حضرت علیؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصی قرار دیا گیا ہے جو کہ اہلِ تشیعہ کا عقیدہ ہے محبت کا عقیدہ نہیں۔

ے عالمِ علمِ لدنی واقفِ اسرار تم ۔ نائب و قائم مقام احمد مختار تم
میرِ میدانِ شجاعت حیدرِ کرار تم ۔ پیشوا و مقتدا و سرور و سالار تم
شیرِ حق حاجت روا مشکل کشا ہو یا علیؓ

مندرجہ بالا اشعار میں حضرت علیؓ کو حضور کا نائب قرار دیا گیا جو اہلِ سنت کے عقائد کے منافی ہے لیکن جہاں تک "میرِ میدانِ شجاعت" ہونے کا تعلق ہے تو حضرت علیؓ کی بہادری کے واقعات تاریخِ عالم میں اور خاص طور پر تاریخِ اسلام میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے حیدرِ کرار کی بہادری ضرب المثل بن گئی ہے، آپ کی ضرورت میدانِ کارزار میں جب بھی اسلام یا نبی کریم کو محسوس ہوئی آپ

نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخِ اسلام انہیں کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ وہ مسلمانوں کے امیر تھے۔
انہوں نے حضورِ اکرم کی طرح درویشانہ زندگی بسر کی اور مسلمانوں کو حضور کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایات دیتے رہے۔

نیرِ برجِ امامت آفتابِ چرخِ دیں ۔ ہادیِ راہِ ہدیٰ یعنی امیر المومنیں
حاکمِ ہفت آسماں و والیِ عرشِ بریں ۔ یہ سخن ہے میری جان و دل سے تب کرتی یقیں
شیرِ حق حاجت روا مشکل کشا ہو یا علیؓ

یہ محبت جو تمہارا ہے غلامِ خاکسار ۔ بے طرح آئی ہے اس پہ گردشِ لیل و نہار
اک نگاہِ رحم ہو جاوے شہِ عالی تبار ۔ دور کر دو درد اس کا یہی کہ تم دلدل سوار
شیرِ حق حاجت روا مشکل کشا ہو یا علیؓ

نوابینِ لکھنؤ شیعہ عقیدہ سے تعلق رکھتے تھے نواب شجاع الدولہ کے زمانے ہی میں یہ عقیدہ وجود میں آیا ان کے ساتھ شعراء نے بھی اہلِ بیت کی شان بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ جہاں تک اہلِ بیت سے عقیدت و محبت کا تعلق ہے تو اہلِ سنت بھی حد درجہ عزت و احترام کی نگاہ سے انہیں دیکھتے ہیں کیونکہ حضور اکرم کا بھی یہی حکم ہے جس کا اشارہ آخری خطبہ میں کیا گیا ہے۔ شیعہ و سنی دونوں فرقے اس حد تک بڑھ گئے کہ حضرت علیؓ کا مرتبہ انبیاءِ کرام سے بھی بڑھا دیا حالانکہ حضرت علیؓ کا مرتبہ نبیوں سے زیادہ ہرگز نہیں ہو سکتا اور جس طرح اس منقبت میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے مختلف کٹھن اوقات میں مختلف انبیاءِ کرام کی مدد فرمائی دراصل ایسی باتیں شاعرانہ تعلّی اور مبالغہ آرائی کہلائی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم کہانیاں اور قصے گھڑے گئے یہاں تک کے بعض حضرات نے تو حضرت علیؓ کو معوذ باللہ خدا تک کہہ دیا۔ یہ عقائد اسلام کے حدود اور تعلیمات سے تجاوز کر گئے اگر ایسے لوگوں پر شرعی احکامات صادر کئے جائیں تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔

دوسرا مخمس

دوسرا مخمس محبت کے رنگ تغزل کا آئینہ دار ہے، اس میں ۸ بند ہیں، سوز و گداز و وارفتگی اس کا خاص پہلو ہے۔ محبت میں جنون و دیوانگی کا شغلہ، محبوب کی بے التفاتی و عدم توجہی، گلشن ہستی میں آمد کا پچھتاوا وغیرہ اس مخمس میں اسی قسم کے رنگ ہیں۔

؎ کون سے روز میں سر سنگ سے مارا نہ کیا ۔ ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا
یہ مرض کا مرے تونے کبھی چارا نہ کیا ۔ درد دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا
نہ کیا میری طرف تونے گزارا[1] نہ کیا

تیسرے بند میں محبوب کا قہر و غضب کس روانی و سادگی سے بیان کرتے ہیں، اس میں غم واندوہ کی ایک کیفیت کا بھرپور اظہار بھی پایا جاتا ہے۔

؎ کس لیے قہر سے تم آنکھ دکھاتے ہو بھلا ۔ کیوں مرے آنے سے تیوری کو چڑھاتے ہو بھلا
جب نہیں آتا تو کیوں گھر سے بلاتے ہو بھلا ۔ اب جو آیا ہوں تو محفل سے اٹھاتے ہو بھلا

اس بند میں ہستیٔ بے بود اور انسان کا اس دنیا میں مختصر عرصے کے لیے قیام جس طرح چمن میں گلوں کی آمد و روانگی۔

؎ آکے اس گلشن ہستی میں بہت پچھتائے ۔ چشم کو پائے پر کچھ دید نہ کرنے پائے
فائدہ کیا ہوا جو باغ جہاں میں آئے ۔ چشم وا کرتے ہی نرگس کی طرح کملائے
چمن دہر کا کچھ ہم نے گزارا نہ کیا

محبوب کی بے وفائی کا شکوہ اس انداز سے کر رہے ہیں۔

؎ تارک مہر و وفا ہوتے ہو کیا باعث ہے ۔ موجب جور و جفا ہوتے ہو کیا باعث ہے
بولو تو رو بہ قفا ہوتے ہو کیا باعث ہے ۔ کس لیے مجھ سے خفا ہوتے ہو کیا باعث ہے
جو کہا میں نے سو کب میں نے گوارا نہ کیا

---

[1] گذر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

تیسرا مخمس

تیسرے مخمس میں ۷ سات بند ہیں، احساس غم، دردمندی اور اس دنیا کی ناپائیداری اس کے خاص موضوعات ہیں اس کے تین بند پیش خدمت ہیں۔

~ دل جلے بیٹھے ہیں تنگ ہم خستہ جاں اٹھ جائیں گے ۔ اک گھڑی اک پل کے ہیں گے مہماں اٹھ جائیں گے
آپ ہی روتے روتے ناگہاں اٹھ جائیں گے ۔ آخر اس کی بزم سے ہم شمع ساں اٹھ جائیں گے
صبح تک جلتے ہیں پھر گریہ کناں اٹھ جائیں گے

~ وحش ہیں یا طیر ہیں یا جن و یا انساں ہیں ۔ کوئی اک ساعت ہیں دنیا میں کوئی اک آن ہیں
یہ سخن سن لے محبت کا جو تیرے کان ہیں ۔ اس جہاں کے لوگ جرأت کوئی دن مہماں ہیں
سب عدم سے آئے ہیں اور پھر وہاں اٹھ جائیں گے

~ باغباں کے ہاتھ سے کیا بلبلیں نالاں ہیں ۔ آبجوئیں بھی تو گلشن بیچ سرگرداں ہیں
سب بہار حسن کے آفت زدے یکساں ہیں ۔ ہم بھی اس باغ جہاں میں سب کے سب مہماں ہیں
مثل شبنم صبح کو گریہ کناں اٹھ جائیں گے

چوتھا مخمس ۔

اس میں نو بند ہیں ان میں سے چند بند ملاحظہ فرمائیے ۔

~ رات کو سب یار تھے اور وہ مرا جانانہ تھا ۔ جو کہ تھا اس ماہ رو کی شکل کا دیوانہ تھا
ہم نشیں اس بزم میں کیا جانے تو تھا یا نہ تھا ۔ شب کہ مجلس بیچ وہ غارت گر ہر خانہ تھا
تھے جو باہم آشنا اک ایک سے بیگانہ تھا

وحدت الوجود کے عقیدے کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

~ شاخ اور برگ و ثمر کا تخم ہی سے ہے نہاد ۔ ایک ہی سے ہے ظہور خاک و آب و نار و باد
خوب سے گر غور کیجے چھوڑ کر یار و عباد ۔ جز و کل میں فرق اتنا ہے فقط بے اعتقاد
ورنہ جس خرمن کو دیکھا فی الحقیقت دانہ تھا ۔

ے یوں ہی پھرتا تھا میں ہر جانب کو طور سیر سے ۔ چشم کیفی تیری دیکھی میں نے بارے خیر سے
پر وہ عالم کہہ نہیں سکتا ہوں ہرگز غیر سے ۔ کل تو مست اس کیفیت سے تھا کہ آئے دیر سے

پھر نظر جو مدرسہ دیکھا سو وہ میخانہ تھا

ے عیش کو باغ جہاں میں آئے تھے ہم تو ولے ۔ جائے میں جب تک رہے یاں خون دل پیتے رہے
گلشن ہستی کی ہیں یار و خزاں ایسی ترے ۔ اس چمن میں جب تلک ہم نشہ ہستی میں بہے

عمر کا اپنی پر از خونِ جگر پیمانہ تھا

پانچواں مخمس

پانچویں مخمس میں ۷ بند ہیں۔ چند چنیدہ بند ملاحظہ فرمائیے۔ اشک و آہ، اور رونے دھونے کی ادا نرالے انداز سے بیان کرتے ہیں:۔

ے کب میں کہتا ہوں کہ چشم آنسو بہانے سے رہے ۔ کب میں کہتا ہوں کہ غم سینا جلانے سے رہے
کب میں کہتا ہوں کہ یہ عشق اب نبھانے سے رہے ۔ کب میں کہتا ہوں کہ میری جان جانے سے رہے

یہ کچھ اب ہو کہ دل تنگ تلملانے سے رہے

ے مجھ کو تھی معلوم آگے آنسوؤں کی رسم و راہ ۔ اب بہے جا دینگے میرے دل جگر کو کر تباہ
سو ہوئے آثار ظاہر میں جو کرتا ہوں نگاہ ۔ اب تو نامِ نم بھی آنکھوں میں نہیں ہے یہ کہ آہ

دل جگر سب بہہ چکے جو اشک آنے سے رہے

محولہ بالا دونوں بند روانی اور اشک فشانی کے بیان کی بہترین مثال ہیں تکرارِ الفاظِ حسین کے ساتھ ہی ان اشعار میں وارفتگی، شدتِ غم اور آہ و فریاد کی پر اثر کیفیات کا اظہار نہایت عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے۔ دلی کیفیات کے اس اظہار میں حقیقت اور جذبہ کی سچائی سے انکار کرنا مشکل ہے۔ ان مخمسات میں احساسات اور جذبات امڈ کر سامنے آجاتے ہیں اور قاری انہیں پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

دلی کے دبستان شاعری میں صنفِ نازک کے بجائے لڑکے، نوجوان، کو ہی غزل کا محور بنایا جاتا تھا محبت خاں نے بھی اس مضمون کو اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

خوف اس ظالم سے کچھ آتا نہ تھا لڑکا تھا جب ۔ جو گذرتا تھا ہمارے دل پہ سو کہتے تھے سب
اب جواں ہے تند خو ہے کیا کہیں ہے بے غضب ۔ آگے تو کہتے بھی تھے کچھ ہم پہ اس کے ڈر سے اب
حالِ دل اپنا بھی یارو ہم سنانے سے رہے

روزمرہ اور محاورہ کا استعمال محبت کے کلام میں اہتمام سے ملتا ہے انہوں نے اردو غزل، مثنوی اور مخمسات میں بھی روزمرہ کو نہایت التزام کے ساتھ بلیش کیا ہے ۔ روزمرہ بول چال کی زبان ملاحظہ فرمائیے ۔

اور یہی تقصیر ثابت کچھ ہماری تو نے کی ۔ ہاں مگر اک عشق میں بدنام ہیں یہ تو بھی
پوچھتے ہیں تم سے ہم بتلاؤ تو ہم کو ابھی ۔ ہم نے ایسی بھی تو کچھ جبوری نہ کی تھی آپ کی
بے سبب جو آپ اب ادھر کے آنے سے رہے

آگیا کیا تم کو ملنے سے ہمارے ننگ و عار ۔ مہر کی باتیں جو تھیں سو چھوڑ دیں سب ایک بار
نے مروت نہ ہی الفت نہ محبت ہی نہ پیار ۔ آہ کس کی بے وفائی کا میاں کیجے شمار
اور تو سب اک طرف منہ بھی دکھانے سے رہے

اسی بند میں اپنے دوست اور معتمد خاص حسن" کا ذکر کرتے ہیں، خواجہ حسن اور خواجہ حسین دو بھائی تھے حسن محبت کے ہم مشرب و ہم مسلک تھے اور سلسلۂ مودودیہ سے بیعت تھے ۔

جب کہا اس نے بھلا ہے گھر کو تم جاؤ اگر ۔ تب کہا ہم نے تیری دہلیز تو ہے اپنا گھر
ہم محبت تھے کوئی جاتے تھے اس کا چھوڑ در ۔ اس نے کس کس طرح اپنے در سے ٹالا ہم کو پر
دیکھ تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

چھٹا مخمس ۔ اسکے چند بند ملاحظہ کیجیے ۔

ے نیرنگی میں اے شوخ تیری رنگ نیا ہے ۔ کینہ سے سدا دل پہ تیرے سنگ نیا ہے
ہر رات میرے قتل کا آہنگ نیا ہے ۔ ہر روز تیری جنگ[1] کا اک ڈھنگ نیا ہے
آج آنکھیں ہی لڑ جائیں کہ یہ جنگ نیا ہے

ے بتلا تو رکھا ہے کفِ پا خون میں کس کے ۔ آلودہ کیا ہے کفِ پا خون میں کس کے
یوں سرخ ہوا ہے کفِ پا خون میں کس کے ۔ سچ کہہ کہ سَلا ہے کفِ پا خون میں کس کے
مہندی کا نہیں رنگ کہ یہ رنگ نیا ہے

ے ہر چند بڑا کوہکنی میں ہے تو استاد ۔ اک تیشہ سے کھود لیوے گا کوہ کی بنیاد
پر یہ بھی سخن راست ہے اس بات کو رکھ یاد ۔ تیھر[2] کو تو پھوڑے ہے تیری آہ سے فرہاد
شیریں کا نہ دل نرم ہو یہ سنگ نیا ہے

یہ بند ملاحظہ فرمائیے، اس میں بندشِ مضمون اور نکتہ آفرینی اپنے عروج پر ہے ۔

ے یوں مرغ تو آئے ہیں ہزاروں تیرے بس میں ۔ ایسی نہ ستی ہوگی صد لاکھ برس میں
گر تو ہے خوش آواز کہ سننے کی ہوس میں ۔ صیاد میرے دل ہی کو رکھ اپنے قفس میں
خوش ہوگا کہ یہ مرغ خوش آہنگ نیا ہے

غزل کی زبان میں دو بند دیکھیے ۔ لیکن ان اشعار کا معیار بلند نہیں ہے ۔

ے آنا بھی میرے پاس ٹک اور بھاگ بھی جانا ۔ ہر وقت مجھے دیکھنا اور آنکھ چرانا
اس شرم کو کیا کہتے ہیں ٹک مجھ کو بتانا ۔ تب ساتھ بھی سونا میرے اور منہ بھی چھپانا
قربان تیرے ننگ کے یہ ننگ نیا ہے

ہے گر چہ ہوا خواہ میری مثلِ صبا تو ۔ ہر غنچۂ دل تازہ ہے اس کو نہ کھلا تو
چڑ جائے گا ناحق کے تئیں ہر جگہ تو ۔ دو روز ابھی دل کو محبت کے لگا تو
مت چھیڑ کہ یہ غنچۂ دل تنگ نیا ہے

---

[1] جنگ کو مذکرہ باندھا ہے [2] تیھر سے مراد ہے ۔

ساتویں مخمس میں ۱۰ بند ہیں ۔ چند ملاحظہ فرمائیے ۔

ان بندوں میں عشق کی لذتوں کا بیان، آتشِ عشق میں جلنے کی عاشق کو مسرت، محرومیوں اور نامرادیوں کا احساس، غموں کو سینے سے لگانا، شبِ مہتاب میں محبوب کے ہاتھوں سے جام شراب کی طلب اور محبوب کے ہاتھوں عاشق کا بے خطر قتل ہو جانا ۔ یہ ان چند محولہ بندوں کے مضامین ہیں ۔

جلا جو عشق کا ہووے کہاں آتش سے گھبرائے ۔ جلے وہ بلکہ جوں جوں اور تیوں تیوں لذتیں پائے
تسلی ٹھنڈی ٹھنڈی سانس سے اس جاں کو ہووے ۔ دل و جاں سب سلگ جائے جگر میں آگ لگ جائے
تیرا اے آہ سینے سے گزر یوں ہو تو بہتر ہے

نہ ہو توشہ نہ ڈھارس دے کوئی ہمدم خلیق اپنا ۔ نہ کوئی مہرباں ہو اور نہ کوئی ہو شفیق اپنا
جہاں سے کوچ کیجے اس طرح جوں بے طریق اپنا ۔ نہ ہووے یار کچھ ہمراہ نہ کوئی رفیق اپنا
برائے دہر سے یار و سفر یوں ہو تو بہتر ہے

شبِ مہتاب میں ہوتا ہے تیرا حسن روز افزوں ۔ تبھی جی چاہتا ہے یہ کہ ایک شب ہووے پیارے یوں
مجھے تو جام اپنے ہاتھ سے دے اور میں تجھ کو دوں ۔ شراب و ساقی و مطرب ہو تو ہو اور میں ہوں
اگر اک شام بھی پیارے بسر یوں ہو تو بہتر ہے

محبت میں ستم اس نے کیا سو سب سہا میں نے ۔ نہ پھیری گردن اس کی تیغ سے اور سر دیا میں نے
مرے مرنے کی عالم میں خبر یوں ہو تو بہتر ہے

محبت بحیثیت فارسی گو شاعر

نواب محبت کی فارسی شاعری کے بارے میں بیشتر تذکرہ نگار یہ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے اردو کے ساتھ ہی فارسی اور پشتو زبان میں بھی دیوان مرتب کیے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اردو کلام کے علاوہ دیگر دیوان تلف ہوگئے[1]۔ نواب مستجاب کے مطابق :-

" دیوان فارسی ہم مرتب است چگویم کہ چہا مضامین رنگین و معانی عالی کہ در اشعار شعرائے متاخرین بل متقدمین کم بہم میرسد"[2]

مصنف گلستانِ رحمت مزید فرماتے ہیں :-

" در ہر بیت آن متیر است بجہت شادی سخن کلی از ان گلشن و گوہری ازاں معدن دریں مخزن در آوردن مناسب افتاد پیش ظاہر پرستاں اثبات دعویٰ خود کردد "

محبت خاں کی شاعری کا وہی دور ہے جب لکھنؤ میں سودا اور فاخر مکیں جیسے اساتذہ موجود تھے محبت نے فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکیں کو اپنا استاد بنایا - مولف فارسی گو شعرائے اردو لکھتے ہیں :-

" آخر بہ گفتن اشعارِ فارسی سیر کردہ شاگرد مرزا فاخر مکیں شدند چند روز مجلسِ مشاعرہ درخانہ خود ترتیب دادند اشعار بہ سمع فقیر نہ رسیدہ مگر غزل کہ تازہ مرثیہ نماکہ دربیان مفارقت اقربا و آوارگی وطن و مہاجرت خویشاں و حالت پر ملالت خود مشتمل بر غم اندوہ و بلا کہ برش کم از واقعہ کربلا نہ بود"۔

نواب محبت خاں نے کٹرہ میراں پور کی جنگ میں اپنے والد نواب حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد اپنے اہل خاندان کے ساتھ قلعہ الہ آباد میں جو دو برس قید و بند کی صعوبتوں میں گذارے وہ ان کے لیے سوہانِ روح تھے ، انکے اور انکے اہل خاندان پر جو مظالم انگریز فوج نے توڑے وہ[3]

---

[2] نواب مستجاب خاں : گلستانِ رحمت ، خطی نسخہ ، فارسی ، ص - ۵۱۲

[3] تفصیل کے لیے دیکھیے "حیات حافظ رحمت خاں" از سید الطاف علی بریلوی -

تاریخ کے چہرے پر بدنما داغ ہیں ۔ قیامِ لکھنؤ کے دوران نظاہر تو نواب آصف الدولہ محبت خاں سے بہتر سلوک کرتے تھے لیکن انہیں پٹھانوں کی جانب سے خطرہ رہتا تھا لہٰذا وہ نواب محبت خاں کی نگرانی رکھتے تھے ۔ محبت خاں نے روہیل کھنڈ سے جدائی کو اپنی باقی ماندہ زندگی تک محسوس کیا تھا ، فرماتے ہیں :۔

؎ صیاد گر زباغ جدا گشتہ ام چہ غم ۔ از خونِ خود قفس شدہ رشکِ چمن مرا

اب جہاں تک محبت کی فارسی شاعری کا تعلق ہے تو اس پر مختصراً تبصرہ کرنے سے قبل ہم فارسی شاعری کی ابتدا کے بارے میں چند باتیں تحریر کریں گے ۔ علامہ نیاز فتح پوری فرماتے ہیں ۔

جب[1] مغلوں کی حکومت کو ہندوستان میں عروج ہوا اور فارسی زبان کا عام چرچا ہوا تو اس کے محاسن کا معیار بھی فرغانہ و ایران ہی کی سرزمین کو قرار دیا گیا اور ہندوستان کے تذکرہ نویسوں نے جب کبھی اپنے ملک کے فارسی شاعروں کا ذکر کیا تو ہمیشہ اس نکتہ چینی کے ساتھ کہ وہ "ہندی نژاد" ہے اور یہ بات کبھی ان کے سامنے نہ آئی کہ خود ایران نے کتنے قابلِ ذکر شاعر پیدا کیے ۔

فارسی شاعری کا اسلامی دور تیسری صدی ہجری یعنی دولتِ عباسیہ کے زوال سے شروع ہوتا ہے ۔ اس کے بعد سامانی خاندان کی حکومت میں بھی دو قابلِ ذکر شعراء کا نام سامنے آتا ہے ایک رودکی جسے فارسی غزل کا ابوالآباد کہا جاتا ہے اور دوسرا دقیقی جس نے شاہنامہ کی ابتدا کی ۔ دورِ غزنوی میں صرف فردوسی قابلِ ذکر شاعر ہے ورنہ ادبِ قدیم کے سلسلے میں عنصری ، فرخی ، اسدی ، طوسی اور منوچہری کا کلام بھی مطالعہ کیا جاتا رہا ہے ۔ غزنوی سلطنت کے زوال کے بعد سلجوقی حکومت کے دور میں سلطان سنجر کا دربار شعر و ادب کا مرکز بن گیا تھا ، اس دور کے قابلِ ذکر اسمائے گرامی نظامی ، خاقانی ، اور انوری ہیں ۔ تاتاری فتنے کے بعد فارسی کا پچھلا دور ختم ہوا ترکوں اور مغلوں کا زمانہ آیا جس میں غزل کا

---

[1] مولانا نیاز فتح پوری : فارسی غزل گو شعراء میں غالب کا مرتبہ ، نگار پاکستان ، ۱۹۶۹ ، غالب نمبر ، ص ۔ ۱۰۸

غزل کا صحیح مفہوم متعین ہوا لیکن سوائے سعدی اور حافظ کے تیسرے غزل گو کا نام اس دور میں بھی
نہیں لیا جا سکتا ۔ حضرت امیر خسرو اسی عہد کے شاعر تھے لیکن یاد رہے کہ وہ ہندوستان سے تعلق
رکھتے تھے ایران کے نہ تھے ۔ مختصر یہ کہ تیسری صدی سے لے کر گیارہویں صدی کے وسط تک تقریباً
ایک ہزار سال کی مدت میں ایرانی شعراء کی فہرست یہ ہے ، رودکی ، دقیقی ، فردوسی ، نظامی ،
خاقانی ، انوری ، سعدی ، حافظ ، اسمٰعیل ، صائب ، عرفی ، نظیری ، طالب آملی ، اور ابوطالب
کلیم جبکہ خسرو اور فیضی ایرانی نہیں تھے ، حضرت امیر خسرو نے خلجیوں کا دور دیکھا تھا ۔

ہندوستان میں فارسی شاعری کا عام ذوق مغلیہ عہد سے شروع ہوا اور اسی کے ساتھ
ختم ہوگیا ۔ شاہجہاں کے آخری زمانے میں صرف ایک مشہور فارسی گو شاعر نظر آتا ہے اور وہ ہے بیدل"
جبکہ بہادر شاہ کے زمانے میں غالب کا نام اس ضمن میں لیا جا سکتا ہے ۔ ایران نے ایک ہزار سال
میں صرف پندرہ شاعر پیدا کیے جبکہ ہندوستان کی جانب سے چار ، پانچ صدی کے اندر پانچ شعراء کے نام بھی
پیش کیے جائیں تو یہ کوئی معمولی بات نہ ہوگی ۔ ہندوستان کا سب سے پہلا فارسی گو شاعر جس کا جامعیت
کے لحاظ سے ایران کی سرزمین بھی جواب پیش نہیں کر سکتی خسرو تھا ۔ انکی شاعری و زبان دانی کا یہ مرتبہ
تھا کہ عرفی ، حافظ اور جامی کو اس کا اعتراف کرنا پڑا اور اگر ہم ان تمام علوم و فنون کو سامنے رکھیں
جن کے وہ ماہر تھے تو ایران کے تمام شاعر مل کر بھی خسرو کے پلہ کو ہلکا نہیں کر سکتے ۔[1] حضرت امیر خسرو نے
غزل ، مثنوی ، قصیدہ سبھی کچھ کہے اور جو کچھ کہا وہ ایران کے بہترین غزل کہنے والوں مشہور مثنوی نگاروں
اور بلند ترین قصیدہ سنجوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے ۔

دوسرا ہندی نژاد شاعر جس نے ایرانی شعراء سے اپنا لوہا منوایا وہ فیضی تھا اپنی
جامعیت کے لحاظ سے دربار اکبری کے تمام شعراء پر بھاری تھا ۔ غزل میں تو بیشک وہ عرفی اور نظیری
کے برابر نہیں لیکن باقی تمام اصناف سخن میں استادانہ حیثیت کا مالک تھا ۔ تیسرا شاعر جو معنوی

---

۱ مولانا نیاز فتح پوری : فارسی گو شعراء میں غالب کا مرتبہ ، نگار پاکستان ، غالب نمبر ، ۱۹۶۹ ۔ ص

لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا مرزا عبدالقادر بیدؔل تھا یقیناً بیدؔل کی شاعری ایرانی محاورات کی شاعری نہیں لیکن جو زبان اس نے پیدا کی اسکی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرزا مظہر جانِ جاناں کا نام بھی آتا ہے جن کی غزل گوئی میں سعؔدی اور انکے بعد کے آنے والے شعرا کے دونوں زبانوں کا رنگ سمویا ہوا ہے۔

نواب محبّت کا عہد وہ عہد ہے جس میں فارسی کا تنوّع اور جلال اپنے عروج پر تھا لیکن اب آہستہ آہستہ فارسی الفاظ کی رنگ آمیزی اردو میں کی جارہی تھی۔ اس دور میں سوداؔ اور فاخر مکیںؔ دو ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جو فارسی شاعری سے ہی دلچسپی نہیں رکھتیں بلکہ سوداؔ نے فارسی نثر میں ایک رسالہ "عبرت الغافلین"[1] فاخر مکیںؔ کی فارسی شاعری کی تنقید میں تحریر کیا۔ یہ چیز اس زمانے کے معیارِ تنقید شعر دکھانے کے لیے اہم چیز ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک مختصر فارسی دیوان بھی ترتیب دیا تھا۔ محبت خاں مرزا فاخر مکیںؔ سے فارسی اشعار کی اصلاح لیتے تھے، لکھنؤ میں مرزا فاخر مکیںؔ زبان فارسی کے مشہور شاعر تھے۔[2] محبت خاں کی مادری زبان پشتو تھی اور فارسی انکے خاندان کی خاص زبان اسلئے تھی کہ تعلیم و تعلم کا ذریعہ یہی تھی اور انکا گھرانہ عالم و فاضل اشخاص کا گھرانہ تھا اس کے علاوہ عربی سے بھی ان روہیلوں کو شغف تھا۔ نواب محبت خاں کا وہ عربی قطعہ جو انہوں نے اپنے والدِ محترم کی وفات پر کہا تھا اس بات کی دلیل ہے کہ نواب موصوف نے لکھنؤ آنے سے قبل ہی عربی، فارسی میں اشعار کہنا شروع کر دیے ہونگے، البتہ لکھنؤ آنے کے بعد فاخر مکیںؔ کی فارسی زبان میں شعر کہنے کے لیے شاگردی اختیار کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نواب موصوف نے اگر فارسی دیوان ترتیب دیا تو وہ اتنا مشہور کیوں نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران وہ فارسی دیوان ہی تلف ہوگیا، اگر وہ دیوان ناقدین کے سامنے ہوتا تو یقیناً داد کا مستحق ٹھہرتا۔ البتہ مختلف تذکروں میں محبت کے فارسی اشعار موجود ہیں جو خود

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ "رسالہ عبرۃ الغافلین طبع شاعر کے لیے سیر تفریح کا کام دیتا ہے"۔

[2] ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی؛ دلی کا دبستانِ شاعری، طبع اول، کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۴۹ء، ص - ۱۶۹

اس حقیقت کا مظہر ہیں کہ نواب محبت کی فارسی شاعری کو اس دور کے بڑے بڑے فارسی گو شعرائے کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس سے قبل بھی نواب محبت کی اردو شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ محبت ایک غزل گو شاعر ہیں اور فارسی شاعری میں بھی ان کی غزل گوئی کا وہی انداز ہے جو فارسی غزل کا بھی طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اردو غزل دراصل فارسی غزل سے متاثر رہی ہے اور پھر غزل کے لیے جو لہجہ مخصوص ہو کر رہ گیا تھا وہ فارسی زبان اور اسکی شیرینی سے زیادہ قریب ہے۔

عشق و محبت کا حاصل جنون و دیوانگی ہیں غالبؔ نے اس مضمون کو اس انداز سے باندھا تھا

؎ اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے۔ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں "غالبؔ"

لیکن محبتؔ اس مضمون میں غالبؔ سے قبل ہی یہ انداز اختیار کر چکے ہیں۔

؎ دستِ شوقم گر چنیں سوئی گریباں می رود۔ چاک پیردم از گریباں تا بہ داماں می رود

اور پھر اپنا پیچ و تاب اور خاک کا بگولہ بن کر اڑنے کا سبب بھی اپنی دیوانگی کو قرار دیتے ہیں فرماتے ہیں،

؎ پیچ و تابم از جنوں گر نیست خاکِ من چرا۔ گرد بادی می شود سوئی بیاباں می رود

مضمون آفرینی اردو اور فارسی غزل میں قدر مشترک ہے ایک ہی مضمون کو مختلف شعرائے اپنے اپنے انداز سے باندھ کر اپنی انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے۔ قدیم دور سے آج تک اکثر ہم وہی مضامین پڑھتے اور اختیار کرتے چلے آرہے ہیں لیکن ہر مضمون میں شاعر کوئی نہ کوئی خاص نکتہ رکھ کر اس شعر کی افادیت بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وحشت جنوں کے یہ مضامین ہمیں اردو، فارسی شاعری میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ محبتؔ فرماتے ہیں

؎ اهلِ خرابہ را بہ تماشا چہ احتیاج۔ ویرانِ دلی چو هست بہ صحرا چہ احتیاج

ویرانیوں میں رہنے والوں کو تماشوں کی کیا ضرورت اور جس کے پاس ویران دل ہو اسے صحرا کی کیا ضرورت۔

محبتؔ کا محولہ بالا شعر سلاست و بلاغت کی اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ شاعری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ذہن کے سوتے کھول دے اور ایک مختصر سی بات سن کر سامع کے ذہن و نظر میں ایک وسیع داستان گھوم جائے، یہی بلاغت کی مثال کہلاتی ہے۔ عشق و جنوں کا میدان کس قدر وسیع ہے اور اس میدان میں آنے

والا ہر مجنوں اپنے جنون کو پہلے سے زیادہ معتبر ظاہر کرتا ہے ۔ محبت فرماتے ہیں :-

به صحرائے محبت از تو در دیوانگی افزوں ۔ کہ می دانست ای مجنوں محبت خاں شود پیدا

اس کے ساتھ ساتھ محبت کی چاک دامانی کا بھی مشاہدہ کرتے چلیئے ۔

رویم بر بیں شگفتہ کہ در عین خرمی ۔ چوں گل ہزار چاک شود پیرہن مرا

ہر خوشی غم کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور ہر غم کے بعد خوشی ملتی ہے یعنی دکھ اور سکھ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں عے محبت نام ہے مصائب و آلام اور غم و اندوہ کا ، غزل میں اس پہلو کو جتنے بہتر انداز سے اجاگر کیا جاتا ہے غزل اتنی ہی پر اثر بن کر سامنے آتی ہے ۔ کہیں صیاد اور قفس کا ذکر اور کہیں اشک و آہیں عشق کو معتبر بنانے کے ذرائع ہوتے ہیں :-

صیاد گر ز باغ جدا گشتہ ام چہ غم ۔ از خونِ خود قفس شدہ رشکِ چمن مرا

ز سرگذشت محبت زہر کہ پرسیدم ۔ بہ عارض اشک پیاپی چکید و ہیچ نہ گفت

گرمیٔ عشق کا اثر دیکھیئے یہ شعر سائنٹیفک انداز لیے ہوئے ہے :-

اب یہ اشعار دیکھیے :-

بس کہ گردید فزوں گرمی و اشک و آہم ۔ آب شد آتش و دود از دل دریا برخاست

چشم ای ماہ شب و روز ز بس گریاں است ۔ خلق گویند کہ امسال عجب باراں است

دلم از سینۂ پر داغ حدیثی دارد ۔ بلبلی حرف بہار چمن می گوید

ز سوز سینۂ من دیدہ گریاں شود پیدا ۔ تعجب زیں تنورم ہست کہ طوفاں شود پیدا

محبت خاں کو شاعری کے اور خاص طور پر فارسی کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے کوئی دقت در پیش نہیں ہوئی ہوگی کیونکہ فارسی زبان پر انہیں مکمل دسترس حاصل تھی ۔ آپ نے نہایت سادگی اور زبان دانی کا خیال رکھتے ہوئے اپنی فارسی غزل کو رنگ تغزل سے ہم آہنگ کیا ۔ مضمون کی کہنگی دور کرنے کے لیے نیا انداز چاہیئے ہوتا ہے اور کسی پامال مضمون کو کسی ایسے نئے انداز سے پیش کرنا کہ اس کی قدامت دور ہوتی نظر آئے اور قاری کو مضمون نیا معلوم ہو ، نہایت لطیف ذوق پاکیزہ فکر

اور عمدہ درجہ ذہانت درکار ہوتی ہے ۔

نواب محبّت خان کی مادری زبان پشتو تھی جو فارسی سے بہت قریب ہے، جبکہ فارسی ان کی خاندانی زبان کا درجہ رکھتی تھی کیونکہ یہی زبان تعلیم و تعلم کا ذریعہ تھی اور محبّت کے بزرگ علمی حیثیت سے بھی معروف تھے ۔ ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر محبت کا دیوانِ فارسی آج سامنے ہوتا تو یقیناً صورتِ حال کچھ اور ہوتی اور محبّت بحیثیت ایک فارسی گو شاعر بھی ہندوستان کے شعراء میں نمایاں نظر آتے، اس کے باوجود مختلف تذکروں میں جو چند منتخب محبّت کی فارسی غزلیات اور چند اشعار آپ کو بحیثیت ایک مشاق اور کامیاب فارسی غزل گو شاعر تسلیم کرنے میں مدد کرتے ہیں ۔ جہاں تک فارسی غزل کا تعلق ہے تو یہ بھی جذباتِ محبت کا سادہ اظہار چاہتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اندازِ بیان میں اگر ندرت ہو تو پھر غزل کی دلکشی اور رعنائی بڑھ جاتی ہے ۔ محبّت کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے سلاست اور روانی بھی لیکن سب سے بڑھکر جو قابل ذکر بات محبّت کے فارسی کلام کی ہے وہ ہے رنگ تغزل ۔ اگر رنگ تغزل خاص طور پر فارسی غزل میں نمایاں نہ ہو تو پُر معنی فارسی شاعری بھی پھیکی نظر آئے گی ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جو محبّت کی فارسی غزل اور فارسی میں ان کا درجہ متعین کرنے میں راہ نما ثابت ہونگے ۔

"غزل"

ـــــ باز تشریف ز شفقت سوئے ما آوردی ــ خوش بیاں! اے غم جاناں کہ صفا آوردی

ـــــ بہر من رنج و غم و محنت و اندوہ الم ۔ آہ عشق چہ گویم کہ چہا آوردی

ـــــ کردہ بودیم وفاہا و جفاہا دیدیم ۔ بہ تو ایں بود حق ما کہ بجا آوردی

ـــــ پیش آں خسروِ خوباں چہ بری نذر حقیر ۔ ای محبّت تو دلِ خویش کجا آوردی

محبّت غم جاناں کو خوش آمدید کہتے ہیں کیونکہ یہ انکے لیے صدق و صفا لے کر آتا ہے وہ وفا کے بدلے جفا ہی اپنا حق سمجھتے ہیں، رنج و غم، محنت و الم انکے لیے تحائف کا درجہ رکھتے ہیں ۔ اس غزل کا آخری شعر اس کے مصداق ہے ــ کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا ۔ گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں

ے[1] ہرگز دل غافلی آدم نہ شوی - واقف از جام نہ جم نہ شوی
ے غم بہ گرد تو نہ گردد ہرگز - گر رسد شادی و خرم نہ شوی
ے[2] سوخت پروانہ محبت بر شمع - در محبت تو از او کم نہ شوی

تیسرے شعر میں محبت اپنے آپ کو پروانے سے کم نہیں دیکھنا چاہتے کیونکہ ان کی نظر محبت و عشق میں کم سے کم قربانی جان دینا ہے۔

تا گفتگوئے عشق ترا گوش کردہ ایم - در یاد ہر چہ بود فراموش کردہ ایم
تا چشم بادہ نوش تو مستانہ دیدہ ایم - خود را خراب و بیخود و مدہوش کردہ ایم

ان اشعار میں بھی رنگ تغزل ابھر کر سامنے آتا ہے، محبوب کی گفتگو کانوں میں پہنچی اور پھر دیگر تمام یادیں فراموش کر دی گئیں اور محبوب کی آنکھوں کو دیکھا تو بیخود اور مدہوش ہو گئے۔

غزل:

ے گر کشش من اثرے داشتے - یار بسویم گزرے داشتے
ے آنکہ جہاں را بہ نگہ زندہ کرد - کاش بہ ما ہم نظرے داشتے
ے زیستے بے تو اگر مثل تو - مادر گیتی پسرے داشتے
ے دانہ مہر از بر دلش سر زدے - نخل امیدم ثمرے داشتے
ے گر رخت از پردہ بروں آمدی - شام محبت سحرے داشتے

اس غزل میں محبت نے اپنی محبت کو غیر بار آور ظاہر کیا ہے ورنہ یہ صورت حال نہیں ہوتی جو انکو نامرادی اور ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ محبت کی یہ غزل بھی پُر اثر ہے ے دوسرے لفظوں میں وہ اپنی کمزوری ظاہر کر رہے ہیں کیونکہ محبت میں محبوب پر الزام دھرنے کی بجائے عاشق خود اپنے سر الزام لینا گوارا کرتا ہے۔

---

[1] تین اشعار میں سے پہلے دو اشعار "العلم" کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۷۱ء سے نقل کیے گئے ہیں۔
[2] تیسرا شعر "فارسی گو شعرائے اردو" صفحہ ۱۰۳ سے ماخوذ ہے۔

"غزل"

ـــ یارب از آزار عشقم ہر نفس بیمار ساز - بر دل و جانم مسلط ہر دم این آزار ساز

ـــ ہر نفس در کام جانِ من شراب شوق ریز - بی خود از خویشتم کن و در عشق خود ہشیار ساز

ـــ بر در کس کے روم جز آستانِ در گہت - کارِ من دیگر کہ سازد چوں تو باشی کار ساز

ـــ صبح کن شامم زنورِ خویشتن چوں آفتاب - جلوہ فرمائی زخوابِ غفلتم بیدار ساز

ـــ عشق گر کفر است کافر بندہ راکن ای خدا - در محبت دیں بود یا رب مرا دیں دار ساز

محبت عشق میں ہوشیار اور اپنی ذات سے بے خبر رہنا چاہتے ہیں اور آزارِ عشق کے ذریعے مستقل بیمار رہنا چاہتے ہیں وہ اپنے محبوب کا آستانہ چھوڑ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتے کیونکہ ان کا محبوب ہی ان کا کار ساز ہے - محبت اپنے محبوب ہی سے وہ نور حاصل کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ سورج شام کو صبح میں تبدیل کر دیتا ہے اور خوابِ غفلت سے بیدار کر دیتا ہے - وہ کسی صورت میں بھی عشق و محبت سے منہ نہیں موڑنا چاہتے -

"غزل"

ـــ دل زخود رفتہ براہِ طلبت تابرخاست - باز نہ نشت دمی تا کہ ز دنیا برخاست

ـــ چوں تو برخاستی از بہر علاجم جاناں - شور افتاد بہ عالم کہ مسیحا برخاست

ـــ بس کہ گردید فزوں گرمی واشک و آہم - آب شد آتش و دود از دل دریا برخاست

ـــ یار موجود در آغوش نمی بیند کس - ای محبت زجہاں دیدۂ بینا برخاست

ردیف "برخاست" میں محبت کی یہ غزل نہایت پر اثر و پاکیزہ خیالات کی ترجمانی کر رہی ہے وہ راہِ طلب میں اس وقت تک چین اور سکون سے نہیں بیٹھتے جب تک دنیا سے اٹھ نہیں جاتے - اور جب جاناں مسیحا بن کر علاج کی خاطر اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو پورے عالم میں یہ شور برپا ہو جاتا ہے کہ ایک مسیحا اٹھ کھڑا ہوا ہے - آخری شعر میں ان کا یہ کہنا کہ دنیا سے دیدۂ بینا اٹھ گی کیونکہ محبوب کو کوئی اپنی آغوش میں نہیں دیکھتا معنی آفرینی کی اچھی مثالیں محبت کی محولہ بالا غزل میں موجود ہیں -

- قاصد از شہد و شکر بہ سخن می گوید ۔ زاں کہ حرف از لب شیریں دہنی می گوید
- دلم از سینۂ پر داغ حدیثی دارد ۔ بلبلی حرف بہار چمنی می گوید
- گل نشاں آمدہ ہر وقت محبت بکلام ۔ زاں کہ ہر دم سخن گل بدنی می گوید

- خون جگر کند لب لعل تو لالہ را ۔ سازد اسیر چشم غزالت غزالہ را
- در یاد شام زلف تو و صبح روئے تو ۔ تا کی ز دل کشم شب و روز آہ و نالہ را

- رفتی ز دیدہ لیک نمائی بہ چشم من ۔ از بسکہ نقش روئے تو ام از نظر نہ رفت
- تا کہ در بر دل نگارم صحت ۔ یادگار تو در کنارم صحت

- عاشق زارم مرا از درد پیدا کردہ اند ۔ ایں گواہم بس کہ رنگ زرد پیدا کردہ اند

- ہرچہ درکار است حاضر جان من ۔ جان من حاضر اگر درکار تست
- از تپ خورشید محشر نار نم ۔ بر سر من سایۂ دیوار تست
- تو محبت طوطیٔ خوش لہجہ ۔ خلق شیریں کام از گفتار تست

- چشمت بہ ابرو و مژہ ملک جاں گرفت ۔ کشور بہ تیغ نازبلی می تواں گرفت
دنیا و آخرت ہمہ خال و خط گرفت ۔ آں ایں جہاں گرفت و ایں آں جہاں گرفت

سوخت پروانہ محبت بر شمع ۔ در محبت تو از و کم نہ شوی

محبت نواب محبت خاں (۱۲۲۷ھ)

عبدالرؤف عروج "فارسی گو شعرای اردو"[1] کا تذکرے کے ریفرنس" ص - ۱۰۳ - ۱۰۰

نواب محبت خاں محبت خلف نواب حافظ الملک رحمت خاں بہادر است کہ مالک بریلی بودند. تولد ایشاں در آں ملک رو نمود (سفینۂ ھندی ۱۹۱) سال ولادتش ۱۱۶۵ھ است (حیات حافظ رحمت خاں - ۱۳۱) بعد تحصیل علوم بہ گفتن شعر ھندی زبان کشادند (سفینۂ ھندی ۹۹۱)[2] بعد شہادتِ پدر بہ ہمراہ خاندانِ خود در قلعہ الہ آباد مقید گشتہ بود بعد ازاں در ۱۱۸۸ھ بہ حسینی آصف الدولہ معہ خاندانش در لکھنؤ آمدہ مقیم شد - (حیات حافظ رحمت خاں - ۲۱۳) اصلاح اشعار ہندی از جعفر علی خاں حسرت می گرفتند آخر بہ گفتن اشعار فارسی سیر کردہ، شاگرد مرزا فاخر مکیں شدند - چند روز مجلس مشاعرہ در خانۂ خود ترتیب دادند (سفینۂ ھندی ۱۹۱) میاں جرأت در سرکار او ملازم بودند (دیوان جرأت) بہ تحریک فرنگی پسری قصہ سسی پنوں بہ زبان ہندی نظم نمود (مجموعۂ نغز - ۱۶۰) بسیار خلیق پسندیدہ مزاج، عالی منش و شیریں گفتار اند - با مؤلف ربط دوستی دارند (مجمع الانتخاب - ۱۴۱) اشعار بہ سمع فقیر نہ رسیدہ مگر غزلے کہ تازہ مرثیہ نما کہ در بیان مفارقت اقربا و آوارگیٔ وطن و مہاجرت خویشاں و حالت پُر ملالت خود مشتمل بر غم و الم و اندوہ و بلا کہ بر تش کم از واقعہ کربلا نبود وقتی کہ پدرش حافظ رحمت خاں و افواج فرنگ اتفاق جنگ افتادہ خان موصوف از زخم گولۂ بارود مورد رحمتِ الٰہی شدہ و شہید اکبر گشتہ و مردانہ وار جان دادہ موزون نمودہ - (طبقات الشعراء - ۱۵۳) نواب محبت خاں محبت بہ قدر قلیل کہ شایان ملازمانش نباشد از دست سران فرنگ یافتہ بسر می کنند (مجموعۂ نغز - ۱۶۰) و بتاریخ ۱۳ صفر ۱۲۲۷ھ بہ مقام لکھنؤ وفات یافت و ہماں مدفون گشت[3] (حیات حافظ رحمت خاں - ۲۱۳) مثنوی سسی پنوں، آمد نامہ در قواعد زبان فارسی، لغاتِ عربی و فارسی

---

[3] لغاتِ عربی و فارسی نہیں بلکہ یہ یعنی "ریاض المحبت" پشتو فارسی لغت ہے -

[2] غلطی سے ۱۹۱ کے بجائے ۹۹۱ کتابت ہو گیا ہے -

[1] عبدالروف عروج: "فارسی گو شعرائے اردو"، المجمن پریس کراچی، ۱۹۷۱ ص ۱۰۳-۱۰۰

دیوانِ ریختہ و فارسی از او یادگار است ۔ نسخہ ھائی آن ھا در کتاب خانہ ھائی رام پور، انجمن ترقی اردو کراچی و برٹش میوزیم موجود اند، نمونہ کلامش این است:۔

۔ دستِ شوقم گر چنیں سوئی گریباں می رود ۔ چاک ھردم از گریباں تا بہ داماں می رود
۔ پیچ و تابم از جنوں گر نیست خاکِ من چرا ۔ گرد بادی می شود سوئی بیاباں می رود

۔ عاشقِ زارم مرا از درد پیدا کردہ اند ۔ این گواہم بس کہ رنگِ زرد پیدا کردہ اند

۔ باز تشریف ز شفقت سوئی ما آوردی ۔ جوش بہار! اے غم جاناں کہ صفا آوردی
۔ بہر من رنج و غم و محنت و اندوہ و الم ۔ آہ ای عشق چہ گویم کہ چھا ۔۔۔ آوردی
۔ کردہ بودیم وفاھا و جفاھا دیدیم ۔ بہ تو این بود حق ما کہ بجا ۔۔۔ آوردی
۔ پیشِ آن خسرو خوباں چہ بری نذر حقیر ۔ ای محبت تو دل خویش کجا آوردی

۔ یارب از آزار عشقم ھر نفس بیمار ساز ۔ بر دل و جانم مسلط ھر دم این آزار ساز
۔ ھر نفس در کام جان من شرابِ شوق ریز ۔ بی خود از خویشم کن و در عشق خود ھشیار ساز
۔ بر در کس کہ روم جز آستان درگہت ۔ کار من دیگر کہ سازد چوں تو باشی کارساز
۔ صبح کن شامم ز نور خویشتن چوں آفتاب ۔ جلوہ فرمائی ز خواب غفلتم بیدار ساز
۔ عشق گر کفر است کافر بندہ را کن ای خدا ۔ در محبت دین بود یارب مرا دیں دار ساز

۔ بہ صحرائی محبت از تو در دیوانگی افزوں ۔ کہ می دانند ای مجنوں محبت خاں شود پیدا

سوخت پروانہ محبت بر شمع - در محبت تو از وی کم نہ شوی

هر چه در کار است حاضر جان من - جان من حاضر اگر در کار تست
از تپ خورشید محشر نایدم غم - بر سر من سایه دیوار تست
تو محبت طوطی خوش لهجه - خلق شیرین کام از گفتار تست
چشمت به آبرو و مژه ملک جان گرفت - کشور به تیغ ناز بلی می توان گرفت
دنیا و آخرت همه خال و خطت گرفت - آن این جهان گرفت و این آن گرفت

اهل خرابه را به تماشا چه احتیاج - ویران دل چو هست به صحرا چه احتیاج
نفع و ضرر نه ماند به بازار او مرا - سودم زیان شده است به سودا چه احتیاج
عذرم دارد آن یوسف که گوید - کسی شاید که خوابی دیده باشد
چشم ای ماه شب و روز به گریان است - خلق گویند که ام سال عجب باران است
در محبت تو مرا آه نه دانی صادق - باوجودی که مرا نام محبت خان است

دل ز خود رفته براه طلبت تا برخاست - باز نه نشست دمی تا که ز دنیا برخاست
چون تو برخاستی از بهر علاج جانان - شور افتاد به عالم که مسیحا برخاست
بس که گردید فزون گرمی و اشک و آهم - آب شد آتش و دود از دل دریا برخاست
یار موجود در آغوش نمی بیند کس - ای محبت ز جهان دیدهٔ بینا برخاست

ز بس گذشت محبت ز هر که پرسیدم - به عارض اشک پیاپی چکید و هیچ نگفت

- رفتی ز دیده لیک نمائی به چشم من - از بس که نقش روئی توام از نظر نه رفت

- تا که در بر دل فگارم هست - یادگار تو در کنارم هست

- تا گفتگوئی عشق ترا گوش کرده ایم - در یاد هرچه بود، فراموش کرده ایم

- رویم ببین شگفته که در عین خرمی - چون گل هزار چاک شود پیرهن مرا
- صیاد گر ز باغ جدا گشته ام چه غم - از خون خود قفس شده رشک چمن مرا

- قاصد از شهد و شکر به سخنی می گوید - زان که حرف از لب شیرین دهنی می گوید
- دلم از سینهٔ پر داغ حدیثی دارد - بلبلی حرف بهار چمنی می گوید
- گل فشان آمده هر وقت صحبت بکلام - زان که هر دم سخن گل بدنی می گوید

- خون جگر کند لب لعل تو لاله را - سازد اسیر چشم غزالت غزاله را
- در یاد شام زلف تو و صبح روئی تو - تا کی ز دل کشم شب و روز آه و ناله را

- گر کشش من اثری داشتی - یار به سویم گذری داشتی
- آن که جهان را به نگه زنده کرد - کاش به ماهم نظری داشتی
- دانهٔ مهر از به دلش سر زدی - نخل امیدم ثمری داشتی
- گر رخت از پرده برون آمدی - شام محبت سحری داشتی

مثنوی کا تعارف

عبدالقادر سروری کے مطابق " ہماری شاعری میں سب سے اہم صنف مثنوی کی ہے کیونکہ اس میں
ایک وسیع مضمون اور مربوط خیالات کے نشو ونما کی گنجائش ہے۔ شعر کی کوئی بھی صنف ہو بذات خود نہ اہم
نہیں سمجھی جا سکتی اچھائی اور برائی صناعی میں ہو سکتی ہے ایک باکمال شاعر پیش پا افتادہ اصناف کو
بھی اپنی وجدانی قابلیت کی دستیاری سے بلندیوں کی انتہا تک پہنچ سکتا ہے"۔

اب ذرا اردو مثنوی پر نظر ڈالیے جو بظاہر تو دیگر زبان کی مثنویاں کی طرح
ایک گھڑا ہوا خیالی سلسلہ بھی ہو سکتا ہے اور بعض اوقات فوق الفطرت یا خلاف قیاس افسانہ بھی
ہو سکتا ہے لیکن واقعات کو جوڑنے اور مربوط کرنے میں زندگی کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔
یہ جزئیاتی پہلو زندگی کے حسن و قبح کو ظاہر کرتے ہیں ان میں ڈرامائی کیفیات بھی ہوتی ہیں اور
مرقع نگاری بھی۔ مثنوی میں کسی مکمل واقعے کو بیان کیا جاتا ہے یہ ایک تصویر کا صرف خاکہ نہیں
ہوتا بلکہ ایک مکمل تصویر ہوتی ہے جس میں پورا منظر اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں منظر کی تمام جزئیات
بھی پیش کر دی جاتی ہیں۔ دراصل شاعر کی یہ نفسیات ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس میں تاخیر کو
برداشت نہیں کرتا بلکہ اپنے ذہن میں آنے والے تمام واقعات کو اپنے مربوط خیالات کے ذریعے
جلد از جلد مربوط انداز میں پیش کر دینا چاہتا ہے۔

اردو مثنوی میں جو طول طویل بیانات موجود ہیں ایسے ہی طول طویل بیانات
فارسی اور عربی مثنوی میں بھی موجود ہیں کیونکہ کسی قصہ کو بیان کرتے وقت شاعر اپنی فکر کی جولانی اسی وقت ہی دکھا
سکتا ہے جبکہ اسکے پاس وقت بھی ہو اور ساتھ ہی خوشحالی اور فارغ البالی کا بھی دور دورہ ہو۔

لکھنؤ میں آصف الدولہ کا دور دورہ اور انکے جانشینوں کا زمانہ اردو شعراء کے
عروج کا زمانہ تھا۔ آصف الدولہ جیسے لکھنؤ کے نواب اور جانشینوں کے دور میں چند طویل مثنویاں موجود ہیں۔
اور اس دور کو یاد دلانے کا سبب بن گئیں۔

دکن کے سیاسی اور ادبی عروج کا زمانہ جس میں خاص طور پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی خودمختیار سلطنتوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے یہاں کے حکمراں علم و فضل ادب شعر و فنون لطیفہ کی نہ صرف سرپرستی کرتے تھے ۔ بلکہ خود بھی ادب، شعر اور فنونِ لطیفہ کا بلند پایہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ غزل اور رباعی منفرد اور منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے اور ان سے شعری ذوق کی تکمیل بھی نہیں ہوتی لیکن مثنوی ایک طویل، مربوط اور مکمل شعری کارنامے کی تکمیل ہو سکتی ہے ۔ مثنوی دراصل محنت، فکر، ربطِ خیال تناسب ترتیب اور تعمیر کی ایک مکمل عمارت کا نام ہے مثنوی میں خیالات اور واقعات کی تکرار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ غزل میں تکرار اور تقلید کی گنجائش ہوتی ہے لیکن مثنوی میں تکرار ناممکن ہے۔ اور تقلید محدود ۔ اس لیئے وہ اردو مثنویاں بھی جو فارسی کا ترجمہ یا اقتباس ہیں فارسی مثنوی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں، اردو جامہ پہننے کے بعد ایک نئی چیز بن گئی ہیں ۔[۹]

مثنوی کی ایک خاص خوبی حقائق نگاری ہے گو ان مثنویوں میں مافوق الفطرت باتیں بھی شامل رہی ہیں اسکے باوجود مشاہدۂ فطرت و واقعات کو علیحدہ کیا جاسکتا ہے ۔ رزمیہ، بزمیہ مناظر اخلاقی اور فلسفیانہ انداز مثنویوں میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ عشقیہ قصے اور دشوار مہمات کی داستانیں اردو اور دیگر عام مثنویوں کے عام اور مقبول موضوعات رہے ہیں۔ عشق و محبت کی داستانیں اور مہمات کے واقعات بھی کوئی نہ کوئی مقصد لیے ہوئے ہوتے ہیں اگر ہم یہی تصور کر لیں کہ ان واقعات سے مسرت افزا پہلو اجاگر ہوتا ہے اور حیرت و تعجب کی کیفیات انسانی اذہان میں انہیں پڑھ کر پیدا ہوتی ہیں تو بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب کے دیگر مقاصد کے ساتھ یہ بھی ایک اہم مقصد ہے ۔

جہاں شعر و شاعری کے ذریعے شعری و ادبی لطافتوں کو استعمال کیا جاتا ہے وہاں افعال کا ارتقاء ترتیب اور ربط شاعر کی ذہنی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ بیان کی توضیح و تشریح کے علاوہ موقع محل اور

---

۹ عبدالقادر سروری: "اردو مثنوی کا ارتقاء" حیدر آباد دکن ۱۹۴۰

نفسی کیفیات کی توضیحات کے ذریعے شاعر کی قوتِ متخیلہ کو پوری طرح جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے ۔

دورانِ مثنوی ڈرامائی تشکیل اور مواقع پیدا کرنے شاعر کی توجہ چاہتے ہیں مکالمات کے ذریعے روز مرہ محاورہ زبان و بیان کی دلنوازی پیدا کی جا سکتی ہے جہاں تک مثنویوں کا تعلق ہے تو اسکی فہرست بہت طویل ہے ۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ " خواب و خیال " سے لے کر سحر البیان اور گلزار نسیم تک بیشتر مثنویاں ہمارے سامنے ہیں لیکن ایک مثنوی کا ذکر تفصیل سے نہیں ملتا وہ " اسرار محبت " ہے جس پر ہم تفصیل سے بحث کرینگے ۔ یہ مثنوی بھی اپنے زمانے کے لحاظ سے کسی قابلِ قدر کارنامے سے کم نہیں اور یہ مثنوی سحر البیان سے دو سال قبل تحریر کی گئی تھی ۔ یہ مثنوی آرٹ اور فنی نقطۂ نگاہ سے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کا پلاٹ سسی پنہوں کی کہانی پر کیا گیا تھا اور یہ قصہ سندھ اور بلوچستان سے تعلق رکھتا تھا جس کی تفصیلات محبت خاں محبت نے اپنے کرم فرما مسٹر جانسن کی فرمائش پر تحریر کی ۔

—— x ——

مثنوی اسرار محبت

مثنوی اسرار محبت بحر ہزج مسدس محذوف یا مقصور میں تحریر کی گئی ہے۔

مفاعیلن مفاعیلن فعولن
مفاعیل

ابتداء میں یہ بحر بھی عشق و عاشقی کی باتوں کے لیے مخصوص کی گئی تھی مگر اس میں بھی مثنوی کے مضامین ملتے رہے۔ فارسی میں ۵۳۵ھ/۱۱۴۰ء سے ۶۰۰ھ/۱۲۰۴ء کی "خسرو شیریں" کا یہی وزن ہے۔[1]

نسب را در جہاں پیوندی خواست — بفرمان از خدا فرزندی خواست
چو عمر آمد بحد چاردہ سال — بر آمد مرغ دانش را پر و بال

جامی ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء سے ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء نے "یوسف زلیخا" کے لیے بھی اسی وزن کا انتخاب کیا تھا اور غنیمت لاہوری کی مثنوی "نیرنگ عشق" کی بحر بھی یہی ہے۔

اردو میں سید فرزند عشرتی کی ۱۱۴۴ھ کی عشقیہ مثنوی "نیر درپن" اسی وزن میں ہے۔

۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء میں عاصی نے مثنوی "تلقین الہدیٰ" بھی اسی وزن میں لکھی ہے۔

عرب و عجم میں ہے بندہ عاصی — شفاعت موں کرو میری خلاصی

گوہر کی ایک مثنوی "مثنوی گوہر" بھی اسی وزن میں ہے جس میں حضرت ابو تمیم انصاری کا قصہ بیان کیا گیا ہے

لکھیا قصہ پکڑ میں ہاتھ خامہ — رکھیا ہوں نام میں انصار نامہ
طبیعت کو بنا چالاک گوہر — رکھیا امید حق سے عبد اصغر[2]

---

[1] ڈاکٹر خان رشید اردو کی تین مثنویاں "طبع دوم کراچی اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰/۱۳۹۰، ص ۱۹

[2] اسی واقعہ سے متعلق صنعتی کی مثنوی "بے نظیر" ہے جس کا دوسرا شعر بھی اسی طرح ہے
طبیعت کو بنا چالاک گوہر — رکھیا امید حق سے عبد اصغر

دکن کے ایک اور شاعر عارف الدین عاجز ۱۱۷۸ھ / ۱۷۶۴ء کی مثنوی "لال و گوہر" کا یہی وزن ہے

سخن کا لال دے میری زباں کو — درِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

شمالی ہند میں اسی بحر میں سودا ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء نے ایک عشقیہ مثنوی لکھی

چراغِ داغِ دل چھٹ روشنی اور — نہ ہو پستی بلندی جس سے ہو غور
نہ تھا وہ یوسفِ ثانی کچھ آگاہ — کہ میرے سامنے خندق ہے یا چاہ
کسی در پر گرے تھا کھا کے ٹھوکر — کسی دیوار سے جا لاگتا سر

اسی بحر میں ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی مثنوی کلیلہ و دمنہ " کا منظوم ترجمہ ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں میر فریدالدین آفاق نے مثنوی "دانش افروز" کے نام سے کیا۔

نواب محبت خان محبت کے شاگرد میر ضیاالدین عبرت اور میر غلام علی عشرت شاگرد مرزا علی لطف کی "پدماوت"، مقابریلی کی مثنوی حیدری، اسمٰعیل حسین منیر کی مثنوی معراج المعارفین اور خوشتر کی رامائن اور متعدد مثنویاں اسی بحر میں ملتی ہیں اور یہ تمام کی تمام مثنویاں عاشقانہ نہیں بلکہ اخلاقی صوفیانہ اور رزمیہ ہر موضوع پر ہیں۔

"سسی پنوں" کی داستان کو نواب محبت خاں نے مثنوی "اسرارِ محبت" کے نام سے قلمبند کیا لکھنؤ کے ریذیڈنٹ مسٹر جانسن کی فرمائش پر یہ مثنوی اردو میں ۱۱۹۶ھ میں تحریر کی گئی یاد رہے کہ میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اس مثنوی کے دو سال بعد نظم کی گئی۔ جس زمانے میں یہ مثنوی تحریر کی گئی وہ دور مثنوی کا دور نہیں تھا اور بعد کے آنے والے ناقدین نے بھی "اسرارِ محبت" پر بھرپور بحث نہیں کی بلکہ آج سے ۶۰ برس پہلے تو چند تذکروں میں[1] ذکر ملتا تھا لیکن انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کے مؤقر سہ ماہی "اردو" میں افسانہ سسی پنوں پر محققانہ مقالے شائع ہوئے ان مقالوں میں

---

[1] ڈاکٹر خان رشید: "اردو کی تین مثنویاں"، طبع دوم، کراچی، اردو اکیڈمی ۔ ص ۲۱

جناب نور الٰہی اور محمد عمر صاحب کے مقالے قابلِ ذکر ہیں جناب قاضی فضل حق صاحب ایم۔اے
پی۔ای سی پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے ایک مقالہ محولہ بالا رسالہ کی اکتوبر ۱۹۳۴ء کی اشاعت
میں تحریر کیا یہ مضمون سب سے زیادہ محققانہ اور فاضلانہ انداز سے ضبطِ تحریر کیا گیا تھا اور تاریخی
وادبی معلومات سے پُر تھا[1] لیکن اس مقالہ میں بھی محبت خان کی مثنوی اسرارِ محبت کا ذکر نہیں تھا
البتہ ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں مثنوی اسرارِ محبت کے عنوان سے جناب سید مسعود حسین رضوی
پروفیسر اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے تحریر کیا تھا۔
پروفیسر مجنوں گورکھپوری "تنقیدی حاشیے" میں رقمطراز ہیں:
"عنوان دیکھ کر مجھے تسکین ہو گئی کہ جو کام میں کرنے والا تھا وہ ہو چکا لیکن جب
مضمون کو پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ رضوی صاحب صرف قیاس سے کہتے ہیں کہ یہ مثنوی
نواب محبت خان محبت کی ہے"[2]
دراصل یہ مثنوی یقیناً نواب محبت خان کی ہی ہے، منشی عبدالکریم، مرزا لطف اور گارسن دتاسی،
مولانا عبدالحکیم عبدالحئی نے اپنے تذکروں میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔
حسرت موہانی نے "مجموعہ" کے نام سے تین مثنویوں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ جس میں پہلی
مثنوی "سراپا سوز" ہے دوسری مثنوی یہی اسرارِ محبت اور تیسری مثنوی آغا علی شمس
لکھنوی کی تحریر کردہ ہے جس کا نام طلعت الشمس[3] ہے۔
میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے تحفۃ الکرام[4] میں سسی پنوں کی داستان نثر میں تحریر
کی ہے انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا ہے کہ میر معصوم بکھری نے اس قصہ کو مثنوی

---

[1] پروفیسر مجنوں گورکھپوری: "تنقیدی حاشیے" مثنوی اسرارِ محبت، ص ۲۰۶
[2] مصنفہ ملک الشعراء قاضی محمد صادق خان اختر
[3] پروفیسر مجنوں گورکھپوری: "تنقیدی حاشیے"، مثنوی اسرارِ محبت، ص ۲۰۸
[4] میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے میاں غلام شاہ کلہوڑا کے عہدِ حکومت میں ۱۱۸۰ھ میں تحفۃ الکرام کی تصنیف کا آغاز کیا اور ۱۱۸۱ھ میں یہ کتاب مکمل کر لی تھی لیکن اس میں اضافہ و ترمیم کا کام مصنف کی سنِ وفات ۱۲۰۳ھ تک جاری رہا

"حسن وناز" میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ قاضی مرتضیٰ سورٹھی ساکن موضع کتیانہ" نے محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں اسے خاص طرز میں نظم کیا تھا[1] چوہدری شہباز کی کتاب "وقائع پنوں" کا ایک قلمی نسخہ قاضی فضل حق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس کے زیر مطالعہ رہا۔ شہباز موضع بدوملہی ضلع سیالکوٹ پنجاب کا رہنے والا مسلمان جاٹ تھا۔ اس نے یہ کتاب ۱۲۵۱ء میں مکمل کی[2]

سہ چوں در غم یار نزار بدم خونخوار و دل فگار و حیران
تاریخ گزار (کذا) ایں نظم شدم غم یار بفہم اسرار نہاں ۔ غم یار کے ۱۲۵۱ اعداد ہوتے ہیں۔

قاضی فضل حق کا یہ کہنا بھی درست معلوم ہوتا ہے وقائع پنوں میں پنوں کے بے ہوش ہوجانے کے بعد کا حال کسی دوسرے شخص کے قلم کا مرہون منت ہے۔ صاحبان مضامین اس کا نام منشی محمد حسین بتاتے ہیں۔ شہباز اس کا نام صرف حسین لکھتا ہے اور اس کو "ولی" سے مخاطب کرتا ہے محولہ مضمون کی عبارت سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ شہباز نے پنوں کے بے ہوش ہوجانے تک کا حال لکھا ہے، اور بعد ازاں منشی محمد حسین نے اسے مکمل کیا ہے[3] حالانکہ شہباز کا بیان ہے کہ "حسین ولی" نے اس سے قبل قصہ سسی پنوں کا آخری حصہ لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ فکر کی ندرت کی وجہ سے اس کے اکثر اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ شہباز نے اپنے ایک دوست "بہیرالدین" متوطن شہر جلال آباد کی فرمائش پر قصہ کا ابتدائی حصہ اسی فکر اور روش پر لکھ کر کتاب کو مکمل کیا۔ فارسی زبان میں یہ قصہ متعدد بار لکھا گیا میر معصوم شاہ بکھری اور قاضی مرتضیٰ سورتی نے نظم کیا۔ ان سے قبل سید علی نے جو ٹھٹھہ سندھ کے صاحب تقدس بزرگ تھے ۱۰۵۲ء میں

---

[1] قاضی مرتضیٰ سورتی کی مثنوی کا نام "شہید ناز" تھا۔

[2] قاضی فضل حق: "سسی پنوں" رہنمائے تعلیم، لاہور، ۱۹۳۱ء ص ۶۵۴

[3] شہباز کی عمر اس وقت چالیس سال کی تھی اور اس کی پیدائش کا سال ۱۲۱۱ ہوتا ہے۔

اس کہانی کا سندھی زبان سے فارسی نثر میں ترجمہ کیا[1] اس کے بعد رضائی نامی ایک شاعر نے زیبا و نگار کے نام سے ایک مثنوی سسی پنوں کے موضوع پر لکھی[2] اس کی تاریخ تصنیف اسی شعر سے ظاہر ہوتی ہے جو ۱۰۵۳ھ ہے ؎ گل اندر باغ خواندم از حسابش

کہ ہم تاریخ باشد ہم خطابش

فارسی قلمی نسخوں میں سرگزشت "سسی پنوں" کا ذکر ملتا ہے ایک فارسی نسخہ کے مصنف نے آخر میں اس کا نام نگارین نامہ عشق یا گلستانِ رنگین بتایا ہے ۔

؎ بحمد اللہ کہ نوک خامۂ عشق ۔ رقم زد ایں نگارین نامۂ عشق

در ایام مبارک ماہ رمضان (دکترا) ۔ بہار آورد ایں رنگیں گلستاں

مثنوی میں مصنف نے اپنا نام اندرجیت اور تخلص منشی بتایا ہے یہ پنجاب کے شہر نکودر کا رہنے والا تھا وہ اپنے وطن سے لاہور آیا تھا اور یہاں کسی بزرگ کی خدمت میں انیس[19] سال رہا اس بزرگ کا نام نہیں ملتا[3] کچھ عرصہ بعد سید شہامت خاں کی خدمت میں پہنچا اور اس کتاب کی تصنیف کے وقت وہ نواب عبد الصمد خاں لاہوری کا منشی تھا ، ۱۱۴۱ھ میں وہ نواب مذکور کی معیت میں ملتان گیا وہاں اس نے یہ داستان سنی اور اسی وقت اس کو منظوم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ کتاب محمد شاہ بادشاہ کے دسویں سال جلوس میں ماہِ رمضان میں ختم ہوئی ۔

جہاں تک پنجاب میں سسی پنوں کے قصے کا تعلق ہے تو اس کے بادا آدم حافظ برخوردار

---

[1] قاضی فضل حق : "سسی پنوں" ، رہنمائے تعلیم ، جوبلی نمبر ۱۹۳۱ ، ص ۶۵۸

[2] زیبا و نگار کا ماخذ سید علی کی مثنوی تھی جو سندھی زبان سے فارسی نثر میں ترجمہ کی گئی تھی ۔ رضائی نام کے شاعر ایرانی تھے ۔ چونکہ سسی و پنوں کے اجنبی نام ایرانی کانوں کے لیے نامانوس تھے لہٰذا "زیبا و نگار" اس کا نام رکھا یہ کتاب ۱۰۵۳ھ میں تحریر ہوئی

[3] ان بزرگ کو شمع عالم اور دوسرے نسخے میں شیخ عالم کے لقب سے ملقب کرتا ہے ۔

کہلاتے ہیں پنجابی میں سب سے پہلے حافظ رانجھا برخوردار نے ۱۱۷۶ھ میں اس قصہ کو کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ ۱۱۷۲ھ میں اس قصہ کو سندر داس آرام نے پنجابی زبان کی پانچ مختلف بحروں میں تحریر کیا تھا اس کے خاتمہ پر لکھتا ہے۔

> ختم ہویا ریشق پاک جو آکھ سنایا ۔ گل ختی آرام ایس قصے تے پایا
>
> سچ کلام کر پنج کرتا رتخ ملائی ۔ سسی پنوں نے جوش عشق بنجر وہائی

مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ کپور تھلہ کی لائبریری میں موجود ہے[1] ہاشم کی سسی پنوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہاشم رنجیت سنگھ کے معاصر تھے اور رنجیت سنگھ اکثر ہاشم کو بلوا کر ان کی زبانی سسی پنوں کے اشعار سنا کرتے تھے۔

سسی پنوں کی داستان کے سلسلے میں ایک نام حافظ برخوردار کا ہے ان کا نام رانجھا اور تخلص برخوردار تھا حافظ قرآن تھے حافظ تخلص کرتے تھے وطن مالوف ہزارہ تھا۔ جوانی میں وہاں سے نکلے اور تعلیم لاہور میں حاصل کرتے رہے[2]۔

بلوچی زبان میں اس قصہ کا تذکرہ تاریخ بلوچستان میں رائے بہادر ہتھو رام نے کیا ہے اور ہر شعر کے نیچے اس کا تحت اللفظ اور اردو ترجمہ دیا ہے ان کا قول ہے کہ یہ قصہ بلوچستان کے شعراء نے بلوچی زبان میں بطور نظم پیش کیا ہے اور بڑے شوق سے لوگ اب بھی اسے گاتے ہیں اس داستان کا انگریزی ترجمہ لیفٹننٹ برٹن اور مسٹر لوسٹن نے کیا تھا[3] مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی اسے لکھا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سسی پنوں کی داستان کا تعلق کس دور سے ہے اور ان کے بارے میں کن اصحاب نے غور کیا ہے اور خاص طور پر

---

[1] قاضی فضل حق: "سسی پنوں" ، لاہور، رہنمائے تعلیم" جوبلی نمبر ۱۹۳۱ - ص ۶۵۷

[2] قاضی فضل حق کی تحقیق کے مطابق ان کا نام برخوردار تھا اور ذات کے رانجھا جاٹ تھے۔ ان کا وطن مالوف موضع سلمانی تھا جو تحت ہزارہ سے مشرق کی طرف واقع ہے ابتدائی تعلیم ہزارہ پھر موضع جہان آباد اور پھر سیالکوٹ میں حاصل کی۔

سندھ میں اس کہانی کو کس تحریر کے ذریعے معتبر سمجھا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پنجاب میں تو سنی سنائی باتوں میں قصہ کا محل تعمیر کیا گیا ہوگا۔

"تحفۃ الکرام"[1] کے مصنف میر علی شیر قانع جو سندھ کے ایک مستند تاریخ داں اور عالم گزرے ہیں انہوں نے اپنی اس کتاب میں سسّی پنوں کے قصے کو نثر میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اکثر تاریخ دانوں نے ان کی اس کتاب سے کسب فیض کیا ہے۔ سسی پنوں کی جو داستان انہوں نے تحریر کی ہے اس سے بھی آئندہ لکھنے والوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ لہٰذا ہم سندھ کی اس داستان کو ایک مستند اور مقامی مصنف کے ذریعے بعینہٖ پیش کرتے ہیں تاکہ سسی پنوں کی داستان کے دیگر لکھنے والوں میں فرق واضح ہو سکے۔

"دلورائے کی حکومت میں[2] "تانیہ" نامی ایک برہمن اپنی بیوی "سندھر" کے ساتھ سکھ آرام کے ساتھ "بھانبھرواہ[3]" (برہمناباد) میں رہا کرتا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی مدت سے اولاد کی خواہش رکھتے تھے۔ خدا کی قدرت سے ان کے یہاں ایک ایسی خوبصورت بیٹی پیدا ہوئی کہ چاند بھی اس کے حسن پر رشک کیا کرتا تھا۔ اتفاقاً اس کا طالع قسمت دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک مسلمان کی بیوی بنے گی چنانچہ مذہب کے عار سے انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر اس دُرِ بے بہا کو ایک صندوق کے صدف میں بند کرکے دریا کی پرشور موجوں میں بہا دیا۔ اتفاق سے دریا کا بہاؤ اس صندوق کو شہر بھنبھور کی طرف لے آیا۔ اس شہر میں "منھیہ"[4] اور بعضوں کے کہنے کے مطابق

---

[1] میر علی شیر قانع ٹھٹوی: "تحفۃ الکرام"، مترجم اختر رضوی، تصحیح و حواشی، مخدوم امیر احمد و ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، اشاعت اوّل، کراچی، سندھی ادبی بورڈ - ۱۹۵۹۔

[2] قیاس کیا جاتا ہے کہ دلورائے کی حکومت پانچویں صدی ہجری مطابق ۱۱ صدی عیسوی میں سندھ میں قائم تھی۔

[3] شیخ ایاز: رسالو شاہ عبداللطیف، اردو ترجمہ میں "منذر" لکھا ہے۔

[4] [illegible]

"ڈلّر" نامی ایک دھوبی رہتا تھا جس کے پانچ سو شاگرد تھے لیکن اولاد کوئی نہیں تھی جب یہ
صندوق بہتا ہوا اس کے شاگردوں کے سامنے سے گزرا تو وہ اسے پکڑ کر استاد کے پاس لے
گئے۔ اس نے صندوق کھولا تو دیکھا کہ جیسے برج قدرت پر ماہتاب طلوع ہو گیا ہے چنانچہ
اس کا نام سسّی[1] (چاند) رکھ کر اسے اپنی اولاد قرار دیا۔ جب خیر سے وہ جوان ہوئی تو ہر
گبرو کے دل میں اس کی محبت کا نشتر چبھنے لگا اور جس کی بھی نظر اس پر پڑتی وہ اس کا
خریدار ہو جاتا اکثر لوگ اس کے عشق میں اپنا دل گنوا بیٹھے اور وہ جہاں بھی جاتی عشاق
اس کے گرد حلقہ بنا لیتے اور اس کے شوق میں پروانہ کی طرح اس کے چاروں طرف منڈلاتے
رہتے۔ اس زمانے میں کیچ اور مکران کے قافلے تجارت کے لیے اس طرف آیا کرتے تھے
انہوں نے یہ خبر کیچ کے حاکم کے بیٹے پنھوں[2] کو پہنچائی وہ اس کے حسن کی تعریف سن کر دل
کھو بیٹھا اور قافلے والوں کا بھیس بدل کر بھنبھور آیا[3] یہاں سسّی کو دیکھتے ہی اس
کا دل بے قابو ہو گیا لیکن قسمت اچھی تھی اس لیے طالب کو بھی اپنے مطلوب کے دل میں جگہ مل
گئی امیدِ وصال میں اس نے اس کے باپ کی شاگردی اختیار کر کے دھوبی کا بھیس بدل
لیا

) قصہ کوتاہ سسی بھی پنوں پہ بے حد فریفتہ ہو گئی لیکن جیسا کہ دستور ہے،
ایک سنارن[4] اپنے مطلب کی خاطر ان دونوں طالب و مطلوب میں جدائی ڈالنے
کی فکر میں مبتلا ہو گئی اس نے پنھوں کو غیرت دلا کر اسے سسی سے برگشتہ کر دیا اس طرف

---

[1] شاہ کریم، حسین شاہ عنایت، شاہ عبداللطیف، خلیفہ نبی بخش اور دیگر شعراء نے یہ نام "سسئی" لکھا ہے کیونکہ "سسی" سندھی میں بھیڑ کو کہتے ہیں۔

[2] کیچ کے حاکم یعنی پنوں کے باپ کا نام آری جام تھا۔

[3] شیخ ایاز کے مطابق پنوں کے ساتھ اس کا ایک بھائی ضیرو بھی آیا تھا جو پنوں کی شادی کے بعد واپس چلا گیا۔

[4] بھنبھور شہر میں سعجان نام کی ایک سنارن تھی جو سسی کی سہیلی تھی۔ وہ اس کی رقیب بن گئی۔

سسی نے جو عشق میں صادق تھی خود کو بھڑکتی ہوئی آگ میں سے خالص سونے کی طرح پاک و صاف نکال کر اپنی صداقت ثابت کر دی جس پر سب کو عبرت ہوئی کچھ عرصہ کے بعد طالب کی مطلوب کے ساتھ شادی ہو گئی اس طرح پنوں کے باپ نے اس حال سے واقف ہو کر اپنے دوسرے بیٹوں کو حکم دیا کہ کسی بھی طرح اس دل گم کردہ کو لے آؤ۔ انہوں نے آ کر پنوں سے ملاقات کی اور مہمان ہو کر رات کے وقت سسی کو بے خبری کے عالم میں روتا چھوڑ کر اور پنوں کو ایک تیز رفتار اونٹ پر سوار کروا کر اپنے ملک کی طرف روانہ ہو گئے۔ سسی جب رات کے پچھلے پہر بیدار ہوئی تو اس نے اپنے جاگتے نصیب کی دنیا کو نیند کی بے رحم فوج کے ہاتھوں پامال دیکھا جس پر بے ساختہ وہ اپنے کپڑے پھاڑتی اور چیختی چلاتی تنہا اپنے محبوب کے تعاقب میں روانہ ہوئی۔ انتہائے شوق میں وہ پا برہنہ پہاڑوں کی پتھریلی راہوں کو روندتی رہی، اس طرح جب مسلسل چالیس کوس کا فاصلہ طے کیا تو ایک مقام پر پیاس سے جاں بلب ہو کر گر پڑی اور جس طرح کوئی عالم سکرات میں ایڑیاں رگڑتا ہے، اس طرح زمین پر پاؤں مارنے لگی خدا کی قدرت سے اسی وقت وہاں پانی کا ایک لبریز تالاب نمودار ہو گیا جس میں سے پانی پی کر وہ دوبارہ تازہ دم ہو گئی معتبر لوگوں سے سنا گیا ہے کہ وہ تالاب آج تک پانی سے بھرا رہتا ہے اور قحط سالی کے کیسے ہی سخت زمانے کیوں نہ آئیں وہ کبھی خشک نہیں ہوتا، اس واقعہ سے قبل سسی نے رات کو مہندی لگائی تھی اور رواج کے مطابق مہندی کی شاخ ہاتھ میں لے کر سوئی تھی، جاگتے وقت یہ مہندی کی شاخ ہاتھ میں تھی اور اس شاخ کو اس مقام پر اس نے بو یا تھا، قدرت الٰہی سے وہ شاخ پھل پھول کر درخت بن گئی اور آج تک اس شکستہ دل کی یادگار کے طور پر قائم ہے۔

قصہ مختصر، تازہ دم ہونے کے بعد سسی وہاں سے آگے بڑھی اور تقریباً چھ سات کوس اور بھی پہاڑی راستہ پر چلتی رہی اس کے بعد پھر پیاس کی شدت میں مبتلا

ہوئی ایک چرواہے نے اسے دور سے دیکھا تو بری نیت کے ساتھ اس کے قریب آیا اور اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ اس پر سسی نے چیخ کر کہا " اے بے درد! میں پیاس سے جاں بلب ہوں اور تو مجھ پر مفتون ہو رہا ہے!۔ تجھے پہلے میری تشنگی دور کرنی چاہیئے۔ یہ سن کر چرواہا تیزی کے ساتھ اپنے گلے میں گیا تاکہ کچھ دودھ دوہ کر لے آئے۔ اس طرف سسی اپنے محبوب کی تلاش سے ناامید ہو چکی تھی چنانچہ اس نے خود کو جب اس نئی مصیبت میں مبتلا دیکھا تو دکھے دل سے بارگاہ الٰہی میں کہ وہی دکھے دلوں کا چارہ ساز ہے، فریاد کی اور اس غول بیابانی سے پناہ طلب کی خدائے پاک کی قدرت سے ایک پہاڑی چٹان میں شگاف پیدا ہو گیا اور جس طرح لعل کو پتھر کے دل میں جگہ مل گئی البتہ عام لوگوں کو عبرت اور محبوب کو پتہ دینے کے لیئے اس کی چادر کا پلو باہر رہ گیا۔ چرواہا جب دودھ لے کر آیا اور آ کر قدرت کا تماشہ دیکھا تو بے حد پشیمان ہوا اور رسم کے مطابق قبر کی نشان دہی کے لیے اس نے پتھروں کا حصار چن دیا۔

عشق و محبت کے مارے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جب پنوں کو اس کے باپ کے پاس لے گئے، تو وہاں وہ اس قدر بے چین ہونے لگا کہ اس کے باپ کو اس کے مرجانے کا خوف لاحق ہو گیا چنانچہ مجبوراً اس کے بھائیوں کو اس کے ساتھ روانہ کر کے ہدایت کی کہ کسی بھی طرح اس کے محبوب کو لے آؤ۔ واپسی میں جب پنوں سسی کی قبر کے قریب پہنچا تو تازہ نشانات دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دل کی کشش نے تو اسے اپنے محبوب کا پتہ دے دیا لیکن ظاہری ثبوت کے لیے وہ اسباب تلاش کرتا رہا اتفاقاً مذکورہ بالا چرواہا

له ایک روایت کے مطابق بنجارے سے سسی نے راستہ پوچھا اکیلی خوبصورت عورت کو دیکھ کر اپنی نیت بدل لی لیکن سسی نے کہا، میں تھکی ہوئی ہوں پہلے تو میرے کھانے پینے کا بندوبست کر اور ایسا سلوک کر تاکہ میں پنوں کو بھول جاؤں۔ پھر وہ کھانے پینے کا سامان لینے چلا گیا اس دوران سسی نے خدا کے حضور دعا کی اور گڑگڑا وہ ایک چٹان میں سما گئی۔

وقت پر ادھر آ نکلا اور آ کر اس نے مفصل حالات سے باخبر کیا کس پر وہ فی الفور اونٹ
سے نیچے اترا اور بھائیوں سے کہنے لگا کہ آپ لوگ کچھ توقف کریں میں اس قبر کی زیارت
کر لوں۔ اس کے بعد اس نے خود کو دیوانہ وار اس قبر پر گرا کر خداوند کریم و کارساز
کی بارگاہ میں گڑگڑا کر وصالِ محبوب کی التجا کی۔ چنانچہ جیسا کہ بے وسیلوں کو اس کی بارگاہ
میں سجدہ ریز ہونے سے ناکامی نہیں ہو سکتی۔ قادر کاملہ کی قدرت سے وہ چٹان پھر شق ہوئی اور
جڑواں بادام کی طرح اسے بھی اسی لحد میں جگہ مل گئی۔ اس وقت سے یہ عجیب داستان عوام
کی زبان پہ جاری ہے اور صاحبانِ حال و قال یہ واقعات انہی عاشق و معشوق کی زبانی جن میں سے
ہر ایک فی الواقع عاشق بھی تھا اور معشوق بھی، "مُمر" "حسینی" میں گاتے ہیں اور اس مجاز میں
حقیقت کی راہ تلاش کرتے اور پاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ ان دونوں واصلین کے ذکر کی تاثیر سے
اہلِ وجد و سماع پر عجیب کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ "میر معصوم" بکھری نے اس قصہ کو مثنوی
"حسن و ناز" میں بیان کیا ہے اس کے علاوہ "قاضی مرتضیٰ" سورٹھی ساکن موضع کتیانہ
نے محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں اسے ایک خاص طرز میں نظم کیا تھا۔

"نقل ہے کہ "اسماعیل" نامی ملتان کا ایک درویش ان دنوں عشاق اور اقلیم عشق کے
شہنشاہوں کی زیارت کے لئے آیا اور اپنے اونٹ کو دور چھوڑ کر ان دونوں کے دیدار کی
آرزو میں تین دن تک بھوکا بیٹھا رہا۔ تین دن کے بعد ایک بوڑھی عورت کچھ روٹیاں اور تھوڑا
پانی لے کر ظاہر ہوئی۔ درویش نے کہا کہ جب تک سسئی اور پنھوں کو نہ دیکھوں گا تب تک ہرگز کچھ
نہ کھاؤں گا، بوڑھی نے کہا کہ میں سسئی ہوں، البتہ پنھوں کو دیکھنے کا خیال ترک کر دے، کیونکہ
زمانے کا کوئی بھروسہ نہیں اور میں پہلے ہی دیوروں کی ستائی ہوئی ہوں۔ یہ حال بڑا دردناک ہے،
درویش نے کہا کہ مجھے یہ یقین کیسے ہو کہ تو ہی سسئی ہے؟ کیونکہ سسئی تو جوان اور خوبصورت تھی
اور تو بوڑھی عورت ہے۔ اس پر اس نے خود کو فی الفور اپنے اصلی روپ اور جوانی میں ظاہر کیا
اور درویش سے کہا "اب تو کچھ کھا لے" درویش نے جواب دیا کہ جب تک میں تم دونوں

کو نہ دیکھ لوں گا اس وقت تک ہرگز کچھ نہ کھاؤں گا چاہے بھوکا مرجاؤں کیونکہ میں نے ایسا عہد کیا ہے۔ آخر کار بڑی ردو قدح اور قسما قسمی کے بعد سسی نے لحد میں جا کر پنھوں کو کمر تک باہر نکالا لیکن ساتھ ہی اس ماہتاب نے جوزا کے مانند اسے دونوں ہاتھوں سے اپنی گرفت میں لے لیا تا کہ پہلے کی طرح پھر کوئی اسے اس سے جدا کرنے جائے۔ غرض اس طرح کتنے ہی باصفا بزرگوں نے انہیں دیکھا ہے۔ اس مقام سے اونٹوں پر سوار ہو کر گزرنے والوں کے حق میں بہتری نہیں ہوتی اور جو شخص بھی ان کی قبر پر جا کر شب بیداری کرے گا باوجود اس کے وہ علاقہ تراب ویران ہے لیکن وہ غیبی مہمان رہے گا۔"[1]

سندھی زبان میں سسی پنوں کی داستان کو تقریباً ہر بڑے شاعر نے بیان کیا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، شاہ عنایت، خلیفہ نبی بخش، صابر نوحانی، سچل سرمست، قطب شاہ، محمد عارف کلہوڑا، حمل فقیر، محمد واصل درس اور دیگر بے شمار سندھی گو شعراء نے اس داستان کو مکمل یا جزئی طور پر بیان کیا ہے لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس داستان کو مکمل طور پر تو بیان نہیں کیا لیکن آپ نے اس داستان کو تمثیلی طور پر بیان کر کے ان کے بعد کے شعراء کو ایک نئی فکر انگیزی عطا کی۔ شاہ لطیف نے اس داستان کو مختلف سروں میں بیان کیا ہے اور ہر ایک کردار کا جو داخلی ونفسیاتی پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے اسی پہلو کو ایک تمثیل بنا کر پر اثر انداز سے بیان کیا ہے۔ کہیں سسی کا عزم و حوصلہ، کہیں بلوچ دیوروں کی بے وفائی، کہیں پنوں کی کج ادائی، اور کہیں تصوف کی باریکیاں شاہ لطیف نے اس دور میں بیان کیں جب اردو شاعری بے بنیاد باتوں میں الجھی ہوئی تھی۔

سسی کو پرعزم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں (سُر سسی آبری)

اے سسی کیچ دور ہے لیکن ۔ بدگماں ہو نہ رہ گزاروں سے

آرزو کو چراغِ راہ سمجھ ۔ کیوں ہراساں ہے کوہساروں سے

اس قدر بھی تو وہ بعید نہیں ۔ دیدۂ شوق نا امید نہیں

---

[1] میر علی شیر قانع ٹھٹوی: "تحفۃ الکرام"، (تصحیح وحواشی، مخدوم امیر احمد و ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مترجم، "اختر رضوی")، کراچی، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۵۹ء، ص۔ ۸۲-

سر سسی میں فرماتے ہیں [1]

سسی کو چاہیئے پنہوں کی خاطر ۔ سہے افتاد ہائے ناگہانی

بھرم قائم ہے جن کی تشنگی کا ۔ انہیں خود ڈھونڈتے آئے گا پانی

یوں تو شاہ صاحب نے سندھ کی عشقیہ داستانوں کو جزئی طور پر بیان کیا ہے لیکن ان تمام داستانوں کی عشقیہ تمثیل نگاری کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادی اور مرکزی باتوں کو نفسیاتی اور ماورائی صوفیانہ استعارات اور محاکات سے کام لے کر بامقصد بنادیا ہے ۔

شاہ صاحب ہمہ اوست کے قائل نظر آتے ہیں ، فرماتے ہیں

گھڑا ڈوبا تو یہ آواز آئی ۔ نہیں دونوں میں اب کوئی جدائی

شکستِ جسمِ خاکی سے ہے پیدا ۔ ربابِ روح کی نغمہ سرائی

وصالِ یار کی راحت پہ قرباں ۔ طریقِ زہد و رسمِ پارسائی

مری رگ رگ میں نغمہ زن ہے پنہوں ۔ خوشا قسمت میری خود آشنائی

عشق ومحبت کے اس جذبے کو ایک صوفی شاعر بہت اچھی طرح اجاگر کرسکتا ہے ۔

میرے محبوب اک جامِ محبت ۔ مجھے خود اپنے ہاتھوں سے پلا دے

قسم ہے مجھ کو اس تشنہ لبی کی ۔ سراپا تشنۂ الفت بنا دے

نہ ہو سیری کبھی وارفتگی سے ۔ بجھاؤں تشنگی کو تشنگی سے

عشق کے راستے میں مشکلات ہی مشکلات ہیں شاہ صاحب اس کو بیان کرتے ہیں :۔

دے سہارا مجھے میرے محبوب ۔ تجھ سے ہوں رب میں لو لگائے ہوئے

دشت گنجان اور گھنے جنگل ۔ ناگ بیٹھے ہیں پھن اٹھائے ہوئے

عشق کی ایک منزل کو پاکر سکون سے بیٹھنا عشق کی توہین ہے بلکہ یہاں تو سعئی پیہم کی ضرورت ہوتی ہے

---

[1] شیخ ایاز مترجم "رسالہ شاہ عبداللطیف" اشاعت دوم حیدرآباد انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی ۱۹۷۸ء ص ۔ ۲۰۴

؎ تیرا ہر نقش پا مرے پیارے ۔ کیچ کا راستہ دکھاتا ہے
اب سرِ راہ بیٹھنا کیسا ۔ سعیِ پیہم پہ حرف آتا ہے
وصل اس کا نصیب ہو یا رب ۔ جو مرے حوصلے بڑھاتا ہے

؎ مبارک عزم کہسار و بیاباں ۔ نہیں وہ ہوت اب ہاڑے میں ناداں

؎ نہ ہو تا سختیِ رہ سے پریشاں ۔ اگر ہے آرزوئے وصلِ جاناں

؎ قسم ہے تجھ کو درماندہ نہ ہونا ۔ کسی مشکل سے مشکل مرحلے میں
سفر ہر ایک راہی کے لیے ہے ۔ نہ آئے فرق تیرے حوصلے میں

ایک انداز اور دیکھیے ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ سسئی کو اس طرح بیابان میں اپنے محبوب کو ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو خود اس کی ذات میں موجود تھا ۔

؎ لطیف ان روح فرسا وادیوں میں ۔ خدا جانے سسئی کیا ڈھونڈتی ہے

شاہ صاحب نے سُر معذوری، سُر کہساری، سُر حسینی ، اور سُر سسئی میں خاص طور پر اس داستان کے حصے بیان کیے ہیں ان اشعار میں، بلوچوں کے قافلے، اونٹوں کے سفر، کہساروں اور پہاڑوں کے تمام ان کے ساتھ دشوار گزار راستوں کا ذکر شاہ صاحب کے ان خیالات اور فکر کی دلیل ہے کہ جس میں طلب ایک متحرک روح افروز اور انہماک آفریں عمل ہے۔ کسی چیز کو تلاش کرنے میں جو انتظار، لگن اور اضطراب ہوتا ہے وہ اس خوشی سے کم ولولہ انگیز نہیں جو اس کو حاصل کرنے پر میسر آتی ہے ۔ دراصل شاہ صاحب نے ان عشقیہ داستانوں کے ذریعے بھی اسرار الٰہی اور روحانی کیف و سرور کے انداز بیان کیے ہیں ۔

سسئی کے بیدار ہونے پر وہ پنہوں کو غائب پاتی ہے اس کے ذہنی اضطراب کی عکاسی کرتے ہوئے شاہ صاحب کا اپنا کرب بھی شامل ہو گیا ۔

؎ مجھے معلوم تھی اونٹوں کی خصلت ۔ مگر وہ اونٹ کیسے تھے خدایا
کہ جب رکھے گئے پالان ان پر ۔ کوئی چیخا نہ کوئی بلبلایا

سسّی نہیں پہلے سے میرے دیوروں نے ۔ کچھ ایسا رازداں اپنا بنایا
سسّی کہ پنوں کو گئے جس وقت لے کر ۔ کسی نے بھی نہ اس کا بھید پایا

سندھی میں سسّی پنوں کی داستان کے جو اشارے شاہ لطیف کے کلام میں ملتے ہیں یہ سندھی داستان کا سب سے قدیم اور عظیم ماخذ معلوم ہوتے ہیں اور ان کے بعد کے لکھنے والوں نے میر علی شیر قانع کی " تحفۃ الکرام " کی نثری داستان سسّی پنوں سے اور شاہ عبداللطیف کے کلام سے کہانی کا خمیر تیار کیا ہے

شاہ عبداللطیف اور شاہ عنایت سے پہلے اگر کسی نے سندھی زبان میں سسّی پنوں کی داستان نظم کی ہے تو اس کا اب تک سراغ نہیں مل سکا ہے ۔

سسّی پنوں کی داستان کو سندھ، پنجاب، بلوچستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی بیان کیا گیا ہے لیکن اردو میں یہ داستان سب سے پہلے نواب محبت خاں نے نظم کی ۔ یہ درست ہے کہ مختلف علاقوں کے مختلف بیان کرنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں یہ داستان بیان کی ہے کیونکہ ان کے قصۂ مقام کے تعین میں فرق ہے، کہیں ناموں اور کرداروں کا فرق کہیں کہانی اور قصے میں حالات و واقعات کا فرق نمایاں ہے اور ویسے بھی ان رومانی داستانوں کے بارے میں ہم ان کی صداقت پر بھی کوئی حکم نہیں لگا سکتے البتہ اردو ادب میں نواب محبت خاں کی "اسرار محبت" ایک خاص درجہ اور مقام رکھتی ہے ۔ یہ مثنوی لکھنؤ کے ریذیڈنٹ مسٹر جانسن کی فرمائش پر لکھی گئی ہر علاقے کے لکھنے والے نے اپنی اپنی معلومات کے مطابق اس قصہ کو بیان کیا ہے ۔ اس میں موجود کرداروں کے نام میں بھی اختلاف ہوا اور اسی داستان سے منسلک بہت سے واقعات نے جنم لیا جن کی صداقت کو پرکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی واضح کسوٹی نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ دوسری داستانوں کی طرح اس عشقیہ داستان کا بھی کوئی اخلاقی اور فلسفیانہ پہلو ہے ۔

بہر حال جہاں تک نواب محبت خاں کی اس مثنوی اسرار محبت کا تعلق ہے تو ہمارے پیشِ نظر اس کے دو مختلف سائز میں نسخے موجود ہیں ایک نسخہ تو مخطوطہ ہے جو نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے اس کا کاغذ نہایت خستہ ہے ۔ بوسیدہ ہو چکا ہے اور جگہ جگہ سے کرم خوردہ ہے اس مثنوی میں ٥٩٢ اشعار موجود ہیں ۔ آخری صفحہ پر کاتب کا نام اور کتابت کی تاریخ و جگہ کا پتہ بھی دے دیا گیا ہے[1] یہ چھوٹا کتابی سائز ہے دوسرا نسخہ شائع شدہ ہے جو انجمن ترقی اردو کتب خانہ خاص کراچی میں موجود ہے جو بڑے کتابی سائز پر ہے اور بیس۲۰ صفحات میں مکمل کیا گیا ہے جبکہ قدیم مخطوطہ ٥٧ صفحات پر مشتمل ہے اور چھوٹے کتابی سائز پر ہے ۔ طبع شدہ نسخے کے سرورق پر یہ تحریر ہے "الملتہ یدکر قصہ سسی پنوں مسمیٰ بہ مثنوی اسرار محبت در بیت السلطنت لکھنؤ طبع شد" کاتب کا نام وغیرہ تحریر نہیں ہے اور نہ ہی کسی پریس کا نام لکھا ہے کاتب نے اس کی کتابت کرتے وقت ان باتوں کا ضرور التزام ہے مثلاً "گ" کے لیے "ک" لکھا گیا ہے ۔ یائے معروف اور یائے مجہول کے استعمال میں کسی اصول کی پابندی نہیں کی گئی ہے جہاں دل چاہا یائے معروف لکھ دی اور جب دل چاہا یائے مجہول لکھ دی اور یہ کہ الفاظ کو بے اصولی طور پر ملا دیا گیا ہے ۔ دراصل یہ خامیاں اتنی تعجب خیز اس لیے بھی نہیں ہیں کہ اس دور میں اردو املا

---

[1] تمت تمام شد مثنوی نواب محبت خاں ولد حافظ رحمت خاں در قصہ سسی پنوں التاریخ سوئم شہر شوال بروز چہارشنبہ بوقت چاشت بدستخط حقیر پر تقصیر لالہ منگا رام ولد دانجیہ مرحوم ساکن اصالت پور چاوڑی پرگنہ فروسے صوبہ دار دارالخلافت شاہجہاں آباد ١٢٤٣ ہجری برائے خاطر داشت اخوندزادہ خود قلمی شد فقط

اے قاریا من مکن چیدمن عتاب ۔ کہ خطای رفتہ باشد در کتاب

آن خطای رفتہ را تصحیح کن ۔ از کرم واللہ عالم بالصواب

کا انداز کچھ اس طرح کا تھا پھر اس معیار کتابت کی کچھ ذمہ داری کاتب حضرات پر بھی آتی ہے
ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب مثنوی "اسرار محبت" پر تبصرہ کرتے ہوئے اس زیر مطالعہ نسخہ "مثنوی اسرار محبت" کا ذکر کرتے ہیں جو رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے، آپ نے بھی اصول املا کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور الفاظ کو بلاوجہ ملانے کو ناقل کی کوتاہی قرار دیا ہے مثلاً

گئے حسرت بھرے دونوں جدا نسے ۔ نہ کیونکر غم ہو ان کی داستانسے

آگے چل کر رقم طراز ہیں[1]

"ممکن ہے ناقل نے جس نسخہ سے نقل کیا ہو اس میں اسی طور پر اشعار لکھے ہوں لیکن مجھے یہ بات ماننے میں تامل اس وجہ سے ہے کہ صاحب گلشن ہند نے جتنے اشعار محبت خاں کی غزل اور مثنوی سے اقتباس کیے ہیں وہ سب ہر طرح صاف اور ستھرے ہیں ان کی زبان میں قدامت نہیں ہے اور سچ پوچھئے تو یہ میر اور مرزا کے عہد کی زبان ہی نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے ناقل دکنی ہو یا دکنی زبان سے متاثر ہو یا جس نسخے سے اس نے نقل کیا ہو وہ اصل مثنوی سے دکنی میں نقل کیا گیا ہو۔ بہر نوع اس سلسلے میں کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی تاوقتیکہ اصل مسودہ دستیاب نہ ہو، یہ مان لیا کہ رامپوری نسخہ کی زبان وہی ہے جو محبت خاں نے تحریر کی تھی مناسب نہیں معلوم ہوتا، میں نے آئندہ سطور میں جس قدر بھی اشعار مثنوی سے نقل کیے ہیں ان کی زبان وہی قائم کی ہے جو محبت خاں کی غزل اور ان کے معاصرین کی زبان تھی"۔

ڈاکٹر لطیف حسین کی محولہ بالا تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں خود بھی کامل یقین نہیں ہے کہ یہ مثنوی دکنی زبان میں موجود تھی اسے بعد میں اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ دراصل اس میں موجود املا یا کتابت کی خامیاں تو کاتب سے تعلق رکھتی ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی زبان کا وہ معیار نہیں جو میر اور مرزا کی زبان کا اور خود محبت خاں کے اردو دیوان کا معیار ہے جو اس سے بلند تر ہے اور یہ سمجھ میں نہ آنے والی کوئی بات بھی نہیں کیونکہ مثنوی کی تحریک ان کی

اپنی جیسی بھی ایک انگریز قدردان کی فرمائش کی تکمیل پیشِ نظر ہے اور پھر قصہ کا پلاٹ بھی معلوم کیا گیا ہے
جس کی ذمہ داری بھی نواب موصوف پر تھی دوسرے یہ کہ طول طویل مثنویوں کا معیار اس لیے نہیں
بڑھ پاتا کہ قصہ اور کہانی کے بیان پر زور دیا جاتا ہے۔
ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب نے ایک اور قلمی نسخہ کا ذکر کیا ہے جو رضا لائبریری رام پور میں
موجود ہے یہ ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں اشعار کی تعداد ۵۹۰[1] بتائی گئی ہے[2]
قومی عجائب گھر کراچی سے دستیاب ہونے والے قلمی نسخہ کے اشعار ۶۵ صفحات پر مشتمل ہیں اور
آخری صفحہ یعنی ۷۵ ویں صفحہ پر کاتب نے اپنا نام صاحب مثنوی کا نام اور کتابت کا پتہ وغیرہ
تحریر کیا ہے۔
پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے اسرارِ محبت قلمی نسخہ مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی[3] کے حوالے سے مثنوی
کے اشعار کی تعداد تقریباً ساڑھے چھ سو بتائی ہے جو صحیح نہیں ہے
بہرحال ہمارے پیشِ نظر قلمی نسخہ مملوکہ قومی عجائب گھر کراچی اور طبع شدہ مملوکہ کتب خانہ خاص
انجمن ترقی اردو کراچی ہیں۔
ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اسرارِ محبت" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں[4]
" مثنوی زبان و بیان کے لحاظ سے بڑی شگفتہ و پاکیزہ ہے۔ محبت یا نجاں میں

---

(۱) قومی عجائب گھر کراچی سے ملنے والے قلمی نسخہ میں ۵۹۲ اشعار ہیں اور یہ نسخہ مولانا ڈاکٹر عبدالحق سے حاصل
کیا گیا ہے چونکہ مولانا عبدالحق لائبریری کی مہر ثبت ہے

(۲) قلمی نسخہ "اسرارِ محبت" رام پور مجلد ہے جس میں اسرارِ محبت کے علاوہ دیگر سات مثنویاں دریائے عشق،
مثنوی محبت، بکٹ کہانی، مثنوی لطف، مثنوی انور، قصہ سوداگر بچہ اور بارہ ماسہ شامل ہیں

(۳) اب یہ قلمی نسخہ قومی عجائب گھر کراچی میں موجود ہے

مثنوی نگاری کی اچھی صلاحیت نظر آتی ہے انہوں نے ہر واقعہ اور ہر موقع کی مکمل تصویر کھینچنے کی پوری کوشش کی ہے جذبات نگاری کے بعض کامیاب مرقعے بھی اس میں مل جاتے ہیں"

مثلاً سسی کے غم و فراق کی تصویر دیکھیے۔

ہوا خونِ جگر آنکھوں سے جاری ۔ لگا دل بریں کرنے بے قراری
یہ سینے میں پھڑکتا تھا دلِ زار ۔ قفس میں جوں ہو مرغ نو گرفتار
نظر کے بیش و پس ادھر ادھر کو ۔ لگی رونے وہ دھر زانو پہ سر کو
ہوا یہ یک بیک حالِ تن زار ۔ کہ ہو جیسے کوئی مدت کا بیمار
جنونِ عشق جب ہوتا تھا تازہ ۔ نکل جانے کا کرتی تھی ارادہ
غرض دشوار تھا آرام پانا ۔ کبھی اٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا

اس سادگی اور شگفتہ بیانی کے ساتھ پوری داستان نظم کر دی گئی ہے"

پروفیسر مجنوں گورکھپوری "اسرارِ محبت" پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"غزلوں کا مطالعہ کیجئے یا مثنوی کا محبت کی جذبات نگاری اور اسلوب کا قائل ہونا پڑتا ہے، واقعات اور جذبات کو بیان کرنے کی ان کو پوری قدرت حاصل تھی وہ ایک ماہر و مشاق شاعر تھے، سسی کا حال انہوں نے جس سادگی اور دردمندی کے ساتھ بیان کیا ہے اس سے پڑھنے والے کا دل بغیر اثر قبول کیے ہوئے نہیں رہتا، اس اعتبار سے وہ اپنے استاد کے مخلص شاگرد تھے، مرزا جعفر علی حسرت کے سوز و گداز کی جھلک محبت کے کلام میں کافی ہے اور اس لحاظ سے ان کی روش جرأت کی روش سے الگ ہے

پروفیسر مجنوں گورکھپوری آگے چل کر فرماتے ہیں[1]

"آخر میں مجھے سسی پنوں کے قصے کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے جیسا کہ فضلِ حق

---

[1] پروفیسر مجنوں گورکھپوری : "نکاتِ مجنوں" الہ آباد، اسرار کریمی پریس، ۱۹۵۷ء، ص ۲۸۵ -

نے اپنے مضمون میں ظاہر کیا ہے ،حضرت نورالٰہی اور محمد عمر کا یہ خیال صحیح نہیں
کہ دہلی اور لکھنؤ کے شعراء اس قصہ کو مبتذل اور عامیانہ سمجھتے رہے اور اس طرف
توجہ نہیں کی "

انشاء کا یہ مشہور شعر

؎ سنایا رات جو افسانہ ہیر رانجھے کا ۔ تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

یقیناً اس قصہ کی داد دیتا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس قصّہ نے بلاد پنجاب
سے باہر رواج نہیں پایا لکھنے کو اکثر فارسی اور لکھنے والوں نے اس کو لکھا
لیکن یہ قصہ کسی طرح "ہندوستان پسند" نہ بن سکا اور اس کا سبب ادبی یا
اخلاقی نہیں ہے بلکہ تاریخی اور جغرافیائی ہے ، قصہ سندھ کے قرب و جوار سے
متعلق ہے اور ان ممالک کو ماورائے ہندوستان سمجھنے کی قرنہا قرن سے
عادت چلی آئی ہے اور اب تک چلی آرہی ہے ، سندھ یا بلوچستان کے
قصوں سے اہل ہند موانست نہیں پیدا کر سکتے تھے چنانچہ سسّی پنوں اور ہیر
رانجھا کے قصے چلنے کو تو اپنی زاد بوم سے چلے لیکن قریب ترین جوار یعنی
مشرقی پنجاب سے آتے آتے دم توڑ کر رہ گئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں
تو یہ قصے رائج اور مقبول ہو گئے مگر اس کے باہر شاذ و نادر ہی سننے
میں آئے ہیں[۱]

"اسرارِ محبت" پر تفصیلی تبصرہ سے قبل ہم یہ بتاتے چلیں کہ شمالی ہند میں منظوم داستانوں
کا رواج میر اور مرزا کے عہد سے ہوتا ہے اور انہی کے ہاں ان کے اولین نمونے
مختصر عشقیہ افسانوں کی صورت میں ملتے ہیں خاص طور پر میر کے عشقیہ قصوں میں حمد ،

---

[۱] پروفیسر مجنوں گورکھپوری ؛ "مثنوی اسرارِ محبت" تنقیدی حاشیے ص ۲۳۸ ۔

نعت، منقبت، مناجات یا بادشاہ وغیرہ کی مدح شامل نہیں ہوتی بلکہ کہانی کے موضوع کے اعتبار سے قصیدے کی تشبیب یا تمہید کے طور پر چند اشعار کہتے ہیں پھر گریز یعنی اصل قصہ شروع کرتے ہیں۔ عشقیہ قصوں کے یہ تمہیدی اشعار میر کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

نواب محبت خاں کی مثنوی "اسرارِ محبت" میں دوسرا ہی رنگ نظر آتا ہے وہ نعت و منقبت بھی شامل کرتے ہیں لیکن بعض جگہ عنوانات قائم نہیں کرتے اور بعض جگہ ان کی ترتیب بھی درست قائم نہیں کرتے۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر میر کی مثنویاں بھی رہی ہوں گی کیونکہ میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کی تمہید محبت کے موضوع پر اشعار دیکھئے جو کہ میر کے پہلے دیوان ۱۱۹۲ھ میں موجود ہیں۔

سہ محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور ۔ محبت نہ ہوتی نہ ہوتا ظہور
محبت مسبّب محبت سبب ۔ محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبت ہی اس کارخانے میں ہے ۔ محبت ہی سب کچھ زمانے میں ہے
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل ۔ محبت نہ ہووے تو پتھر ہے دل
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ ۔ محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ

اس بحر میں میر کی ایک اور مثنوی "جوشِ عشق" ہے جس کی ابتدا میر نے اس طرح کی ہے۔

سہ خدا ایک فرقے میں جانا ہے عشق ۔ کہ کل نظم ان سب نے جانا ہے عشق
نہ ہو عشق تو انس باہم نہ ہو ۔ نہ ہو درمیاں یہ تو عالم نہ ہو
کہیں عشق خلوت میں وحدت کے ہے ۔ یہی عشق پردے میں کثرت کے ہے
کہیں عشق عاشق ہے معشوق ہے ۔ کہیں خالق و خلق مخلوق ہے

میر نے ہر مثنوی کے آغاز میں عشق کی کیفیات و اثرات پر متعدد اشعار کہے ہیں "حکایتِ عشق" نام کی پوری مثنوی میں ۱۴۴ اشعار ہیں لیکن ابتداء کے پچاس اشعار عشق کی تعریف و تفصیل میں ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

عجب عشق ہے مرد کار آمدہ ۔ جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ
بہت عشق میں لوگ لاگی ہوئے ۔ بہت خاک مَل منہ پہ جوگی ہوئے
کسی کا جگر غم سے خوں ہو گیا ۔ کسی کوہکن کو جنوں ہو گیا
غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز ۔ کہیں ناز یکسر کہیں ہے نیاز

میر کی چند مثنویوں کے ابتدائی اشعار دیکھنے کے بعد "اسرار محبت" کے ابتدائی اشعار کو دیکھیے
"در حمد باری تعالیٰ عز نویسد" کے عنوان[1] سے مثنوی کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے

محبت تام اور ہر دل نگیں ہے ۔ محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
جو سمجھو ذاتِ مطلق فی الحقیقت ۔ محبت ہے محبت ہے محبت
محبت بوئے گل گل ہے محبت ۔ محبت جزو اور کل ہے محبت
محبت ظاہر اور باطن محبت ۔ محبت اول و آخر محبت

اس عنوان میں آگے فرماتے ہیں۔

محبت میں نہ ہو پروائے عالم ۔ محبت ہی کرے رسوائے عالم
محبت اور ہی عالم دکھا دے ۔ محبت غم دو عالم کا بھلا دے
محبت نے کیا کتنوں کو برباد ۔ محبت میں ہوئے مجنوں و فرہاد
دکھے ہے جذبۂ صادق محبت ۔ کرے معشوق کو عاشق محبت[2]

---

[1] طبع شدہ نسخہ لکھنؤ میں "حمد باری تعالیٰ" کا عنوان یعنی آغاز میں بسم اللہ کے بعد کوئی پہلا عنوان قائم نہیں کیا گیا ہے جبکہ قلمی نسخہ کراچی میں "در حمد باری تعالیٰ" کے عنوان سے ۲۱ اشعار پیش کئے گئے ہیں

[2] طبع شدہ نسخہ لکھنؤ مملوکہ کتب خانہ خاص کراچی میں اس شعر سے پہلے یہ عنوان قائم کیا گیا ہے "در بیان جذبہ محبت گوید"

؎ کہوں کیا میں کہاں تک ہے محبت ۔ زمیں سے آسماں تک ہے محبت

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کے مطابق ان اشعار میں کچھ فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ "اسرار محبت" میں دکنی زبان کا کچھ اثر ضرور پایا جاتا ہے دراصل محبت خان اس عشقیہ داستان کی سرزمین سندھ اور وہاں کی زبان سے واقف نہیں تھے لہٰذا انہوں نے دلی اور لکھنؤ کے بین بین زبان کا انداز اختیار کیا ہے، عشقیہ داستانوں میں دکنی زبان کا اثر اور انداز اس دور کی دکنی مثنویوں میں ملتا ہے اور محبت خاں کے پیش نظر وہ قدیم مثنویاں بھی رہی ہوں گی جن کا تعلق دکن ہی سے تھا یعنی بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے ادبی اثرات دور دراز تک پہنچے تھے۔
محبت خاں فارسی، پشتو، عربی، اردو کے شاعر تھے ان کا اصل وطن سرحدی علاقہ تھا لیکن انہوں نے ہر زبان کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور وہ کسی ایک دبستان سے متعلق نہیں رہے بلکہ انہوں نے برصغیر کی تمام زبانوں سے خوشہ چینی کی۔ ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ محبت خاں کے آبا سرحد کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کی پیدائش روہیل کھنڈ میں ہوئی تھی، ان کی مادری زبان پشتو اور خاندانی زبان فارسی تھی لیکن انہوں نے لکھنؤ میں رہ کر اردو زبان کے وقار کو بھی بلند کیا۔
اردو روزمرہ اور محاورے کا لطف بھی برقرار رکھا، نہایت سادگی اور دردمندی سے اس داستان کو قلم بند کیا

؎ پھلا ایسا ہے بستانِ محبت — یہ پھولا جس سے ریحانِ محبت

در نعت حضرت سید المرسلین ﷺ

ے محمد مصطفیٰ رنگینئ عشق ۔ وہ زلف اس کی بہار سنبل عشق
کیا معشوق ہو کر اس نے طے عشق ۔ اسی کو عشق ہے اور عشق ہے عشق
وہی مصدوق کو صادق وہی عشق ۔ وہی معشوق و عاشق اور وہی عشق

نعت کے محولہ بالا اشعار میں وارفتگی کی کیفیت پائی جاتی ہے اور رسول مقبول ﷺ سے شاعر کی بے پناہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے میر کی مثنوی "جوان عروس" کے ابتدائی اشعار میں سے یہ شعر دیکھئے

ے کہیں عشق عاشق ہے معشوق ہے ۔ کہیں خالق و خلق مخلوق ہے

جبکہ محبت خاں یہی بات اس طرح بیان فرماتے ہیں

ے وہی مصدوق و صادق اور وہی عشق ۔ وہی معشوق و عاشق اور وہی عشق

نعت کے بعد منقبت در شان حضرت علیؓ "در بیان اسرار عشق و تاسد کردن میگوید" کے عنوانات قائم کئے گئے ہیں جو اصولاً اور احتراماً قائم نہ کرنے تھے کیونکہ "در بیان جذبہ محبت گوید" کے بعد یہ عنوانات مناسب نہ تھے حمدیہ اور نعتیہ اشعار ابتدا میں ہونا چاہیئے تھے۔

حمدیہ، نعتیہ اور منقبت کے اشعار دکن، گولکنڈہ اور بیجاپور کے قدیم شعراء اپنی حکایات اور چکی ناموں میں بالترتیب پیش کرتے تھے۔ اس ضمن میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں۔ "اس کے بعد نعت اور منقبت ہے اور پھر "اسرار عشق" اور "تاثیر عشق" کا بیان ہے اور یہ دونوں اپنا اثر رکھتے ہیں حالانکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ محبت کے

۱؎ اس عنوان سے ۹ اشعار قلمی نسخہ میں موجود ہیں لیکن طبع شدہ نسخہ میں ۱۳ اشعار نعت میں اور ان کے بعد ایک اور عنوان قائم کیا گیا ہے وہ عنوان یہ ہے

"در منقبت امیر المومنین امام المتقین علی ابن ابی طالب علیہ السلام"

بیان کے بعد دونوں عنوانات کی ضرورت نہیں تھی۔

در منقبت امیر المومنین امام المتقین علی ابن طالب علیہ السلام[۱]

اہلِ بیت کی قدر و منزلت محبت محان کے عقائد میں شامل ہے نعت کے ساتھ ہی حضرت علیؓ کی شان میں اس مثنوی میں یہ اشعار موجود ہیں۔

وہی ہے نورِ شمع خانہ عشق - ہر اصحاب اس کا ہے پروانہ عشق
اسے ہے عشق جو نفسِ نبی ہے - اسے ہے عشق جو مولا علیؑ ہے
[۲]کہ وہ مشکل کشا ہے مائلِ عشق - ہوئی آساں اسی سے مشکلِ عشق
رکھا اس بحرِ ولایت سے سرِ عشق - کہے وہ آبرو گوہرِ عشق

عشق کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے نبی کریمؐ کی ذات والا صفات کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کرم اللہ وجہہٗ کریم کا رشتہ ہے اور ان دونوں کی قربتوں سے عشق و محبت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ جس کا رشتہ رسولِ پاک سے استوار ہوگا اور جو اس ذات سے زیادہ قریب ہوگا اس سے زیادہ عشقِ حقیقی کو کون سمجھ سکتا ہے۔ منقبت در شان حضرت علی کے ان چند اشعار سے حضرت علی سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اور اہلِ بیت سے محبت و عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ یہ عنوان طبع شدہ نسخہ میں قائم کیا گیا ہے

۲۔ طبع شدہ نسخہ میں یہ شعر اس طرح ہے جو غلط ہے۔

کہ وہ مشکل کشا ہے قابلِ عشق - ہوئی حل اس سے مشکلِ عشق

در بیان اسرارِ عشق و تاثیر کردن میگوید[1]

اس عنوان کے تحت عشق و محبت کی تاثیر کا حال بیان کیا گیا ہے ابتداء اس طرح کرتے ہیں

بیاں کرتا ہوں اب اسرارِ عشق آہ ۔ عجائب رنگ کے ہیں کارِ عشق آہ
نہ چھوڑے پر نہ چھوڑے جان و دل عشق ۔ کہ ہے غارت گرِ ایمان و دل عشق
یہ آتش کب مجھے ہے لگ کے جاں کو ۔ اس آتش نے جلایا اک جہاں کو
کبھی کچھ پھونک دے جیدھر ہو سرکش[2] ۔ یہ آتش ہے یہ آتش ہے یہ آتش
یہ آتش جس کے سر پر شمع ساں آئے ۔ تو یہ بھڑکے کہ قدموں سے گزر جائے
یہ آتش کوہ میں بھڑکے جو آکر ۔ تو دم میں طوطیا کر دے جلا کر
غرض آتش ہے یہ ایسی شرر بار ۔ کہ ہے جس کا نمونہ کرۂ نار

محبت خاں نے عشق کے اسرار بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس آگ میں جلنے والے خواہ کسی مذہب و عقیدہ کے ہوں ایسا کیف و سرور پاتے ہیں کہ جس کا بیان ممکن نہیں عشق حقیقی ہو یا مجازی اس کی لذت اور کارفرمائیاں کسی کو سکون نہیں لینے دیتیں۔

نہ کیوں کر شمع دے اس کو چراغی ۔ دلِ مہ ہے اسی آتش سے داغی

پھر محبت کی تاثیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

نہ ہو دستِ تعقل سے یہ تحریر ۔ محبت کی ہے دور از عقل تاثیر
اگر بلبل نہ ٹک آرام پاوے ۔ تو غنچہ بے کلی سے تنگ آوے

---

[1] قلمی نسخہ میں تاسیر لکھا ہے اور اس عنوان کے تحت ۲۲ اشعار ہیں لیکن طبع شدہ نسخہ میں ۱۳ اشعار کے بعد "در تاثیر محبت" کے عنوان قائم کیا گیا ہے

[2] ملک جائسی کی پدماوت کو بھاشا سے اردو میں کئی شعراء نے منتقل کیا تھا۔ نواب محبت خاں کے شاگرد ضیاء الدین عبرت نے بھی اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے انہوں نے بھی "سرکش" اور "آتش" کا قافیہ باندھا ہے

رتن کے عشق کا شعلہ تھا سرکش ۔ پدم کے بھی لگا دی دل کو آتش

رگِ مجنوں پہ جب نشتر لگایا ۔ وہیں لیلیٰ کا خوں جوشش میں آیا

اثر دیکھا عجب ہیں اس کا صادق ۔ نہ معشوق اس کا چھوٹے ہے نہ عاشق

محبت نے محبت بے جاں کیے ہیں ۔ کہوں کیا جو جو کارستاں کیے ہیں

انہیں میں سے یہ اک افسانۂ عشق ۔ بیاں کرتا ہوں میں دیوانۂ عشق

عشق و محبت کے بارے میں ملتے جلتے اشعار جن میں عشق کی کارفرمائیاں اور کارستانیوں کی طرف اشارے کیئے ہیں لیلیٰ و مجنوں اور شیریں و فرہاد کی تلمیحات کو کوہ و سنگ کے ذریعے بیان کیا ہے اس تمہید کے لیئے چند اشعار ہی کافی تھے لیکن محبت خاں ایک زود گو شاعر تھے ان کے لیئے مثنوی کے اشعار کی تعداد میں اضافہ کوئی مسئلہ نہ تھا ۔ انہوں نے مثنوی کے اصل قصے کی جانب آنے سے پہلے اس مثنوی کی وجہ تصنیف بھی بیان کی ہے ۔

در بیان سبب تصنیف کتاب میگوید [1]

در ذکر فرمائش صاحب والا مناقب قدردان دوستان مسٹر جانسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ [2]

محبت خاں مثنوی "اسرار محبت" کا سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

کہ فرمائش ہے یہ اک نکتہ داں کی ۔ شفیق و قدرداں و مہرباں کی

وہ مثل جان و عالم جملہ تن ہے ۔ تبھی نام اس کا مسٹر جانسن [3] ہے

سراپا اس کو کیا کہیئے کہ کیا ہے ۔ وہ اک ذہنِ ذکا طبعِ رسا ہے

زبس تھی مجھ میں اور اس میں محبت ۔ ہم آپس میں تھے باہم گرم صحبت

قضا را یہ ہوا اک روز مذکور ۔ کہ افسانہ ہے اک دلچسپ و مشہور

---

[1] قلمی نسخے میں مثنوی کی وجہ تصنیف اس عنوان کے تحت بیان کی گئی ہے

[2] مطبوعہ نسخے میں "اسرارِ محبت" کی وجہ تخلیق اسی عنوان کے تحت بیان کی گئی ہے

[3] Mr. Johnson

وہ قصہ سسی اور پنوں کا ہے گا ۔ اگر منظوم ہو جاوے تو اچھا
کہی القصہ بعید بندے سے یہ بات ۔ اگر ضایع نہ ہووے اس میں اوقات
تو معنوں کر کے اس قصے کا معلوم ۔ یہ ہے منشور[1] کر تو اس کو منظوم
یہ بات اس واسطے تجھ سے کہی ہے ۔ کہ مشق اس کی بہت تجھ کو رہی ہے

مندرجہ بالا اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسٹر جانسن جو لکھنؤ کے ریذیڈنٹ ، رہے ان کے محبت خاں سے دوستانہ مراسم تھے اور ان کے ساتھ علمی و ادبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے بھی واقف تھے مزید ان اشعار سے مسٹر جانسن کی علم دوستی و قدر دانی کے ساتھ ساتھ نواب موصوف سے ان کے ذاتی تعلقات کا بھی پتہ چلتا ہے ایک امر اور واضح ہوتا ہے کہ "سسی پنوں" کے اصل قصے کے بارے میں مسٹر جانسن کو بھی علم نہیں تھا انہوں نے کسی کی زبانی یہ قصہ سنا ہوگا اور دلچسپ پا کر نواب محبت خاں سے اس کو نظم کرنے کی فرمائش بھی کر دی جسے محبت خاں ٹال نہیں سکتے تھے۔ مسٹر جانسن کا یہ کہنا کہ اس کی مشق چونکہ نواب موصوف کو رہی ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نواب صاحب نے یا تو کوئی اور مثنوی بھی لکھی ہوگی یا پھر نواب موصوف کی اردو شاعری اور فارسی شاعری کے بارے میں مسٹر جانسن خوب واقف ہوں گے۔ مسٹر جانسن کا فرمائش کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد مختلف قدیم فارسی قصوں اور داستانوں کو اردو قالب میں ڈھالنے کی باقاعدہ ابتداء تو فورٹ ولیم کالج سے ہوئی لیکن ۱۱۹۷ھ میں جب اس داستان کو مکمل کیا گیا تو اس حقیقت کا علم بھی ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے انگریز سخن فہم و ادب نواز ان قصوں کی ترویج و اشاعت چاہتے تھے تاکہ انگریز کارندے اور سرکاری ملازمین برصغیر کی تہذیب ثقافت اور رسم و رواج جان سکیں اور تادیر ہندوستان پر حکومت کرتے رہیں ۔

---

[1] یہ شعر ظاہر کرتا ہے کہ اس سے قبل اس قصہ کو اردو میں نظم نہیں کیا گیا تھا ۔

دوسری بات یہ ہے کہ انگریز حکومت کے کارندے تحقیقی جذبہ رکھتے تھے، جب بھی انہیں کوئی ایسی داستان سننے میں آتی وہ اسے ضبط تحریر کرنے کے متمنی رہتے تھے تاکہ اسے پوری طرح جان سکیں۔

اس مثنوی کو منظوم کرانے میں مسٹر جانسن کا بڑا حصہ ہے کیونکہ اس داستان کو اردو میں سب سے پہلے محبت خاں ہی نے نظم کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس مثنوی کو منظوم کرنے سے قبل محبت نے دیگر مثنویوں کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو بھی مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ قطب شاہی سلطنت بھی عادل شاہی کی طرح پورے سو سال قائم رہی اور شعراء کی سرپرستی کرتی رہی[1] اس عہد کے مشہور و معروف شاعر محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، جنیدی، فائز و ہاشمی وغیرہ اپنی مثنویوں کی وجہ سے زندہ رہے ان کی مشہور مثنویاں محبت خاں کے سامنے رہی ہوں گی لہٰذا اس کا انداز بھی دکنی انداز داستان گوئی سے ملتا جلتا ہے اور اس مثنوی میں یہ انداز برا بھی نہیں معلوم ہوتا۔

شروع داستان در تعریف ملک جھنگ سیال[2]

ہم اس سے قبل گذشتہ صفحات میں اس قصّے کے سیدھے پلاٹ کو تحریر کرچکے ہیں۔ اس کہانی میں کہیں جھنگ سیال کا نام نہیں آیا لیکن "اسرار محبت" کے مطبوعہ نسخے میں یہ عنوان قائم کیا گیا ہے جبکہ قلمی نسخے میں عنوان تو اس قسم کا نہیں ہے لیکن ایسے اشعار ضرور موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سسی جھنگ سیال کے اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو ہیر کا خاندان تھا۔ اس مثنوی کی کہانی میں یہیں بنیادی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

۱؎ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: "اردو کی منظوم داستانیں" طبع اوّل، کراچی انجمن ترقی اردو ۱۹۷۱ء ص ۱۰۸۔

۲؎ مطبوعہ نسخہ میں یہ عنوان قائم کیا گیا ہے جبکہ قلمی نسخہ میں یہ عنوان نہیں ہے البتہ جھنگ سیال کے بارے میں اشعار موجود ہیں

؎ عجائب اس کہانی کا ہے مذکور ۔ کہ ہے گا جنگ سیال[1] اک ملک مشہور

بنایا حق نے ایسا اس مکاں کو ۔ کہ جس پر رشک ہے باغ جناں کو

نہ دیکھا کوئی گھر ایسا کہ ذات داں ۔ نہ ہرا تا ہو بہار حسن خوباں

غرض وہ عشق خیز ایسی زمیں ہے ۔ کوئی واں عشق سے خالی نہیں ہے

محمد میاں تھا وہاں اک خانۂ عشق ۔ سب اس کے گھر ہوئے دیوانۂ عشق

آغاز داستان در تعریف حسن سسی میگوید[2]

در شروع داستان[3]

؎ شروع داستاں اب یاں سے کیجیے ۔ نہایت طول قصے کو نہ دیجے

کہ تھی اک ہیر اس گھر میں پری زاد ۔ ہوئی تھی عشق میں رانجھے کے ناشاد

اسی کی غیرت گل اک بھتیجی ۔ کہ جس کا نام تھا[4] مشہور سسی

ملک جنگ سیال کی تعریف اور آغاز داستان کے عنوانات میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس داستان کی ہیروئن پنجاب سے تعلق رکھتی ہے[5]۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری "

---

[1] "اسرار محبت" میں سسی کو بلاد پنجاب سے متعلق بتایا گیا ہے جبکہ سندھی پلاٹ میں اس طرف اشارہ ضرور ہے کہ سسی کسی دوسرے مقام سے ایک صندوق میں بہتی ہوئی سندھ کے علاقے بھنبھور میں پہنچی تھی۔

[2] قلمی نسخہ کا عنوان جس میں ۷۶ اشعار میں سسی کے حسن کی تعریف اور سراپا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے

[3] مطبوعہ نسخہ کا عنوان

[4] مطبوعہ نسخے میں "ہے" تحریر ہے

[5] سندھی داستان میں بھا نبھر نہر کے کنارے بسنے والے ایک برہمن کی بیٹی تھی جس کو اس کے باپ نے اس لیے ایک صندوق میں بند کر کے نہر میں بہا دیا تھا کہ نجومیوں کے مطابق جب یہ جوان ہوگی تو مسلمان سے شادی کرے گی۔

اسرارِ محبت پر تنقیدی تبصرہ اس طرح کرتے ہیں۔

"سسی پنوں اور ہیر رانجھا کے قصوں میں اتنا تعلق ہے کہ سسی ہیر کی بھتیجی تھی اور حسن و جمال میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی ہیر کو رانجھا نامی ایک جوان رعنا سے عشق تھا اور اس لحاظ سے ہیر اور سسی ایک ہی آگ میں جل رہی تھیں اسی لیے محبت لکھتے ہیں۔

ع خصوصاً تھا وہاں اک خانۂ عشق ۔ سب اس کے گھر کے ہوں دیوانۂ عشق

مگر آخر یہ قصہ کہاں کا ہے، مثنوی کے زیر تبصرہ مطبوعہ نسخہ میں کسی شہر یا ملک کا نام نہیں ہے[1] لیکن دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام سندھ میں تھا اور بھن پور کہلاتا تھا فضل حق صاحب نے بلوچی زبان سے اس قصہ کی جو روایت درج کی ہے اس میں اس شہر کا یہی نام دیا ہے۔ ممکن ہے پروفیسر رضوی صاحب کے پاس "اسرارِ محبت" کا جو قلمی نسخہ ہے اس میں ملک اور شہر کا تعین موجود ہے اور اس بنا پر وہ اس ملک کو "جھنگ سیال"[2] بتاتے ہوں خیر وہ کوئی سرزمین اور کوئی شہر رہا ہو، محبت اس کا تعارف یوں کراتے ہیں"۔

ع عجب صورت کی وہ بستی تھی دلکش ۔ کہ جس کو دیکھیے واں تھی پری وش

نہ دیکھا کوئی گھر ایسا کہ نت واں ۔ نہ پھرتا ہو حسینِ بکر خوباں

---

[1] مطبوعہ یا قلمی نسخہ میں سسی کو جھنگ سیال کا ظاہر کیا گیا ہے اور دوسری جانب پنوں بلوچوں کے قافلے کے ساتھ آنے والا نوجوان تھا۔

[2] مغربی پنجاب میں دریائے چناب کے کنارے "جھنگ" ایک شہر اب بھی موجود ہے اسے "جھنگ سیالاں" کے نام سے پکارا جاتا تھا یہاں جاٹوں کا وہ قبیلہ آباد تھا جو سیال کہلاتا تھا ہیر، سیال قبیلے سے تعلق رکھتی تھی ہیر کی سمادھی ابھی تک جھنگ میں موجود ہے۔

دربیان سراپا[۱]

مثنوی اسرارِ محبت میں اس عنوان کے تحت یعنی سسی کا سراپا بیان کرتے ہوئے محبت خاں نے اس دور کے لکھنؤ دبستان کا ایک شاعر ہونے کا ثبوت پیدا کر دیا ہے۔ معاملہ بندی کے جتنے اشعار مثنوی کے اس حصے میں موجود ہیں وہ شاید محبت کے کل اردو دیوان میں بھی نہ ہوں گے۔ گو کہ اس مثنوی میں لکھنؤ کی بے اعتدالی کے اثرات شروع ہی سے ملتے ہیں لیکن سسی کے سراپا کے بیان میں ایک ہی خیال کو بار بار دہرا کر بھرتی کے اشعار شامل ہو گئے ہیں اور حسن کو جتنا ڈھکا چھپا کر بیان کیا جائے اس میں ایک تجسس باقی رہتا ہے لیکن صاف اور واضح الفاظ میں جب پورے بدن کے ایک ایک حصہ کا بیان تحریر کیا جائے تو وہ بیان ابتذال کی زد میں آ جاتا ہے، جو شاعری کے معیار کو گرا دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان اشعار میں تشبیہات و استعارات کی مثالیں موجود ہے جو محبت خاں کی غزلیات کی طرح مرصع ہیں۔ سراپا کے بیان کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں ۔

سراپا کیا لکھوں اس شمع رو کا ۔	کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود ۔	کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود
یہ کافر تھی درخشاں ان میں وہ مانگ ۔	دلِ مجنوں کو جو لیلیٰ سے لے مانگ
گندھی چوٹی نظر اس شکل آوے ۔	کہ جوں مارِ سیاہ لہریں کھاوے
پریشاں رخ پہ یوں زلفیں تھیں بکھر ۔	رگ ابر سیاہ جیسے ہو مہ پر
نگہ بدر فلک کہ اس جبیں پر ۔	یہ بولا کاش میں ہوتا زمیں پہ
یہ خوں ریزی میں تھی ابروئے پرخم ۔	بیک جنبش کرے قتلِ دو عالم

---

[۱] قلمی نسخہ میں یہ عنوان قائم نہیں کیا گیا ہے بلکہ آغاز داستان در توصیف حسن سسی میگوید کے عنوان سے سسی کا حسن اور سراپا پیش کیا گیا ہے

دو گوش ایسے رکھے تھے وہ سمن بو ۔ کہ پکڑیں کان جس کے آگے گل رو

وہ بحرِ حسن جب دریا پہ جاوے ۔ صدف کے منہ میں بھی پانی بھر آوے

کرے مژگاں جھپک کر کچھ جو تقریر ۔ دلوں کے پار ہووے دستۂ تیر

دھڑا دھڑ دل آبدار اس سیم بر کے ۔ کہ سوراخ ان سے ہے دل میں گہر کے

جو تنگی دہن کی گر دیکھ پاوے ۔ تو پھر خجلت سے غنچہ منہ چھپاوے

زباں کھولوں اگر وصفِ زباں پر ۔ سخن ہو جاوے گم میری زباں پر

مثنوی میں جزئیات نگاری و منظر نگاری قدما کا دستور رہا ہے اس طرح مبالغہ آرائی کے خوب خوب مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ قصائد اور مثنوی میں مبالغہ آرائی کوئی غیر معمولی بات نہیں بلکہ پوری فارسی، اردو شاعری مبالغہ آرائی سے بھری پڑی ہے۔ ان اشعار میں بھی شاعر کی جودتِ طبع اور فکر رسا کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اسی عنوان کے تحت آگے چل کر معاملہ بندی اور ابتذال کے زمرے میں کئی اشعار آجاتے ہیں۔

غلط ہے یہ انار ایسے کہاں ہیں ۔ وہ قعرِ حسن کی دو بُرجیاں ہیں

یہ گوری گول اونچی پیاری پیاری ۔ کہ جو دیکھے کرے جی ان پہ واری

بہارِ حسن کو ناز اس کی دے آب ۔ کہ ہے وہ لجۂ خوبی کا گرداب

کروں کیا ظاہر اب وصفِ نہاں کو ۔ حیا کہتی ہے تھانب اپنی زباں کو

مگر زانو پہ تھی ایسی صفائی ۔ کہ جوں آئینہ میں دے منہ دکھائی

مندرجہ بالا اشعار میں ابتذال پایا جاتا ہے لیکن یہ عنوان ہی ایسا تھا جس میں کسی کا سراپا بیان کرنا تھا لہٰذا بعض باتوں سے دامن بچانا مشکل تھا۔ اگر محبت خاں ابتذال سے دامن بچانا چاہتے تو ان کے لئے یہ کام بھی مشکل نہ تھا لیکن مثنوی نگاری کے لوازمات سے کس طرح کنارہ کشی اختیار کی جاتی، یہ جزئیات نگاری تو مثنوی کا

---

(۱) ایضاً ۔ بکٹر

ایک خاص رنگ قائم کرتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ "اسرارِ محبت" دوسری بہت سی عشقیہ مثنویوں کی طرح ایک مثنوی تھی جس کی کہانی کا پلاٹ بھی حسن وعشق کے خمیر سے تیار کیا گیا تھا۔ اس دور میں لکھنؤ کی بے اعتدالیاں عروج پر تھیں وہاں کی طرزِ معاشرت کے بارے میں "ڈاکٹر خان رشید فرماتے ہیں

" پنڈتوں اور برہمنوں کی ہوس رانیوں نے مندروں میں دیوداسیوں کے روپ میں ویشاؤں کو داخل کیا۔ شیو روایات سے فائدہ اٹھا کر اور اپنی خواہش سے ہم آہنگ پا کر سنگ پوجا کو فروغ دیا، درگاہوں اور مذہبی محفلوں میں طوائفیں داخل ہو گئیں ۔۔ یا ترائیں اور ممنوعہ کسبیاں چھا گئیں تکلف اور تصنع کو وہ فروغ ہوا کہ جب امراء کی بہو بیٹیاں، طوائفوں اور کسبیوں کی محفلوں سے خوگر مردوں کے ذوق کی تسکین نہ کر سکیں تو آدابِ مجلس، اندازِ گفتگو اور ناز و غمزوں کی تعلیم کے لیے ان کی ایک خاص عمر تک طوائفوں کے کوٹھوں پر رکھا جاتا" ـــــ ان عوامل نے بتدریج لکھنؤ کی معاشرت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

ذکر نمودن شخصے یا المشافہ کسی کہ در باغ تو اک قافلہ بلوچاں وارد شست [1]

در بیان محبت [2]

اب یہاں سے باقاعدہ قصہ کی جانب گریز کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ عنوان اسی انداز کا ہے جو اس سے قبل بھی قائم کر چکے ہیں، اس عنوان کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

بیاں کرتا ہوں اب ذکرِ محبت	کہ تھی ہم قوم اس کی ایک عورت
تھا اس نے کی اک دن یہ گفتار	کہ تیرے باغ میں اک رشکِ گلزار

---

[1] قلمی نسخہ میں یہ عنوان ہے

[2] مطبوعہ نسخہ میں یہ عنوان قائم کیا گیا ہے

؎ عجب اک قافلہ اترا ہے رنگیں ۔ کہ رکھتا ہے متاعِ حسن تمکیں سے[1]

سسی کی ایک ہم قوم عورت نے سسی کو اک دن بتایا کہ بلوچوں کا ایک قافلہ تیرے باغ میں اترا ہے اس قافلے کا ہر فرد نوجوان و حسین ہے۔ سسی نے یہ سنا تو وہ سیج دھج کر وہاں پہنچی۔

؎ یہ سنتے ہی سخن وہ غیرتِ گل ۔ چلی گھر سے چمن کو با تحمل

دربیان تعریف باغ مینو بہار[2]

اس بیان میں محبت نے باغ کا نقشہ کھینچا ہے اور اس کی تعریف میں زمین و آسماں کے قلابے ملا دیئے ہیں مبالغہ آرائی اور لفاظی سے اس عنوان کو سجایا ہے، کہانی آگے بڑھتی ہے باغ کی تعریف دیکھیے۔

؎ بصد ناز و ادا پہنچی وہ تا باغ ۔ عجب رنگین وہ اس گل کا تھا باغ

؎ وہاں پھولے تھے یوں گلہائے بستاں ۔ کہ تھے خجلت زدہ رخسارِ خوباں

؎ ہر اک سنبل کا ایسا پیچ تھا خوب ۔ کہ بل بل جائے جس پر زلفِ محبوب

؎ بصد خوبی بہار اس جا عیاں ہے ۔ زمین باغ رشکِ آسماں ہے

؎ بھرا نہروں میں تھا ایسا ہی پانی ۔ کہ گویا تھا وہ آبِ زندگانی

؎ کسی جانب کو پھولوں کی مہک تھی ۔ کسی جانب کو سبزے کی لہک تھی

؎ جہاں میں باغ ایسا کوئی کم ہے ۔ نمونہ جس کا اک باغِ ارم ہے

---

[1] مطبوعہ نسخہ میں "رنگیں" تحریر ہے جو درست نہیں معلوم ہوتا

[2] مطبوعہ نسخہ میں یہی عنوان قائم کیا گیا ہے

مندرجہ بالا اشعار میں سادگی و روانی دیکھیئے تو پتہ چلتا ہے کہ محبت خاں ایک زود گو اور کہنہ مشق شاعر ہیں جنہیں منظر نگاری میں بھی کمال حاصل ہے جس عنوان کو بیان کرتے ہیں، تخیل ان کے زیر قلم اپنی خوب خوب جولانی دکھاتا ہے ۔

در بیان تعریف حسن پنو میگوید[1]

سسی کے حسن کی تعریف کے بعد محبت خاں نے پنوں کے حسن کی تعریف میں بھی اپنا زور بیان صرف کیا ہے کیونکہ ظاہر یہ کرنا مقصود تھا کہ سسی کوئی معمولی معاشقہ نہیں تھا کہ جس کا عاشق کوئی عام شخص ہوتا، پنوں ایک معیاری حسینہ کی تلاش میں تھا تو سسی کا بھی کوئی آئیڈیل ضرور تھا اسی لیئے تو وہ ایک نظر دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئی تھی ۔

پنوں کا سراپا پیش کرتے ہوئے محبت خاں فرماتے ہیں ۔

جواں ایسا کہ گر دیکھیں سراپا ۔ تو گل دستہ وہ باغ حسن کا تھا
عرق آلودہ چہرے کا یہ عالم ۔ کہ جیسے گل پہ ہوں قطرات شبنم
یہ کیسی انکھڑیاں تھیں پر خماری ۔ کہ نرگس جس سے کھینچے شرمساری
کریں ابرو جو اس کی تیغ زانی[2] ۔ تو پھر مانگے نہ مارا اس کا پانی
وہ مشتاقوں میں تھا یوں تو ہزار ایک ۔ کہ جیوں بیمار سو ہوں اور انار ایک
خراماں ہو جدھر وہ ماہ سیما ۔ تو ہو ہر ہر قدم پر حشر برپا

---

[1] قلمی نسخہ میں یہ عنوان ہے جبکہ مطبوعہ نسخہ میں "در بیان تعریف باغ مینو لیمرد" کے عنوان میں ہی پنوں کا سراپا اور اس کے حسن کی تعریف کی گئی ہے ۔

[2] تیغ زنی سے مراد ہے ۔

نگاہوں کے کہیں چل جائیں بھالے ۔ اداؤں میں کسی کو مار ڈالے

کوئی تھا کشتۂ ناز و تغافل ۔ کوئی عاشق تھا پامالِ تجمل

بلائے جانِ عاشق تھا وہ مہ رو ۔ کوئی آفت کا پرکالہ تھا پنو

وہ زلف و چشم و ابرو قد و قامت ۔ بلا و فتنہ و آفت قیامت

روزمرہ محاورہ اور نکاتِ سخن کا پرزور اظہار ان اشعار میں پایا جاتا ہے پنوں کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے بھی اشعار میں وہی روانی اور پختگی ہے جو سسی کے سراپے میں موجود تھی۔ محولہ بالا اشعار کے آخری شعر کو دیکھیئے اور صنعت "لف و نشر مرتب" کی داد دیجیئے۔ زلف کو بلا، چشم کو فتنہ۔ ابرو کو آفت اور قد و قامت کو قیامت قرار دیا ہے ؎ وہ زلف و چشم و ابرو قد و قامت

بلا و فتنہ و آفت قیامت

پنوں کے حسن کی تعریف کو آخر میں اس انداز سے معتبر بناتے ہیں کہ نکتہ آفرینی کے ساتھ ساتھ ہم کو محبت خان کی بات اور اس کا جواز سن کر انکار کرنے یا پنوں کے حسن سے انحراف کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

؎ غرض صورت یہ تھی اس دلربا کی ۔ نمایاں جس سے تھی قدرت خدا کی

شاعری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اپنی بات کو منوانے کے لیئے یا تو خود شاعر اشعار کے ذریعے جواز پیدا کر دے یا پھر خود قاری اس کی بات کو تسلیم کرتا چلا جائے کیوں کہ قاری اتنی سمجھ ضرور رکھتا ہے کہ کون سی بات درست ہے اور کون سی بات بعید از عقل ہے لہٰذا خدا کی قدرت میں کیا بعید ہے۔

دربیان نظر افتادن سسّی بر پنّو مینویسد[1]

جب اس دشتِ پری پر تک نظر کی ۔ تو پھر جائے نظروں سے تہ سر کی

یکایک وہ ہوئی یہ محوِ دیدار ۔ کہ جنبش ہوگئی مژگاں کو دشوار

وہ گلشن کا تماشا سب بھلایا ۔ فلک نے اور بھی اک گل کھلایا

دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے اور چاہتے تھے کہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہیں شرابِ دیدار میں اس قدر محو ہوئے کہ پنوں نے اپنے دل کی بات کہہ دی ۔

بس اب بہتر ہے گر تو مانے یہ بات ۔ گزاریں عشرتوں سے باہم اک رات

خدا جانے فلک پھر کب ملا وے ۔ بھلا حسرت یہ دل میں رہ نہ جاوے

اس کے بعد سسّی بظاہر ناراضگی کا اظہار کرتی ہے گو آخر نے اس سسّی کو سمجھا کیا ہے ۔ سسّی کہتی ہے

یہ تو نے مجھ سے کی تقریر کیسی ۔ ہمارے ملک میں نہیں رسم ایسی

جو پاوے فسق سے آلودگی عشق ۔ ہے اس ملک وفا میں عشق یہ فسق

اور پھر فوراً ہی پنوں اپنی بات کی تردید کرتا ہے اور اپنے آپ کو مجبور ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے

یہ بولا سن کے وہ اے غیرتِ حور ۔ نہیں یہ بات تو مجھ کو بھی منظور

مگر میں رہ نہیں سکتا کروں کیا ۔ ہم آغوشی کو جی چاہتا ہے میرا[2]

بھلا ایسی میسّر ایک شب ہو ۔ کہ ہو سینہ بہ سینہ لب بہ لب ہو

گزر جائے مزے سے رات ساری ۔ بس اتنی سی تمنّا ہے ہماری

---

[1] نسخۂ مطبوعہ میں یہ عنوان قائم نہیں کیا گیا ہے بلکہ "در تعریفِ باغ" میں یہ اشعار آجاتے ہیں ۔

[2] نہیں پڑھا جائے گا تو شعر کا وزن بڑھ جائے گا ۔

[3] سندھی اشعار میں جو کہ مختلف مثنوی نگاروں کے تخلیق کردہ ہیں یہ بات نہیں ملتی بلکہ سندھی پلاٹ میں پنوں اور سسّی کی شادی جلد ہو جاتی ہے یعنی صرف پنوں کی آزمائش کے بعد ۔

پنوں نے دیکھیے کتنی تھوڑی سی تمنا اور آرزو ظاہر کی ہے۔ اور پھر پنوں کی یہ تقریر سن کر سستی بھی اس بات پر راضی ہوگئی اور یہ وعدہ کرکے چلی گئی کہ رات کے وقت اپنے گھر کے افراد سے چھپ کر آئے گی ۔ وعدہ کے مطابق سستی اپنے محبوب سے ملنے پہنچ گئی، رات بھر جاگتے اور ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے رہے ۔ اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے محبت خاں نے جو رنگ اشعار میں بھرا ہے وہ بلا شک وشبہ دبستان لکھنؤ کی نمائندگی کرتا ہے ، معاملہ بندی اور ابتذال کے اس بہاوے میں انشاء، جرأت، حسرت کی طرح محبت خاں بھی بہہ گئے ، ایک دن کی ملاقات کو چند اشعار میں ختم کیا جاسکتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے محبت خاں کو پھر اس قسم کی منظر کشی کرنے کا موقع نہ ملتا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہی سنہری موقع تھا جس میں محبت خاں اپنے قلم کی جولانی دکھا سکتے تھے ۔

کہوں کیا کس مزے سے تھی ملاقات ۔	میسر کس کے تئیں ہوتی ہے یہ رات
کبھی تھا وہ بلا گردان اس کے ۔	کبھی ہوتا تھا وہ قربان اس کے
کبھی تو دیکھتے صورت سے خاموش ۔	کبھی ہوتے تھے آپس میں ہم آغوش
کبھی ہاتھ اس کا وہ سینے پہ لاتی ۔	اور اپنے دل کی بے تابی دکھاتی
کبھی پھر ہو کے ان باتوں سے غافل ۔	لبوں سے کام دل کرتی تھی حاصل
رہی یہ نصف شب تک ان میں صحبت ۔	کرتے سو سو طرح سے عیش وعشرت
ہم آغوشی سے جب آرام پایا ۔	یکایک خواب راحت ان کو آیا
باہم چسپیدہ تھے اس رنگ خاموش ۔	دو تصویریں کھنچیں جیسے ہم آغوش

اس منظر کشی کے بعد اور کون سی بات ایسی رہ جاتی ہے جو انسان کی جنسی بے راہ روی سے قریب نہ ہو اور ادب کو بے ادب نہ بناتی ہو لیکن عشقیہ داستانیں پھر بھی اپنی جگہ قائم ودائم رہتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ داستانیں محبت کے جذبہ سے شروع ہوتی ہیں اور اسی جذبے پر ختم ہوتی ہیں ۔ ایک مشاق شاعر داستان کی جزئیات

سے گزر کر عبارت سے الفاظ کو اپنے تابع بناتا ہے اور کہانی کا ایک رنگ قائم کرتا ہے۔
کہانی کا عروج شروع ہوتا ہے اور ایک ٹریجڈی سامنے آتی ہے وصل کے بعد ہجر کا موسم آتا ہے اور قافلے والے یہ دیکھتے ہیں کہ پنوں اور سسی تمام رات ہم آغوش رہے ہیں تو وہ اس خوف سے کہ مبادا سسی کا کوئی عزیز رشتہ دار ان کو اس حالت میں نہ دیکھ لے، پنوں کو خواب غفلت میں ہی اونٹوں پر بٹھا کر کیچ کی جانب لے جاتے ہیں۔[1]

در بیان جدا شدن پنو از سسی و دیوانہ شدن سسی در فراق

پنو مینو یسد[2]

جدا سسی سے پنوں یوں ہوا ہائے ۔ کہ جیسے جان ہو تن سے جدا ہائے

شرابِ عشق سے تھی وہ بھی سرشار ۔ نہ ہوئی وہ اس ماجرے سے کچھ خبردار

رہی سوتی ہی غافل یاں یہ بچھڑ ر ۔ ہوا افسوس پہنچا قافلہ دور

نہ دیکھا اس نے جو بر میں وہ دلبر ۔ عجب صورت سے تھی حیران و ششدر

یہی رہ رہ کے آتا تھا پریکھا ۔ یہ تھا کچھ واقعی یا خواب دیکھا

ہوا خونِ جگر آنکھوں سے جاری ۔ لگا دل بر میں کرنے بے قراری

نظر کر پیش و پس ادھر ادھر کو ۔ لگی رونے وہ دھر زانو پہ سر کو

نہ بن آئی تھی واں اس کو کوئی بات ۔ پھر آخر دل میں ٹھہرائی یہی بات

گریباں پھاڑ منہ سے خاک ملیے ۔ گیا ہے وہ جدھر ادھر کو چلیے

---

[1] "اسرارِ محبت" میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ قافلے والے پنوں کو سوتے ہوئے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں جبکہ مثنوی کے سندھی پلاٹ میں یہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ سسی کی شادی پنوں سے ہو جاتی ہے اور وہ یہیں یعنی بھنبھور میں رہنے لگتا ہے ادھر بلوچستان (کیچ) میں پنوں کا باپ آری جام جو کہ پنوں سے بہت محبت کرتا تھا بے چین ہو جاتا ہے اور پنوں کے دوسرے چند بھائیوں کو بھیجتا ہے اور وہ بے ہوشی کے عالم میں شراب پلا کر اونٹوں پر بٹھا کر کیچ لے آتے ہیں۔

[2] مطبوعہ نسخہ میں یہ عنوان نہیں ہے "در تعریف باغ" ہی میں یہ اشعار موجود ہیں۔

نہ ہوئے پاس گردہ یار جانی ۔ تو ہے کس کام ایسی زندگانی

پنوں کی جدائی میں سسی کا جو حال ہوا اس کی منظر کشی مولہ بالا اشعار میں کی گئی ہے۔ سسی پنوں کے تعاقب میں دیوانہ وار روتی ہے، اس کا رخ اسی جانب ~~جس جانب~~ قافلہ روانہ ہوا تھا۔ سسی برہنہ پا اور ننگے سر وارفتگی کے عالم میں اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں قافلہ کے نقش قدم پر رواں دواں ہوئی۔ اس کے لبوں پر یہ غزل تھی [1]

بس اپنا کچھ نہیں اب آہ چلتا ۔ کہ دل کو لے گیا اک راہ چلتا

سمجھتا تو بھی تھی اک راہ کی بات ۔ کہ مجھ کو بھی لیے ہمراہ چلتا

چھ اشعار کی اس غزل کے بعد مثنوی [2] کے نام سے پھر وہی رنج والم کی داستان شروع ہوتی ہے

یہ پھر پھر پٹیتی تھی سر وہ اپنا ۔ رکھا تھا ہاتھ لا کے دل پر اپنا

یہ آہیں کھینچتی تھی وہ ستم کش ۔ کہ لگ اٹھتی تھی صحرا کو بھی آتش

ہوا غالب جو ضعف اس نازنیں پر ۔ گرایا ناتوانی نے زمیں پر

سمجھ کر بستر اپنا صفحۂ خاک ۔ برنگِ نقش پا بیٹھی وہ غمناک

اپنے محبوب کی تلاش میں جنگل بیاباں میں چلتے چلتے نحیف و کمزور ہو گئی لیکن اس کا جذبہ اور ذوقِ سفر اس کی ہمت افزائی کرتا رہا۔ سسی کے اس حال زار کی خبر اس کے ماں باپ کو بھی ہو جاتی ہے اور وہ روتے پیٹتے جنگل کی طرف دوڑتے ہیں اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتے رہے بڑی مشکل سے اس کے عزیز و اقارب اسے یہ کہہ کر اٹھا لاتے ہیں کہ اس دنیا میں تجھے پنوں سے

---

[1] سندھی داستان میں وہ درختوں سے سوال جواب کرتی چلی جاتی تھی۔

[2] مطبوعہ نسخہ میں "درمیان غزل گوید" کے بعد سسی کا کیچ کی جانب سفر طے کرنے کے بارے میں تفصیل بیان کی گئی ہے

[3] سندھی بیلاڈ میں سسی کو اس کے عزیز واقارب واپس نہیں لاتے ہیں اور وہ پہلی بار جب پنوں کی تلاش میں نکلتی ہے تو واپس نہیں لوٹتی۔

اچھے اور خوبصورت شخص ملے گا اور اگر اسے تجھ سے اتنی الفت ہوتی تو وہ کس طرح تجھے تنہا چھوڑ کر چلا جاتا لیکن ستسی ان کی باتوں میں نہیں آتی ۔

اس کے عزیز اسے گھر لانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن گھر پہنچنے پر اس کی وحشت میں اور اضافہ ہو گیا ۔

خدا کے واسطے تم یاں سے جاؤ ۔ میرا مت دھیان ادھر سے ہٹاؤ

بہا کر اشکِ خونیں چشمِ تر سے ۔ پٹکتی تھی وہ سر دیوار و در سے

یہی کہتی تھی مل مل دستِ افسوس ۔ کیا ہے کیوں مجھے یاں لاکے محبوس

کبھی تو بسترِ غم پر بلکتا ۔ کبھی بالیں پہ سر دے دے پٹکتا

فلک پر دیکھ کر تارے چمکتے ۔ جگر پر اس کے انگارے دہکتے

ستسی اپنے محبوب کی یاد میں اس قدر تڑپی کہ وہ مرنے کی دعا مانگنے لگی کیونکہ یہ دنیا اب اس کے لئے انگاروں پر لوٹنے کے برابر تھی اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے ۔ کبھی اس پر دیوانگی کا عالم طاری ہو جاتا اور وہ اس بدحواسی کے عالم میں گھر سے نکل جاتی اس کے اہلِ خانہ اسے گھیر کر پھر واپس لاتے ۔

نظر کر چار سو پھر ہو کے مایوس ۔ لگی ملنے وہ اپنے دستِ افسوس [۱]

ہوئے رخسارۂ گل گوں وہ ایسے ۔ کہ منہ پر مردنی پھر جائے جیسے

ان اشعار میں محبت خان نے ستسی کی زبانی غم و الم کی جو کیفیات اور واردات بیان کی ہیں ان میں روانی اور سلاست موجود ہے اور یہ قدرتِ بیان کی دلیل ہے ۔

---

[۱] دستِ افسوس ملنا درست نہیں بلکہ "کفِ افسوس ملنا" درست ہے ۔

[۲] مردنی چھا جانا ۔

عشقیہ داستانوں میں یہ امر بعید نہیں کہ عاشق و معشوق دونوں بڑی سے بڑی رکاوٹ دور کر کے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کا راستہ دنیا کی کوئی مشکل نہیں روک سکتی لہٰذا دوسری عشقیہ داستانوں کی طرح سسّی بھی ایسی ہی ہیروئن ہے جو آگ کے سمندر سے گزر کر بھی پنوں سے ملنا چاہتی ہے ۔

کبھی صحرا میں کرنا شور و افغاں ۔ کبھی جا روندتی خارِ مغیلاں

کبھی پھیلا کے دونوں پاؤں اک بار ۔ زمیں پر بیٹھ جاتی ہو کے ناچار

پھر پنوں سے شکوہ کرتے ہوئے کہتی ہے ۔

مجھے آوارہ کر کے اے پری رُو ۔ پھنسا کیا واں کسی کی زلف میں تو

کھبا کس کا یہ دل میں قد و قامت ۔ ہوئی برپا جو یاں مجھ پر قیامت

تجھے کافر ادا کس کی خوش آئی ۔ جو تونے مجھ سے کی یوں کج ادائی

تبسم تجھ کو واں کس کا خوش آیا ۔ کہ تونے مجھ کو یاں ایسا رلایا

کسی سے کیا ہوئی ہے تیری شادی ۔ کہ مجھ غمناک کی سدھ بدھ بھلا دی

پڑا کس بد شکر سے کام تجھ کو ۔ ہوئی جو زندگی یا تلخ مجھ کو

محولہ بالا اشعار میں بڑی ہوشیاری سے ہندی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں مثلاً سدھ بدھ ، کھبا وغیرہ اور صنعتِ تضاد کا بھی خوب استعمال کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ سسّی پنوں کی زبان سے ادا ہونے والی باتیں اس انداز سے بیان ہوئی ہیں کہ جیسے محبت خاں ان دونوں کرداروں میں ڈوب کر کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار حقیقت نگاری سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں حالانکہ ان داستانوں میں بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور بعض کو واقعہ نگاری اور منظر نگاری کرتے وقت نمک مرچ لگانا پڑتا ہے لیکن دراصل داستان گوئی میں یہ سب لوازمات شامل ہوتے ہیں ۔

بہرحال کہانی آگے بڑھتی ہے سسّی کی حالتِ زار دیکھ کر اس کے اہلِ خانہ آپس میں مشورہ کرتے

ہیں اور سسی کو بتاتے ہیں کہ ہم پنوں کی تلاش میں جاتے ہیں اور اسے ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ تیرا عقد کریں گے لیکن شرط یہ ہے کہ تو اپنی حالت تبدیل کر اور اس طرح گھر سے نکلنا چھوڑ دے اور گوشہ نشین ہو جا۔ اسی دوران چند افراد کو پنوں کی تلاش میں بھیجا گیا لیکن وہ نامراد واپس آئے۔ ان لوگوں نے سسی کو آگاہ نہیں کیا بلکہ یوں کہا کہ ہم نے پنوں کے ملک کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں اب ہم بہت جلد وہاں روانہ ہوں گے اور جلد ہی تم اپنے محبوب سے ملو گی وہ اسے تسلی تشفی دیتے رہے۔

؎ خدا کے فضل سے ہے عنقریب اب ۔ کہ تجھ سے آ ملے تیرا حبیب اب

لیکن سسی کے دل کو سکون کہاں تھا اس کے دل کی بے چینی یہ ظاہر کرتی تھی کہ اسے اپنے محبوب کو خود تلاش کرنا پڑے گا کیونکہ اپنے عزیزوں کی باتوں میں آکر وہ اپنی راہ کھوٹی کر رہی ہے اور پھر وہ فوراً ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

؎ تو بحرِ عشق نے پھر جوش مارا ۔ چلی صحرا کو کر سب سے کنارا

اس شعر کے بعد محبت خاں پھر سسی کی کیفیت بیان کرنے میں جو اشعار کہتے ہیں وہ اضافی معلوم ہوتے ہیں مثلاً ؎ اسے جب کوئی کچھ سمجھانے آتا
تو یہ روتی کہ بس جی ڈوب جاتا

اس کے بعد پھر یہ شعر انہیں کہنا پڑتا ہے ؎ پڑا تھا اس کے سر پر تو خرابا
نکل بھاگی وہ گھر سے بے محابا

غزل :۔ درمیان میں پھر محبت خاں نے ایک غزل سسی کی زبان سے کہلوائی ہے۔

؎ کہیں اپنا تیرے بن کس سے ہم درد ۔ نہ کوئی ہم نشیں ہے یاں نہ ہم درد
؎ نہیں اب آہ دم لینے کا مقدور ۔ اٹھے ہے دل میں ایسا دمبدم درد
؎ نہ آیا تو وہیں جاؤں گی شاید ۔ لیے ہستی سے تیرا تا عدم درد

اس کے بعد پھر "مثنوی" کے عنوان سے داستان کو آگے بڑھاتے ہیں، اس عنوان

سے مراد یہ ہے کہ غزل اختتام کو پہنچی اب اصل قصے کی طرف پھر آتے ہیں اور پھر وہی آہ وزاری پھر وہی مصائب و آلام کے پہاڑ جیسے سستی پہ ٹوٹ گئے ہوں۔

> کبھی کہتی تھی یہ کیسی تباہی ۔ پڑی ہے میرے سر پہ یاالٰہی

آمدن مادر و پدر سسی در تلاش و گفتن ایشاں سخناں تسلی آمیز بوے[1]

> پدر و مادر جگر خستہ دل افگار ۔ تجسس کرتے آئے دونوں اک بار

سسی کے ماں باپ ایک مرتبہ پھر اسے تسلی دینے کے لیے آئے کہ اسے سمجھا نے بجھانے کی ناکام کوشش کرنے گئے۔ یہ سات اشعار ہے کوئی بھرپور تاثر پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس قبیل کے اشعار بھرپور انداز میں اس سے قبل کہے گئے ہیں لہٰذا ان اشعار کی چنداں ضرورت نہیں تھی صرف پہلا شعر کہہ دینا کافی تھا۔

در بیان آمدن شخصے سیاح نزد سسی و خبر دادن پنوں بوی کہ در فلاں شہر سکونت دارد[2]

آمدن شخصے غریب نزد سسی و خبر دادن بوی کہ پنوں در فلاں ملک سکونت دارد[3]

> کہ ناگاہ اس میں واں اک شخص آیا ۔ وہ گویا مرگ کا پیغام لایا
> کیا مذکور یہ آتے ہی ناگاہ ۔ کہ میں مسکن سے ہوں پنوں کے آگاہ
> دیارِ سندھ[4] میں ہے جلوہ گر وہ[5] ۔ ملا جو چاہے سو جاوے ادھر کو

---

[1] یہ عنوان قلمی نسخہ میں نہیں ہے۔ مثنوی کے عنوان میں غزل کے بعد اس طرح کے اشعار موجود ہیں۔

[2] غیر مطبوعہ نسخہ میں یہ عنوان ہے

[3] مطبوعہ نسخہ میں یہ عنوان اس طرح ہے لیکن کہیں "شخصے غریب" تحریر ہے جب کہ شخصے سیاح زیادہ [redacted] راست معلوم ہوتا ہے۔

[4] ... محبت پنوں کو سندھ کا راشندہ بتاتے ہیں حالانکہ وہ مکران سے تعلق ...

جب سسی کو ایک اجنبی کے بتانے پر یہ معلوم ہوا کہ پنوں سندھ[1] میں رہتا ہے اور اسے اس کا مسکن بھی معلوم ہوا۔ قاصد کے قربان ہو ہو کر خوش ہوتی ہے کہ اس نے ایسی اچھی خبر سنائی ہے کہ اس کی جان میں جان آئی ہے وہ قاصد سے یہ بھی معلوم کرتی ہے کہ پنوں تجھے کیوں کر ملا تھا تو اس کے ملنے کا مذکور بار بار مجھ سے بیان کر۔ پھر اپنے ماں باپ سے وہ کہتی ہے کہ اب اسے یہاں سے جلد از جلد روانہ کردو تاکہ وہ اپنے محبوب سے جتنی جلد ہو سکے ملاقات کرے۔ اس کے ماں باپ اب اس کو پنوں کے پاس بھیجنے کا ارادہ کر لیتے ہیں وہ اسے جلد چند افراد کے ساتھ روانہ کرکے خود دروتے پیٹتے واپس آجاتے ہیں۔

۱؎ محبت نے مثنوی کی بنیاد سنے سنائے قصے پر قائم کی۔ انکے سامنے پنجاب سے متعلق داستان تھی انہوں نے تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی کہ پنوں کا تعلق سندھ سے تھا یا مکران سے۔

رفتن سسی بدیار پنوں و با زندہ بدیار خود رسیدن و هلاک گشتن عاشق و معشوق و زن پنوں[1]

در بیان رفتن سسے بائید وصال پنوں بطرف بلدہ سندھ پنوں در آنجا مسکن داشت[2]

سہ وہ سرگرمِ رہِ دشت تمنا تھی ۔ اجل تھی داہنے بائیں قضا تھی

ولے اس بے خبر کو کیا خبر تھی ۔ طبیعت تھی جدھر اس کی اُدھر تھی

یہ کہتی تھی کہ اب جا کر ملوں گی ۔ گلے دیکھوں تو کیا کیا کچھ کروں گی

یہ سچ ہے درد کو کیا جانے بے درد ۔ نہیں ہوتے کسی کے بے وفا مرد

مجھے تو تم نے دیوانہ بنایا ۔ اور اپنا جا کسی سے دل لگایا

تو پھر یہ سن کے وہ کھا دے گا قسمیں ۔ کہے گا میں بھی تھا گویا قفس میں

سسی کو پنوں سے ملنے جانے کا منظر درپیش ہے ۔ اب ایک محبوبہ کے دل میں جو خیالات آ رہے ہیں وہ حسن و عشق کی نفسیات کے مطابق ہیں ۔ کیونکہ جب راہیں کٹھن ہوتی ہیں تو ان کو آسان کرنے کے لئے تصورات کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ محبت خان نے اس موقع پر سسی کے خیالات اور سوچیں قلم بند کی ہیں وہ ان کی مشاقانہ سوچ اور وسیع تجربہ کا نتیجہ ہیں ۔ ایک محبوبہ اپنے محبوب کی جدائی میں اپنا حالِ دل کس طرح سنا سکتی ہے اور ہمت و حوصلہ کے ساتھ اپنی منزل پانے کے لیے کس طرح روانہ ہوتی ہے ۔

۱۔ مطبوعہ نسخہ کے مطابق عنوان ہے

۲۔ قلمی نسخہ کے مطابق عنوان ہے ۔

"رسیدن سسی در شہر یکہ پنوں در آں شہر مسکنے داشت و فرود آمدنش در محلہ و فرستادن
و نگشتری خود بسوی پنوں بطریق نشان و شنیدن خبر شادی ولی و ہلاک گشتن سسے در آں غم"[1]

در بیان رسیدن سسی در شہر یکہ پنوں مسکن داشت و فرود آمدن در محلہ و فرستادن
انگشتری خود بسوی پنوں بطریق نشانے یعنی برائی یاد داشت[2]
اس عنوان سے داستان کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں سسی پنوں کے شہر میں پہنچ جاتی
ہے اور اپنی انگوٹھی نشان کے طور پر بھیجتی ہے، پنوں کو نشانی ملتی ہے سسی کی نشانی اس
وقت پنوں کو ملتی ہے جب وہ شادی کی خوشیوں میں مگن ہوتا ہے۔

جہاں بزم طرب سے تھا وہ مالوف ۔ سرورِ عشرتِ شادی میں مصروف
اس دوران جبکہ سسی پنوں کو نشانی بھیج کر جواب کا انتظار کرتی ہے کہ ایک شخص آتا
ہے اور سسی کو یہ غم اندوہ خبر سناتا ہے۔
؎ یہ قصہ یاں سے یوں میں نے سنا ہے[3] ۔ عزیزو کیا کہوں مرنے کی جا ہے
؎ یہ بات اک شخص نے اسکو سنا دی ۔ مقرر آج ہے پنوں کی شادی
اور ساتھ ہی ساتھ اس شخص نے یہ بھی بتایا کہ جس عورت سے پنوں کی شادی
ہو رہی ہے اور اس کی ہم قوم ہے اور حسن خداداد رکھتی ہے۔ سسی کا یہ سننا ہوتا
ہے، ادھر وہ سرد آہ کھینچ کر اس دنیا سے سدھار گئی۔ محبت خان کو خود اس بات
کا احساس ہو گیا کہ اب مثنوی طویل ہو چلی ہے اور جبکہ سندھی پلاٹ میں ان باتوں

---

[1] مطبوعہ نسخہ کا عنوان ہے
[2] قلمی نسخہ کا عنوان ہے۔ [3] محبت خاں نے کی بنیاد سنے سنائے قصے پر قائم کی ہے۔

ہوئے خرم نہ باہم عیش کرکے - وصال ان کا ہوا تو آہ کرکے

محبت خان کا زور اس بات پر ہے کہ جس انداز سے دونوں کی موت واقع ہوئی وہ افسوسناک تھی، اس داستان کے "اسرارِ محبت" کے پلاٹ میں جس انداز سے دونوں کی موت واقع ہوئی ہے وہ سندھی پلاٹ سے مختلف ہے[1] ۔سسی پنوں کے عیش و عشرت کا بازار اس داستان کے مطابق ایک مرتبہ تو گرم ہو چکا اور اب محبت خان کے مطابق مرنے سے پہلے ایک موقع فراہم ہوتا۔

وفات یافتن زن پنوں از سمع واقع جانکاہ شوہر خود

پنوں کی شادی جس خوبصورت عورت سے انجام پا چکی تھی، اس نے جب یہ سنا کہ پنوں نے اپنی محبوبہ سسی کے قدموں پر جان نچھاور کر دی تو اس نے بھی ایک سرد آہ کھینچی اور وہ بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی اس نے عاشقوں کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا:-

وہ معروف مہر طرب زری پوش - مئے عشرت سے جو تھی مست و مدہوش

سنا جو یہ بروز کتخدائی[2] - کہ جا کر جان نوشہ نے گنوائی

غرض پہلے تو کچھ کچھ سوچ کرکے - رہی خاموش سر زانو پہ دھر کے

پھر ایسی دل سے کھینچی آہِ پر درد - کہ بس سرتاپا وہ ہوگئی سرد

محبت کے جو کچھ سمجھی وہ عنواں - خدا کے عاشقوں پر اس نے دی جاں

جس طرح "اسرارِ محبت" کی ابتداء ہوئی تھی، اسی طرح محبت خاں نے "محبت" کے

---

[1] مثلاً "تحفۃ الکرام" کے مطابق سسی پنوں کی تلاش میں بھنبھور سے نکلتی ہے اور پنوں "کیچ" سے نکل کھڑا ہوتا ہے اسے راستے میں سسی کی قبر ملتی ہے اس نے دو بیٹے کا بچہ باہر نکلا ہوا دیکھ کر وہ سسی کو پہچانتا ہے اور خود بھی اسی زمین میں سما جاتا ہے۔

[2] کدائی لکھا ہے۔

عنوان سے اشعار اس داستان کے اختتام پر پیش کیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ محبت کی تباہ کاریاں
طالب و مطلوب دونوں کے لیئے یکساں ہیں ۔

محبت ہے محبت کا یہ اسلوب	نہ طالب اس سے بچتا ہے نہ مطلوب
محبت صدمۂ محشر کی آفت	محبت ہی سے ہو جاوے قیامت
سو کر کے نظم یہ کارِ محبت	رکھا نام اس کا اسرارِ محبت
توقع ہے کہ جو اہلِ نظر ہو	محبت سے کرے اس پر نظر وہ
کہی تاریخ یہ اسکی بہ صنعت	عجب قصہ ہے اسرارِ محبت

۱۱۹۷ھ

اسرارِ محبت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس مثنوی میں بھرتی کے اشعار ہیں لیکن انکی تعداد قلیل ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ محبت کے سامنے "سسی پنوں" کی اس داستان کے جزئی واقعات نہیں تھے جو سندھ اور بلوچستان میں مروج داستان میں ہیں ۔ انہوں نے سنے سنائے قصے کو نظم کر دیا لیکن اس کے باوجود ۵۹۲ اشعار کی مثنوی تیار ہو گئی ۔

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کیمطابق :۔

" محبت خاں کے قصے میں تسلسل پیدا کرنے کے لیے ایک واقعہ سے دوسرے واقعے کی طرف شعروں کے ذریعے گریز کیا ہے اور بس ۔ وہ اس موڑ کے لیے یا واقعہ کے لیے کوئی پس منظر تیار نہیں کرتے یہی سبب ہے کہ کہانی سپاٹ معلوم ہوتی ہے اور قاری نفسِ قصہ سے بالکل لطف اندوز نہیں ہوتا ۔ درحقیقت محبت خاں کے پیش نظر سسی پنوں کے قصے کی روایت تھی جو عوام میں مشہور تھی اور اسی تشنہ روایت پر انہوں نے مثنوی تعمیر کر دی ہے " عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر پنجابی قصے کا پلاٹ تھا" ۔ اور یہ پلاٹ بھی سنا سنائے قصے پر تعمیر کیا گیا تھا کیونکہ اصل داستان پنجاب سے تعلق

؎ یہ قصہ نظم کرنے کے لیے مسٹر جانسن نے محبت خان سے کہا تھا لہٰذا انہوں نے اس شعر میں بھی ظاہر کیا ہے کہ محبت خان نے اسے اپنا ہی کام سمجھ کر انجام دیا ۔

نہیں رکھتی ۔

ڈاکٹر لطیف ادیب کی رائے سے متفق نہ ہونے کا کوئی جواز نہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ قصہ کا پلاٹ سنی سنائی کہانی پر قائم کیا گیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ "اسرارِ محبت" کے علاوہ شاید ہی اس کہانی کو کسی اور نے اس غلط انداز سے پیش کیا ہوگا کہ پنوں شادی کر رہا ہے اور اچانک سسی اس جگہ پہنچ جاتی ہے اور جب وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر اس کے پاس جاتا ہے تو اسے مردہ حالت میں پاتا ہے ۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے اسی مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے "اسرارِ محبت" کے تین حصے کیے ہیں

ا۔ سسی کا سراپا ۲۔ پنوں کا سراپا ۳۔ وارداتِ عشق اور اس کا نفسیاتی پس منظر ۔

میں اس میں ایک اضافہ اور کرتا ہوں ۔ وہ ہے "منظر کشی"

دونوں کے سراپے اور وارداتِ عشق کا نفسیاتی پس منظر بیان کرنے میں محبت خان نے زورِ قلم صرف کیا ہے لیکن اس مثنوی میں منظر کشی کو بھی شامل کرنا ہوگا ۔ "در تعریف باغ میگویہ" کے عنوان سے محبت خاں نے قلم کی خوب جولانی دکھائی ہے ۔ سسی کے سراپے پر ستر سٹھ اشعار پیش کیے ہیں ۔ سسی کے حسن اور اوصاف کے بیان میں زورِ بیان موجود ہے موئے سر سے لے کر وصفِ نہاں اور پائے نگاراں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں ۔ ان اشعار میں سلاست روانی موجود ہے اشعار میں اثر آفرینی اس قدر موجود ہے کہ شاید ہی کسی اور مثنوی میں ملے ۔ دوسری جانب سسی کے مقابلے میں پنوں کا سراپا مختصر ہے ۔ مثنوی کا تیسرا حصہ جو وارداتِ حسن و عشق اور اس کے نفسیاتی پس منظر سے موسوم کیا گیا ہے سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے اور یہی فن کی معراج ہے ۔ وارداتِ حسن کو بیان کرنے میں میر کو معراج حاصل تھی اور وہی اس میدان کے شہسوار سمجھے جاتے تھے لیکن محبت خان نے اس مثنوی کو عشق و محبت میں وارداتِ قلبی اور احساسات کا نفسیاتی پہلو اجاگر کیا ہے وہ میر کی مثنوی میں اس انداز سے نہیں ملے گا ۔ جو احساسات اور خدشات ، خوش فہمیاں ، سسی اپنے تصورات و خیالات کے ذریعے ظاہر کرتی ہے وہ عشق و محبت کی نفسیات سے بہت قریب ہیں ۔ مثلاً جب "سسی" پنوں کے پاس جانے کے لیے سفر کر رہی ہے اور اس وقت وہ یہ کہتی ہے کہ اب ملوں گی تو پہلے اس سے

بات نہیں کروں گی ۔ اور پھر اس طرح شکوہ کروں گی اس کی بے وفائیوں اور بے توجہی کو یاد دلاؤں گی وغیرہ۔
وارداتِ عشق کے بیان میں فراق و وصال کے اظہار میں شاعر کی روح کو بھی محسوس کر لیا جاتا ہے کہ وہ خود کس حد تک اس میں ذاتی طور پر ملوث ہو گیا ہے۔ عشق و محبت اور وارداتِ قلبی کی جولانی میں اگر محبت خان کامیاب نہ ہوتے تو مثنوی قابل ذکر توجیہ کی مستحق نہ ہوتی ۔
اس کے بعد مثنوی میں چوتھا حصہ منظر کشی کا ہے ۔ باغ کی تعریف ہو، سسی کا سراپا ہو یا پنوں کا وصال کا منظر ہو، سسی کا غم فراق میں تڑپنا ہو، سسی کا پنوں کے ساتھ کو روانہ ہونا ہو ، یہ سب عنوانات منظر کشی سے خالی نہیں ۔ کرداروں کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھرتی نظر آتی ہیں ہاں اسی منظر کشی کے لیے کہیں کہیں اشعار میں اضافہ کرنا پڑا ہے۔ شروع میں کسی بھی عنوان کے بیان میں جتنی طوالت اختیار کی گئی ہے آخر میں یعنی مثنوی کے اختتام پر اتنا ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ زمانہ دراصل مثنوی کا زمانہ نہیں تھا ۔ شمالی ہند میں محبت خان سے قبل صرف میر تقی میر کی چودہ پندرہ مثنویاں ہیں البتہ دکن کا دبستانِ ادب مثنویات سے مالا مال تھا ۔ لیکن ان کارناموں سے ناواقف نظر آتا ہے۔ اسرارِ محبت کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ محبت خان کے سامنے میر کی مثنویوں کے علاوہ دبستان دکن کی مثنویاں بھی رہی ہوں گی کیونکہ کہیں کہیں وہی رنگ اور وہی زبان نظر آتی ہے جو دکن کی زبان ہے لیکن زیادہ اثر دلی اور لکھنؤ کا غالب ہوتا گیا۔ دراصل اس مثنوی پر کسی ایک دبستان کی چھاپ نہیں لگا سکتے ، پس سسی کے سراپا کے عنوان سے محبت خان نے خوب فائدہ اٹھایا کیونکہ عنوان ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ انہیں لکھنؤ کے دبستان کی نمائندگی کرنے کا پورا پورا موقع فراہم ہو گیا ۔
مجنوں گورکھپوری مثنوی "اسرارِ محبت" پر تبصرہ فرماتے ہوئے "تنقیدی حاشیے" میں رقمطراز ہیں " شاعری میں اس وقت لکھنؤ کی بے اعتدالیاں شروع ہو گئی تھیں ۔ محبت کی بھی مثنوی میں جا بجا اس کے اثرات ملتے ہیں ۔"

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب فرماتے ہیں [1]

"۱۱۹۷ھ میں اس سے بہتر مثنوی ان کے امکان سے خارج تھی، مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ میر نے جہاں اپنی مثنویات کو چھوڑا تھا وہاں سے محبت خاں محبت نے انہیں آگے بڑھایا جن وارداتِ عشق میں موضوعی کیفیت تھی وہ پھیل کر معروضی بنی رنگا رنگ نفسی کیفیات کا اضافہ ہوا۔ اختصار کی جگہ طوالت نے لی اور مثنوی میں ایک آغاز اور انجام کا شعور پیدا ہوا۔ اردو زبان کا بھی یہ ارتقائی زمانہ تھا فارسیت کا غلبہ شدید تھا۔ زبان میں تکلف اور تصنع کے رجحان پیدا ہو چکے تھے۔ شیریں بیانی مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ میر تقی میر اس زمانے میں ایک ستون ایک دیوار ہیں انکے مترنم شیریں اور پر اثر کلام نے اردو زبان میں حلاوت بھر دی اور کتنے ہی شاعروں کو فارسی کا اتباع کرنے کے باوجود نامانوس اور ناہموار ہونے سے بچا لیا۔ میرے خیال میں وہ تمام شاعر جن کی تخلیقی قوت بے پناہ تھی، جو نازک طبع تھے، قناعت پسند تھے یا مختصر الفاظ میں جن کی شخصیت ایک زندہ فنکار کی شخصیت تھی، میر سے متاثر ہوئے کیونکہ ان کی شاعری ان کی بلند شخصیت میں ڈوب کر نکلی تھی، ان کے فن خلوص کا مظاہرہ تھی، پیشہ اور گداگری نہیں تھی شاید اس سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا کہ محبت خان محبت پر میر تقی میر کی چھاپ پڑی تھی۔ انہوں نے جس زبان کو اپنایا وہ میر کی زبان تھی اور اپنے ہم عصروں کے ان رجحانات سے گریز کیا جو دبستان لکھنؤ کی تقلید کر رہے تھے، وہ میر کو وارداتِ قلب کا ذریعہ سمجھتے ہیں اثر انگیزی کو مقدم جانتے ہیں اور تکلف و تصنع کی بجائے خلوص

---

[1] ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب: "العلم" کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۶ ص —

اور سادگی کو اپناتے ہیں محبت خان محبت کی زبان اپنے زمانے کی فصیح اور نمائندہ زبان تھی۔"

مندرجہ بالا تحریر پڑھنے کے بعد محبت خان محبت کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا بھرپور تاثر ابھرتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ زیر بحث مثنوی "اسرارِ محبت" پر تبصرہ کرتے کرتے محبت خان کے اردو دیوان کی جانب نکل گئے حالانکہ اسی تبصرے کی ابتداء میں وہ اس مثنوی کی زبان کو دکن کی زبان قرار دیتے ہیں۔

مثنوی "اسرارِ محبت" پر بحث کرتے ہوئے یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ میرحسن کی مثنوی "سحر البیان" کے شاعر نے "اسرارِ محبت" سے ضرور کسب فیض کیا ہوگا۔ جہاں میرحسن کی سحر البیان میں معاشرتی خاکے، منظر نگاری، نفسیاتی ژرف بینی منظر نگاری اور عشق و محبت کی باریکیوں نے بلند مقام پر پہنچا دیا۔ محبت خان نے ایک مشاق شاعر کی طرح الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑ کر بیش بہا بنا دیا ہے، کسی کسی عنوان میں اشعار کی کثرت مثنوی کو بے جا طوالت کی جانب لے جاتی ہے اور بعض اشعار یقیناً بھرتی کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ اس مثنوی میں جمالیاتی شعور بھی ملتا ہے بعض اشعار میں بلاغت، معنی آفرینی تشبیہات، انتقال ذہنی کی ایمائی کیفیت محبت خان کے فن کی پختگی کو ظاہر کرتی ہے۔

مثنوی کی ایک اور خصوصیت واقعہ نگاری ہے، واقعہ کا بیان اس طرح ہونا چاہیئے کہ نظر کے سامنے تصویر پھر جائے[1] اور جس عہد میں داستان لکھی گئی ہو اور جس علاقے سے اس کا تعلق ہو وہاں کی طرزِ معاشرت، بول چال اور رسم و رواج مثنوی سے عیاں ہوں۔

"اسرارِ محبت" سے اس زمانے کی بول چال کا پہلو تو سامنے آتا ہے لیکن خود محبت خان کو بھی اس زمانے کی سرزمین کا پوری طرح یقین نہ تھا لہٰذا وہ اس علاقے کے رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کو اپنی مثنوی میں پیش نہیں کرسکے۔

---

[1] پروفیسر اے جی نیازی: تنقیدی رس، اشاعت اول، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۵ء ص ۸۱

بَابُ پنجمُ

قصائد در مدح محبت

(۱) قصیدہ جعفر علی حسرت در مدح محبت

قصیدہ عوض علی مدعا شاہجہاں آبادی در مدح محبت

(۲) قصیدہ غلام ہمدانی مصحفی در مدح محبت

(۳) حاصل کلام

قصیدہ جعفر علی حسرت
در مدحِ محبت ۔

اکیاون (۵۱) اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ جعفر علی حسرت استادِ محبت کے دیوانِ اول میں موجود ہے۔[1] کلیات حسرت کی ابتدا نواب شجاع الدولہ کی مدح سے ہوتی ہے۔

ع فکر میں رات پلک سے نہ لگی میری پلک ۔ کہ کوئی ایسا مصور ہی ہے یاں زیر فلک

اسکے بعد نواب آصف الدولہ کی شان میں موجود قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ۔

ع یونہی اگر شگفتہ کہے گی بہار گل ۔ لاوے نہال خشک تلک اب کی بار گل

اس قصیدے کے اختتام کے بعد محبت خاں محبت کی مدح میں "قصیدہ در مدح محبت خاں بہادر" کے عنوان سے قصیدہ شروع ہوتا ہے ۔

اس قصیدے کی شان نزول یہ بتائی جاتی ہے کہ لکھنؤ کے دار السلطنت بننے پر حسرت جب لکھنؤ آئے تو ان کے نواب محبت خاں سے مراسم پیدا ہوئے۔ محبت نے ان کی شاگردی اختیار کی نواب موصوف حسرت سے کچھ مالی سلوک بھی کرتے ہونگے لیکن یہ تعلق باقاعدہ ملازمت کا نہ رہا ہوگا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ۱۱۹۸ھ میں جب محبت خاں لکھنؤ میں موجود تھے، حسرت مرزا جہاندار کی ملازمت اختیار نہ کرتے ۔ آصف الدولہ کی جانب سے جو وظیفہ محبت خاں کو ملتا تھا وہ کچھ عرصہ تک باقاعدگی سے ملتا رہا لیکن جب لکھنؤ کے ریذیڈنٹ جان برسٹو ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور مڈلٹن نے ان کا عہدہ سنبھالا تو لکھنؤ کے اہل کاروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور محبت کی تنخواہ کی ادائیگی میں تساہل کیا جانے لگا ۔ نواب محبت خاں کلکتہ گئے اور گورنر جنرل کے سامنے استغاثہ پیش کیا ۔ حسرت نے یہ قصیدہ اسی زمانے میں لکھا اور نواب محبت خاں کی جدائی میں

---

[1] جعفر علی حسرت: کلیاتِ، مخطوطہ، قومی عجائب گھر، کراچی، ص ۔ ۳۲

جو واردات ان کے دل و ذہن پر گذری اس کا بھرپور اظہار حسرتؔ نے اس قصیدے کے ذریعے کیا ہے۔ اس وقت لارڈ کارن والس صاحب بہادر گورنر جنرل کے عہدے پر فائز تھے[1]
کلیاتِ حسرتؔ ۱۱۹۰ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان مکمل ہوا[2]۔ لہٰذا کلیاتِ حسرتؔ میں نمایاں طور پر اس قصیدے کو دیکھا جا سکتا ہے۔

گذشتہ ابواب میں اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ نواب محبت خاں صاحب بہ اجازت سرکار انگریز نواب اودھ برائے چند روزہ ملک روہیل کھنڈ جانے کی طلب کر کے روانہ جانب بریلی ہوئے، اس طرح کلکتہ اور بریلی کے سفر اور قیام کے دوران چند بہتے لکھنؤ سے دور ضرور رہے لہٰذا حسرتؔ نے یہ قصیدہ اسی دوران تحریر کیا۔ قصیدے کا مطلع ہے[3]:-

اے صبا یار کے کوچے سے جو تو لائی بو ۔ تو فدا تجھ پہ ہوں پیغام مرا لے جا تو

تشبیب میں بہاریہ، حالیہ، اور فخر و کمالِ ممدوح دونوں انداز پائے جاتے ہیں اور حسرتؔ نے الفاظ کی صنعت گری کا اتنا زور نہیں دیا ہے البتہ مضمون اور معنی آفرینی پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

کہ سن اے شاہِ گل و گلشنِ الطاف و کرم ۔ ہے ارم ان کو میسر ہے جنہیں تیرا کو
جب سے حسرتؔ کو فلک نے کیا گلشن سے تیرے ۔ داغِ حسرتؔ سے دل اس کا ہے جا ہے کجو
بلبلِ زار چمن اور گلستاں کا فراق ۔ ہائے پھر کیوں نہ وہ غمگین پھرے نالاں ہر سو
قمری و سرو میں موقع ہے جدائی جی کہیں ۔ کیوں نہ پھر یاد میں اس کو کے وہ بولے کوکو
اس کی فریاد جو سنتا ہے سو بھرتا ہے آہ ۔ اس کے رونے سے ہر اک چشم کے نکلے آنسو
گریہ و نالہ سوا اس کو نہیں ہے سروکار ۔ گاہ رخ آنکھوں میں ہے گاہ وہ قدِ دل جو

پھر کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے اپنے ممدوح کی کی تعریف کرتے ہیں، خود کو ذرہ اور محبت کو مہرِ درخشاں

1۔ محمد سلیمان خاں اشد نبیرۂ محبت: "نقشِ سلیمانی"، مطبع محمدی، ٹونک، ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۶ء۔ ص 119
2۔ کلیات کے آخر میں تحریر ہے "خبر کند تو بہ کوشش ازیں رباعی تاریخ برمی آمد ۱۱۹۲ھ
تاریخ یہی ہے اس میرے دیوان کی ۔ کل طے یہ ہوا تمام باب صنعت
3۔ مطلع میں عربی قصائد کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ مطلع ۱۱۹۲ھ لکھا ہے۔ اس لحاظ سے اس قصیدے کا مطلع کچھ

قصیدہ میں مبالغہ آرائی ایرانی شعراء نے خاص طور پر اختیار کی جبکہ اردو قصیدہ فارسی شاعری کی مکمل نقالی ہے۔ حسرت نے عرب و فارس کے دونوں انداز ملانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے محسوسات کو پر اثر انداز میں بیان کر کے یہ ثابت بھی کیا ہے کہ ان کا یہ قصیدہ رسمی مدح سرائی پر مشتمل نہیں بلکہ ان کے دل سے نکلی ہوئی ایک آواز ہے اور ان کے ممدوح میں یہ اوصاف موجود ہیں جو انہوں نے بیان کیے ہیں۔ حسرت کہتے ہیں کہ مجھے شوق جتانا منظور نہیں ہے اور نہ ہی میری اس شاعری کو خوشامد سمجھا جائے۔

ہے قسم تیری ہی مجھکو کہ تیری فرقت میں ۔ شام تا صبح نہ اخگر سا اگر ہو پہلو
ہو کے بیتاب جو بستر سے میں اٹھ بیٹھوں ہوں ۔ ہے تصور تیرا اور سر ہے میرا اور زانو
غرض اس کہنے سے نہیں شوق جتانا منظور ۔ یا خوشامد نہیں اوروں کی طرح یک سر مو

پھر تخلص اور گریز...... کرتے ہوئے وہی انداز اختیار کرتے ہیں جو قصیدہ میں اپنایا جاتا ہے، یعنی کس طرح ممدوح کا ذکر بظاہر بلا قصد آگیا ہے کہ گویا بات سے بات پیدا ہو گئی ہے۔

جھوٹ بولے سو ہو کافر ہے خدا اس کا گواہ ۔ بندے ہم اسکے ہیں جس میں ہو محبت کی بو
تجھ میں سو پاتے ہیں نواب محبت خاں ہم ۔ بس محبت ہے تیری اور فضائل یک سو
اس لیے شام و سحر یاد کیا کرتے ہیں ۔ یہی کہتے ہیں محبت نے کیا ہے جادو

انکے بعد کے اشعار میں شرح حال کا پہلو نمایاں ہے جسے قصیدہ کی اصطلاح میں "حالیہ" کہا جاتا ہے۔

اب قلم لکھنے پہ ہو شق یہی کہتے ہیں مجھے ۔ استخواں چاک ہوئے میرے تو اب کر دے رفو
وصل کے رستہ پہ موقوف ہے یہ کام اب تو ۔ سینہ پھٹتا ہے جو کرتی ہے یہ جوں نے ہا ہو
اخگر سوختہ ہوں میں تہ خاکستر ایک ۔ کبھی دیکھوں ہوں صبا کی جو مجھے جاوے چھو
سلسلہ تیری محبت کا ہے زنجیر مجھے ۔ چاہوں نہ زلف کسی کی نہ کسی کے گیسو

حسرت نے ان اشعار کے ذریعے غیر روایتی انداز میں یہ کہا ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے اپنے ممدوح کی جو تعریف کر رہے ہیں کو وہ خوشامد کے زمرے میں شامل نہیں کرنی چاہئیے بلکہ یہ انکے ممدوح کے ذاتی صفات ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ نواب محبت خاں نہ صرف شاعرانہ بلکہ خاندانی اعتبار سے بھی جاہ حشم کے مالک تھے اور وہ بہت سے ذاتی اوصاف سے متصف تھے۔ انکے والد حافظ الملک حافظ رحمت خاں ایک عالم اور ایک تاریخ ساز شخصیت ہیں ان کا ضمناً ذکر کیا ہے ۔

؎ شعراء کی طرح آتا ہے مجھے بھی ورنہ ۔ وصف ذاتی و صفاتی کہوں میں بھی ہم کو
؎ لیک کیا فائدہ گر وصف صفاتی کیئے ۔ ذات سے گو متعلق ہے صفاتِ نیکو
؎ یا ترا فخر ہے گر کہیئے کہ تو ہے نواب ۔ یا ترے باپ کے تھا نام کا عالم میں غلو

اگر قصیدہ طویل ہو تو جزئیات نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ حسرت نے اپنے ممدوح کی جرائت، بہادری، تیغ کے جوہر اسکی کاٹ، تیر کمان، فیل وغیرہ کی تعریف پر شکوہ الفاظ میں کی ہے جس سے قصیدہ اور زیادہ پر زور ہو گیا ہے ۔

؎ یا ترا جاہ و حشم رشک ہے اسکندر کا ۔ یا ترا گذرا ہے رستم سے بھی زورِ بازو
؎ یا تری تیغ کا جوہر ہے یہ جوں ابرِ غضب ۔ جس طرف مُنہ کرے برسا دے دو عالم میں لہو
؎ یا ترا تیر ہے وہ جس آگے کھاکے سہم ۔ جاکے پردے میں عدم کے چھپی ہے جانِ عدو
؎ یا سناں تیری کا ایسا ہے چمک ہے جسکے ۔ خیرہ ہو چرخ پہ اختر کی نگاہ اے مہ رو
؎ یا ترے فیل کی وہ شان ہے جسکی رفعت ۔ سکنۂ عرش کی بھی لے نہ سکیں ہاتھ سے چھو
؎ یا ترے خیمہ کی رفعت ہے محیط ایسی یہاں ۔ جسمیں گردوں نظر آتا ہے حباب لب جو

محبت ایک پاک طینت انسان تھے ، انکی سخاوت کا ذکر کرنے لبعد انکی طہارت کا ذکر کرتے ہیں ۔

؎ ذات وہ ذات ہے تیری کہ فرشتے کی نہیں ۔ لیں طہارت کو ملک آب کریں جس سے وضو

حسرت محبت کے استاد تھے لیکن محبت کی شاعرانہ صلاحیتوں کے علاوہ انہیں افغان قوم کا سچا اور ہمدرد انسان بھی تصور کرتے ہیں ۔

؎ قوم اپنی کا تو او تار ہی کہنا ہے مجھے ۔ پر مسلمان کا ہے پاس نہیں میں ہندو

اسکے بعد دعائیہ اشعار و کلمات پر قصیدہ کا اختتام کیا ہے ۔

؎ اب دعا ہے یہی حسرت کی کہ ہر میداں میں ۔ سر بسر فضل و ہنر کی تو ہے لیجاوے کو

؎ مالک الملک ہو تو شرق سے لے غرب تلک ۔ زور بازو سے تیرے ہو ضعفا کو یزو

؎ دوستوں کے تیرے گھر عید رہے اور نوروز ۔ دشمنوں کو نہ ملے شام محرم بھی کبھو

قصیدہ کی دیگر خوبیوں کے ساتھ ایک اہم خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا اختتام کس انداز سے کیا گیا ہے ، یعنی قصیدہ کا مقطع پر معنی ، بھرپور اور پر اثر ہونا چاہیئے ۔ یہی صورتحال اس قصیدے میں نمایاں ہے ۔ اس میں ان لوگوں پر بھی طنز ہے جو عقیدہ کی بنیاد پر نواب محبت خاں سے اختلاف رکھتے تھے ۔

جہاں تک حسرت کی قصیدہ نگاری کا تعلق ہے تو یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حسرت میں قصیدہ گوئی کی صلاحیت ضرور موجود ہے لیکن وہ سودا اور مصحفی کی طرح اپنے دامن شاعری میں نہ اتنے قصائد کی تعداد رکھتے ہیں اور نہ وہ اس معیار کے قصائد کہہ سکتے تھے جو سودا سے منسوب کیے جاتے ہیں ۔ محولہ بالا قصیدہ میں کہیں کہیں تعقید پائی جاتی ہے جس سے مضمون و مفہوم اس طرح ہوتا ہے کہ مشکل سے وضاحت ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں سوائے چند اشعار کے قصیدہ میں ایسے الفاظ کی کمی ہے جو قصیدہ کو پر شکوہ بناتے ہیں :-

قصیدہ عوض علی مدعا شاہجہاں آبادی

:- در مدحِ محبت :-

بموقع کتخدائی نواب محبت خاں -

- پھر ہے بادل شدگاں درپۓ آزارِ فلک - متصل چھوڑکے ہے ناسور پہ چھاتی کے نمک
- ماہ نے کھول دیا ہے کفِ سیمیں اپنا - دوسرا ہاتھ جو پاتا تو بجاتا دستک
- شعلہ حسن کی گرمی سے عرق زیرِ جبیں - دیکھے ہوںگے کبھی مہتاب میں موکے ویلک (کذا)
- قلقلِ شیشہ یہ کہتا ہے کہ مت بیٹھ خموش - جام مارے ہے صفِ بادکشاں پر چشمک
- جشنِ نواب فلک رتبہ محبت خاں ہے - جس کی شادی میں ہیں سب جمع بزرگ و کوچک
- وہ جو گلگوں سواری کا ترے ہے مخصوص - کیا کہوں وصف بیاں عقل مری جائے بہک
- کہ مصور کرے تصویر کو اس کے مستور - قبضۂ وہم سے آ اوڑ جائے بے شبہ و شک
- کیا بیاں جلدی کا ہے اسکے کہ جوں مرغِ دعا - ہاتھ اٹھانے میں گیا فرش سے لے عرش تلک

گلستانِ رحمت کے مطابق نواب محبت خاں کی پہلی شادی ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء میں عبدالستار خاں ولد صدر خاں کمالزئی کی دخترِ نیک اختر سے انجام پائی۔ نواب محبت خاں کے بڑے بھائی نواب عنایت خاں بقیدِ حیات تھے ان کے سامنے ان کے جن چھوٹے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں انہوں نے دل کھول اخراجات کیے اور رقص و موسیقی کی محافل بھی منعقد کرائیں۔ لیکن ان محافل میں انکے والد حافظ رحمت خاں شریک نہیں ہوتے تھے - نواب محبت خاں کی اس شادی کے موقع پر نواب عنایت خاں کی سرکار میں میر عوض علی مدعا بھی صیغۂ شعر و سخن میں ملازم تھے انہوں نے محولہ بالا قصیدہ تحریر کیا ان کے اس قصیدے کے بارے میں میر حسن کے الفاظ ہیں "الحق خوب گفتہ است" میر عوض علی مدعا کی ملازمت کے بارے میں میر حسن اپنے تذکرے میں رقمطراز ہیں ...

بہ عنایتِ یزدانی از راہِ قدرشناسی و نکتہ خانِ عالی شان خلف
حافظ رحمت خاں عنایت خاں غفراللہ سہ صد روپیہ می دارد چندے
در بریلی اقامت داشت [۱]

میر عوض علی مدعا دہلوی کے بارے میں علی ابراہیم خاں یوں تحریر کرتے ہیں [۲]

"مدعا تخلص دہلوی اسمش میر عوض علی بصفاتِ حمیدہ آراستہ
در طبابت و تسار دستی رسا و رشتہ با حافظ الملک حافظ رحمت خاں
مرحوم العزت می گذرانید قصیدہ در ریختہ در کد خدائے نواب محبت
خاں مسلک نظم کشیدہ بغایت تسلط و اقتدار او گفتہ و زبان افغان
داخل آں کردہ از موزونان قرارداد است"۔

اس قصیدے کے بارے میں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے بھی میر حسن کے حوالے سے اپنے
ایک مضمون "روہیلوں کے دور میں اردو شاعری کا فروغ" میں ذکر کیا ہے۔ گلزارِ ابراہیم میں یہ
قصیدہ موجود ہے جس میں آٹھ اشعار ہیں، اشعار کے ذیل میں ان کا فارسی ترجمہ بھی لکھ دیا
گیا ہے۔ مدعا ایک شاعر کے ساتھ ساتھ طبیب بھی تھے لہذا دونوں صیغوں میں ان کی ملازمت
قریب از قیاس ہے۔

قصیدہ کا پہلا شعر اوپر تحریر کر کے پھر "در مقدمہ شادی" کا عنوان قائم کیا گیا
ہے اور پھر سات اشعار ہیں جن کا نثری ترجمہ فارسی میں کیا گیا ہے۔

قصیدہ کا پہلا شعر قدیم طرز کے مطابق نہایت زور دار ہے اور بڑے بڑے قصائد گو کی
طرح مشہور ہے۔

پھر ہے با دلِ شدگاں در پے آزار فلک
متصل چھیڑ کے ہٹیا سو رہیا چھاتی کے تک

تشبیب میں ماہ و آفتاب، جام و مینا قلقلِ شیشہ کو پر معنی اور سادہ الفاظ کے ساتھ الفاظ کی صنعت گری موجود ہے۔ اس قصیدہ کا ایک بڑا کمال اسکی مضمون آفرینی ہے اور صنعتِ کنایہ کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

؎ ماہ نے کھول دیا ہے کفِ سیمیں اپنا۔ دوسرا ہاتھ جو پاتا تو بجاتا دستک

تراکیب و بندش میں چستی بلندی اور پر شکوہ الفاظ لطیف و نازک تشبیہات اور حسن التعلیل ان اشعار میں ملاحظہ کیجے۔

قلقلِ شیشہ یہ کہتا ہے مت بیٹھ خموش۔ جام مارے ہے صفِ بادہ کشاں پر چشمک

اب گریز کا پہلو اختیار کرتے ہوئے ممدوح کا ذکر بلا قصہ نہیں بلکہ قصیدہً لاتے ہیں:۔

؎ جشن نواب فلک رتبہ محبت خاں ہے۔ جسکی شادی میں ہیں سب جمع بزرگ و کوچک

مندرجہ بالا یہ قصیدہ فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ مثال ہے چند اشعار سے ذریعے بیشتر پہلو اجاگر کر دیے ہیں دولہا کی سواری اور شادی کا منظر ان اشعار کے ذریعے بیان کیا ہے۔

؎ وہ جو گلگوں سواری کا ترے ہے مخصوص۔ کیا کہوں وصف بیاں عقل مری جائے بہک

؎ کہ مصور کرے تصویر کو اس کے مسطور۔ قبضۂ موہم سے اڑ جائے بے شبہ و شک

جس طرح قصائد کا اختتام دعائیہ اشعار پر ہوتا ہے اس کا اختتام بھی دعا پر ہوتا ہے۔ یہ شعر بھی مضمون آفرینی، شکوہ الفاظ اور نکتہ آفرینی لیے ہوئے ہے۔

کیا بیاں جلدی کا ہے اسکے کہ جوں مرغ دعا۔ ہاتھ اٹھانے میں گیا فرش سے تا عرش تلک

مندرجہ بالا قصیدے میر عوض علی مدعا شاہجہاں آبادی کی طبع رسا اور انکی قصیدہ گوئی کی اعلیٰ صلاحیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں مبالغہ کا پہلو بہت کم ہے۔

قصیدہ غلام ہمدانی مصحفی
در مدح
محبت خاں محبت

مصحفی قصیدہ گوئی میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ انہوں نے قصائد کی بہت بڑی تعداد یادگار چھوڑی ہے۔ ان قصائد کے اشعار کی مجموعی تعداد ۷۷۲ ہوتی ہے۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ سیکڑوں شاعروں کے دیوانوں کے اشعار کی تعداد ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی[1]۔ اب تک ان کے چار مجموعہ ہائے قصائد کا پتا چلا ہے[2]۔ جس نسخہ میں نواب محبت خاں کی مدح میں مصحفی کا قصیدہ ہے وہ دانش گاہ پنجاب لائبریری میں محفوظ ہے، یہ نسخہ بوسیدہ اور کرم خوردہ ہے۔ اسلئے اس قصیدے کے الفاظ و تحریر حذف ہو گئی ہے۔ اس مخطوطۂ قصائد کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ سے ہوتی ہے، نعت، منقبت حضرت علیؓ، نوابین اور معززین کی مدح میں قصائد موجود ہیں۔

نواب محبت خاں کی مدح میں قصیدہ کے اشعار کی تعداد ۹۰ (نوّے) ہے۔ کاتب نے اسے مصحفی کے شاگرد نواب عاشور علی خاں کے لیے نستعلیق خط میں لکھا ہے۔ قصیدے کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

مطلع

جو سلیماں تھے کیے اس نے غبار راہ مور ۔ زور کس کا چل سکے ہے چرخِ زور آور کے ساتھ

چشمِ تر میں میرے ...... کافر کی زلف[3] ۔ سانپ جوں بازی کرے پانی میں نیلوفر کے ساتھ

وہ قیامت زا ہے میرا نالہ جو بھرتا ہے نت ۔ باندھ کر دامن کو اپنے دامنِ محشر کے ساتھ

---

[1] افسر صدیقی امروہی: "مصحفی حیات و کلام" اوّل، نیا دور، کراچی ۱۹۵۷ء ص۔ ۱۵۱

[2] ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے اس میں ۶۹ قصائد ہیں۔ دوسرا مخطوطہ عاصم کاظم امروہی کے پاس ہے یہ ۱۲۳۹ھ یعنی مصحفی کی حیات میں لکھا گیا۔ قصائد کی تعداد ۸۶ ہے۔ تیسرا مخطوطہ حکومتِ بنگال کی تحویل میں ہے جو تھا نسخہ دانش گاہ پنجاب لائبریری میں موجود ہے۔

[3] کرم خوردہ اور بوسیدہ ہونے کی وجہ سے الفاظ محو ہو گئے ہیں۔

ے دیکھیے قائم رہے آخر کو یا شہ مات ہو ۔ بازیٔ شطرنج ہے اس چرخ بازی گر کے ساتھ

۷۔ مصحفی کا قصیدہ ، قصیدہ کی روایات کے مطابق پر شکوہ الفاظ سے شروع ہوا ہے ، ابتدائی اشعار ہی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مصحفی کوئی معمولی شاعر نہیں وہ ایک کہنہ مشق اور زود گو شاعر ہیں۔ محولہ بالا اشعار کے بعد انیس [19] اشعار کے ابتدائی الفاظ حذف ہو چکے ہیں ان اشعار کے اکثر مصرع ثانی مکمل ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مصحفی نے خوب خوب قلم کی موشگافیوں سے کام لیا ہے ۔ دسویں شعر میں مادح گریز کے بعد اصل موضوع یعنی اپنے ممدوح کا اسم گرامی بیان کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ شعر بھی نامکمل ہے :

ے ...... [1] والا فر محبت خاں کہ ہے ۔ دل سے اس کو دوستی ہر صاحب جوہر کے ساتھ

اس نامکمل شعر سے بھی کم از کم یہ بات تو ظاہر ہو جاتی ہے کہ نواب موصوف کے مصحفی سے گہرے تعلقات رہے ہونگے ۔

ے ...... [2] فارسی اس لطف سے ۔ جس کا ہر مصرع تلے ہے رشتۂ گوہر کے ساتھ

مندرجہ بالا شعر بھی محبت خاں کی فارسی شاعری کے لیے سند کا کام دے سکتا ہے کیونکہ مصحفی بھی محبت کی فارسی شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں ۔

قصیدہ کا ۲۲ بائیسواں شعر مطلع ثانی ہے جس کے شروع ہونے سے قبل "مطلع ثانی" عنوان قائم کیا گیا ہے

ے اس سے ہی اکثر کیا ہے موم آہن کے تئیں ۔ ہے بجا نسبت تجھے داؤد پیغمبر کے ساتھ

محبت کے ذاتی اوصاف سراپا کی تعریف دیکھئے ۔

ے کیا کروں خوبی بیاں شمشیر مژگاں کی ترے ۔ ایک تو ایسے دراز اور تس پہ اک نشتر کے ساتھ

ے جو کوئی دنیا میں اپنے فن کا ہو صاحب کمال ۔
چاہیئے وابستگی ہووے اسے اک در کے ساتھ

[1-2] کرم خوردہ اور بوسیدہ نسخہ ہونے کی وجہ سے الفاظ محو ہو گئے ہیں ۔

قصیدہ کے اس شعر میں نہ جانے مصحفی کا روئے سخن کس جانب ہے قرینِ قیاس
اشارہ یہ ہے کہ مصحفی ایک مدت تک کسی دربار یا صاحبِ حیثیت شخصیت سے وابستہ نہیں رہے
لہٰذا وہ محبت خاں سے کچھ سلوک چاہتے ہونگے۔

- حافظ الملک اس کا والد، وہ شہیدِ نامدار ۔ معرکہ میں آیا تھا جو لاؤ اور لشکر کے ساتھ
- بس شجاعت میں اسی کا ہے یہی آخر خلف ۔ وہ خلف تیغِ زباں ہے جس کی موجوہر کے ساتھ
- گر غنیمہ پر کرے وہ تاج بخشنے کی نظر ۔ سر لگائے بطنِ مادر سے پسر افسر کے ساتھ
- کر گرا کر غول پر دشمن کے وہ جس جا گرے ۔ سیکڑوں لاشے ہوئے مدفون وہاں تکبر کے ساتھ

اب مدح سے گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

- جی میں اب آتا ہے یوں کر مدح سے ..... گریز ۔ مدحِ حاضر کو کروں ضم مطلعِ دیگر کے ساتھ
- اے کہ تیرا ہاتھ ہے ہم پنجۂ شیرِ نر کے ساتھ ۔ موم کر دے اس کو گر پنجہ کرے شمشیر کے ساتھ

حسنِ التعلیل اور نکتہ آفرینی ملاحظہ فرمائیے۔

- مجمرہ بردار تیرا گر نہیں چرخِ اسیر ۔ تو بھلا پھرتا ہے کیوں اس آتشیں مجمر کے ساتھ
- آفتابِ قہر تیرا ہوئے دریا بہ کرم ۔ کام شعلہ کا کرے ہر موج نیلوفر کے ساتھ
- پیٹھ پر اس کی تجھے جو کوئی دیکھے یوں کہے ۔ نکہتِ گل ہے کہ جاتی ہے اڑی صرصر کے ساتھ

مبالغہ آرائی کا پہلو دیکھیے:-

- سروری ہے ختم تیری ذات پر اے باخرد ۔ کہ یہی ہے ربط دینا تجھ کو ہر سرور کے ساتھ
- شعلہ اک اٹھا ہے اس سے اس طرح کا اس گھڑی ۔ جا کے جو باتیں کرے ہے شعلۂ خاور کے ساتھ

ان کے بعد پھر دعائیہ اشعار اور ایک بار پھر مدح کا پہلو، یعنی قصیدہ میں اپنے ممدوح کی خوبیوں کو بار بار اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ اپنے ذہن سے یہ بات محو نہیں ہونے دیتے کہ ان کا ممدوح کن کن اوصاف کا مالک ہے۔ قصیدہ کا مقصد ہی تعریف و توصیف

ہے۔

؎ جب تک نکلیں زمیں سے لالہ ہائے زرد و سرخ ۔ جب تلک ہم قامتِ ہو سرو کو عرعر کے ساتھ

؎ وصفِ مسطوت جب تری لکھنے لگوں ہوں اس گھڑی ۔ جی میں سوچوں ہوں نشہ دیجئے کس ہمسر کے ساتھ

؎ جس جگہ سامانِ بزمِ عیش تو کرتا ہے واں ۔ خاک سے نکلے ہے خم خود شیشہ و ساغر کے ساتھ

؎ جی میں ہے اب وصف تیری برق جولاں کا لکھوں ۔ کچھ نہیں نسبت پری کو جس پری پیکر کے ساتھ

؎ سرعتِ رفتار کا میں اس کی عالم کیا لکھوں ۔ باد لگ سکتی نہیں جس شوخیٔ محشر کے ساتھ

؎ رنگ سرخ اسکے جو دیکھے ہے سو کہتا ہے یوں ۔ آج تو نکلی ہے لیلیٰ لالہ گوں معجر کے ساتھ

آخر میں دعائیہ کلمات کے ساتھ قصیدہ کا اختتام ہوتا ہے ۔

؎ مصحفی اب اس قصیدے کو دعا پر ختم کر ۔ ٹانک دے موتی پرو کر رشتۂ مسطر کے ساتھ

؎ دولت و حشمت تیری ہووے ۔ ...[1] ...تجھ کو دنیا میں رکھے اللہ کر و فر کے ساتھ

قصیدہ کے آخری شعر کا مصرعِ ثانی مکمل ہے لیکن مصرعہ اولیٰ نامکمل ہے اور اس کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں ۔

مصحفی کو ایک قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے بہت کم جانا جاتا ہے حالانکہ انکے قصائد کے چار نسخے اب تک دریافت ہو چکے ہیں جو ہزاروں اشعار پر مشتمل ہیں پر شکوہ الفاظ نادر تشبیہات، استعارے بلندیٔ مضمون اور نکتہ آفرینی کے ساتھ اپنے ممدوح کے ذاتی اوصاف سچائی سے بیان کرنے میں کمال رکھتے ہیں ۔ مصحفی کا ایک ایک قصیدہ انکی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہے ۔ محولہ بالا قصیدہ میں انہوں نے جہاں تلمیحات استعمال کیں ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے ۔ آسان قوافی کی تلاش کرتے ہیں اور سودا کی طرح قصائد کو تشبیب ہی میں اتنا طول نہیں بناتے بلکہ الفاظ کی سادگی اور روانی پر زور دیتے ہیں ۔

---

[1] نسخہ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے الفاظ محو ہو گئے ہیں ۔

حاصلِ کلام

منظور الدولہ شہباز جنگ نواب محبت خاں محبت نے روہیل کھنڈ کے مردم خیز علاقے آنولہ میں تعلیم و تربیت پائی۔ آپ کے والد حافظ الملک مکرم الدولہ حافظ رحمت خاں بہادر نصیر جنگ کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب قیس عبدالرشید سے ملتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں جو بدامنی پھیلی، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کٹھیر کے علاقے میں افغانوں نے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو بعد میں روہیل کھنڈ کے نام سے مشہور ہوئی۔

نواب علی محمد خاں اور مکرم الدولہ حافظ رحمت خاں نے اپنے مختصر دور میں روہیل کھنڈ کو مستحکم کیا۔ سلطنت دہلی سے اس علاقے کی سندیں حاصل کیں۔ نواب محبت خاں نے آنولہ میں ہوش سنبھالا جو تعلیم و تعلم کا گہوارہ تھا۔ تقریباً پانچ ہزار علماء روہیل کھنڈ کے مدارس میں درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، حافظ رحمت خاں نے ان میں سے بیشتر علماء کو دوسرے علاقوں سے بلاکر ان سے کسبِ فیض کیا اور انکی قدر و منزلت بھی کی۔

نواب محبت خاں کی پرورش نہایت ناز و نعم سے ہوئی، انکی حقیقی والدہ جیبہ خاں کمال زئی لنوی ملک خداداد خاں کی دختر تھیں، یہ حافظ رحمت خاں کی زوجہ ثانیہ تھیں انکے بطن سے حافظ رحمت خاں کے تین صاحبزادے تولد ہوئے، عنایت خاں، محبت خاں، عظمت خاں، ابھی یہ تینوں بھائی سن بلوغت کو نہ پہنچے تھے کہ ان کی والدہ انتقال کر گئیں، نواب محبت خاں کو زوجہ کلاں نے انکی حقیقی والدہ کے انتقال سے قبل ہی گود لے لیا تھا۔

نواب محبت خاں کی پہلی شادی ۱۱۸۳ھ میں جیبہ عبدالستار خاں کی دختر سے انجام پائی دوسری شادی عبدالوہاب خاں رسالدار کی دختر سے ہوئی۔ محبت خاں کی کل چھ بیویاں تھیں جن سے اٹھارہ فرزند اور چودہ دختران یادگار ہیں، ساتویں بیوی سے متعلق تاریخ خاموش ہے لیکن خاندان حافظ رحمت خاں میں یہ بات عام ہے کہ نواب موصوف کی ساتویں زوجہ انکے بڑے بھائی نواب عنایت خاں کی بیوہ تھیں۔ نواب عنایت خاں کا انتقال تیس ۳۰ برس کی عمر میں ہو گیا تھا، انکے انتقال کے بعد ہی انکی جگہ نواب محبت خاں صوبیدار سہو حاکم بریلی مقرر کیا گیا تھا۔

اپریل ۱۷۷۴ء میں شاہجہاں پور کے نزدیک کٹرہ میران پور کی جنگ نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کی مشترکہ فوج سے حافظ الملک حافظ رحمت خاں روہیلہ کے درمیان لڑی گئی اس جنگ میں نواب محبت خاں بھی اپنے چند دیگر بھائیوں، حافظ محمد یار خاں، محمد دیدار خاں، اللہ یار خاں اور عظمت خاں

نے بڑی بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا، حافظ رحمت خاں اس جنگ میں شہید ہوئے۔ نواب محبت خاں جوشِ انتقام میں گھوڑے پر سوار ہو اپنے دیگر بھائیوں کے ساتھ انگریز فوج قلب کی جانب سے آناً فاناً گھس جانا چاہتے تھے لیکن ایک مصاحب نے جو خاندانِ حافظ کا نمک خوار اور بہی خواہ تھا فوج لانے کے بہانے انہیں میدانِ جنگ سے نکالا اور کافی منت سماجت کے بعد پیلی بھیت کی جانب روانہ کر دیا۔

شجاع الدولہ نے پہلے انہیں جھوٹی تسلی دی پھر دیگر اہل خانہ کے ساتھ قلعہ الہ آباد میں نواب محبت خاں کو تقریباً دو سال قید رکھا۔ خواتین کی بے حرمتی کی گئی انکی جامہ تلاشی تک لی گئی۔ جنگ کٹرہ میران پور، اسکے نتائج اور اہل روہیل کھنڈ پر مظالم کے بارے میں مغربی مورخین نے بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ اس اسیری کے دوران، علماء، فضلاءِ اور شرفائے روہیل کھنڈ نے سخت اذیت کے دن گذارے، پٹھان، امروہہ، پیلی بھیت، بریلی، آنولہ بسولی، اوجھیانی اس حالت میں پہنچے کہ ان کے بدن پر لباس تک نہ تھے۔

شجاع الدولہ روہیل کھنڈ کی بہار نہ دیکھ سکا ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کو بعمر ۴۷ سال انتقال کر گیا۔ اسیرانِ روہیل کھنڈ کی رہائی کا خود بخود بند و بست ہو گیا۔ روہیل کھنڈ فتح ہونے کے بعد انگریز کی باریک بیں نگاہوں کو انڈیا کے نقشے پر ریاست اودھ ایک بدنما داغ معلوم ہونے لگی، شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد انگریز حکومت نے حکومت اودھ سے اپنے تمام سابقہ معاہدات کالعدم قرار دے دیے۔

نواب آصف الدولہ کو انگریزوں کی تمام شرائط تسلیم کرنی پڑیں، اسیرانِ روہیل کھنڈ رہا ہوئے لیکن اس رہائی کے لیے نواب فیض اللہ خاں نے مسٹر جان برسٹو ریذیڈنٹ لکھنؤ سے درخواست کی۔ ریذیڈنٹ نے آصف الدولہ سے سفارش کی، آصف الدولہ نے اس رہائی پر ۳ لاکھ روپیہ وصول کیے۔ ۱۷ شعبان ۱۱۸۹ھ کو یہ قیدی آزاد ہو کر لکھنؤ پہنچے۔ نواب محبت خاں کی انگریز وظیفہ خوار کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا آغاز ہوا۔ جان برسٹو ۱۷۷۶ء / ۱۱۹۰ھ میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے، ان کی جگہ مڈلٹن کو ریذیڈنٹ کلکتہ تعینات کیا گیا۔ لکھنؤ کے اہل کاروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور محبت کی تنخواہ میں تساہل کیا جانے لگا۔ محبت خاں نے اس سلسلہ میں گورنر جنرل سے ملاقات کا ارادہ کیا تاکہ انکے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ ہو سکے۔

۱۲۰۱ھ۔ لارڈ کارن والس صاحب بہادر گورنر جنرل کے عہدے پر فائز تھے، آصف الدولہ

سیر و شکار کی غرض سے بہرائچ کی جانب نکلے ہوئے تھے، محبت خاں موقع پاکر کلکتہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اس امر کی اطلاع آصف الدولہ کو فوراً کسی طرح پہنچائی گئی، آصف الدولہ نے فوراً مرزا باقر بیگ خاں رسالدار کو تعاقب میں روانہ کیا لیکن پالکی ڈاک نواب محبت خاں دریائے گنگا کے پار انگریزی سرکار کی عملداری میں پہنچ چکی تھی۔ آصف الدولہ نے حیدر بیگ خاں کو کلکتہ روانہ کیا اور توضل حسین خاں کو ایک رقعہ بھی لکھا کہ محبت خاں گورنر جنرل سے ملاقات نہ کر سکیں۔

توضل حسین خاں محبت خاں کے قدیم دوست اور آصف الدولہ کی جانب سے کلکتہ میں عہدہ وکالت پر مامور تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں نہایت تدبر سے کام لیا، امیر الدولہ حیدر بیگ خاں سے آصف الدولہ اور محبت خاں کے درمیان مصالحت کرانے کا وعدہ لیا اور یہ بھی کہا محبت خاں کا شاہرہ ماہ درماہ ریذیڈنسی کی معرفت پہنچتا رہے گا۔

نواب محبت خاں گورنر جنرل سے ملے، موصوف محبت خاں سے بکمال اعزاز پیش آئے تعظیم دے کر انہیں اپنے برابر کرسی پر بٹھایا انکی نہایت دلجوئی کی، پانچ ہزار روپیہ اور ایک گھوڑا عنایت کیا اور ارشاد فرمایا "ہم جناب عالی سے تمہاری سفارش کریں گے" لکھنؤ آنے پر گورنر جنرل نے ایسا ہی کیا۔ اب محبت خاں کو لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کی معرفت تنخواہ ملنے لگی اور آپ کمپنی کے متوسلین میں شمار ہونے لگے۔ آپ ریذیڈنٹ کے دربار میں جایا کرتے اور دربار اودھ میں از سر نو انکی پذیرائی کا طریقہ مقرر ہوا خلعت فاخرہ سترہ پارچہ مع سرپیچ مرصع دالائی مروارید و سپر شمشیر و پالکی و اسپ و فیل عنایت ہوئے۔[1]

محبت خاں نواب وزیر کے دربار میں ہر جمعہ کے دن جاتے تھے، نواب وزیر تعظیم دے کر اپنے پاس بٹھاتے، برادر کہہ کر گفتگو فرماتے، عیدین کے مواقع پر محبت خاں نواب وزیر پر نچھاور کرتے اور نذر بھی دیتے تھے۔ شادی غمی کے موقع پر نواب وزیر خود محبت خاں کے دولت کدہ پر تشریف لاتے یا ولی عہد کو بھیجتے تھے۔

دربار اودھ اور ریذیڈنسی میں نواب محبت خاں کے اعزازات کی بحالی کے بعد موصوف نے نواب وزیر اودھ اور انگریزی سرکار سے روہیل کھنڈ جانے کی اجازت طلب فرمائی۔ تاکہ وہ اپنے اس وطن کو دیکھیں جسمیں انہوں نے اپنا بچپن گذارا تھا، انکے والد اور بھائی عنایت خاں نے جہاں اپنی بہادری اور سخاوت کے جھنڈے گاڑے تھے۔ بریلی کے عوام میں ان کی آمد کی خبر سن کر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ افواہ بھی گشت کرنے لگی کہ محبت خاں کو بریلی کا علاقہ

---

[1] حالیہ اور سابقہ وظائف ملا کر نوے ہزار دو سو اٹھتر روپیہ سالانہ نواب محبت خاں ۱۱ بھائیوں اور ۱ دو ایک بہن پر تقسیم ہوئے۔

عنایت کر دیا گیا ہے ۔ لوگ جوق در جوق بریلی کی جانب ہزاروں کی تعداد میں استقبال کی خاطر روانہ ہوئے اور بریلی سے چار کوس کے فاصلے پر ان کا استقبال کیا ۔

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خاں ابن آصف الدولہ نے محبت خاں سے تعلقات میں مزید وسعت دینی چاہی ، ایک معتمد کے ذریعے پیغام بھیجا کہ " باہم ہماری اور تمہاری رشتہ داری بھی ہو جائے " یعنی ہماری لڑکیاں تمہارے فرزندوں کو اور تمہاری لڑکیاں ہمارے فرزندوں کے نکاح میں آجائیں لیکن نواب محبت خاں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ " نواب صاحب والی ملک ہیں اور میں ایک قیدی لہٰذا اس قسم کی نسبتیں نہیں ہو سکتیں ۔ اس واقعہ کے بعد محبت خاں نواب وزیر سے ملاقات کیے بغیر ہی واپس آگئے کیوں اس کے رویہ میں فرق آگیا تھا ، اور پھر تاحیات انکی ملاقات نہ ہو سکی ۔ ۱۲۱۹ھ میں سعادت علی خاں نے درگاہ جناب حضرت عباس کی تعمیر کی خاطر محبت خاں سے انکی رہائش گاہ محلہ رستم نگر کے اصطبل کی زمین مانگی ، ریزیڈنٹ لکھنؤ کی سفارش کے باوجود محبت خاں نے انکار کیا لیکن خواجہ حسن کی سفارش پر انہیں یہ زمین دینی پڑی کیوں وہ اپنے دوست اور پیرزادے کی بات نہیں ٹال سکتے تھے ۔

نواب محبت خاں کی مادری زبان پشتو تھی ، فارسی انکے گھر کی زبان تھی اپنے والد حافظ رحمت خاں کی یمن توجہات سے علوم عربیہ میں بکثرت علماء سے گوئے سبقت لے گئے تھے ۔ فارسی میں استادوں کے استاد اور سنسکرت میں کافی مہارت رکھتے تھے ۔ پشتو فارسی اور اردو میں انہوں نے دواوین بھی ترتیب دیے تھے[1] عربی اشعار ، مثنوی اسرار محبت ، اور پشتو فارسی لغت وآمدن نامہ انکی یادگار ہیں ۔ آپ ذہین و ذکاوطبع رسا میں عدیم النظیر تھے ، اہل استعداد ہمیشہ ان سے اساتذہ متقدین کا کلام سمجھنے آتے تھے ۔

میر ضیاالدین عبرت ، شاگرد محبت اپنی مشہور مثنوی پدماوت میں میں فرماتے ہیں

کہوں کیا نواب زماں ہے ۔ قلم آسا سراپا نکتہ داں ہے
مضامیں کس طرح کرتا ہے ایجاد ۔ نہ ہو محبت خاں سا استاد
اصول و منطق ہیں انکی زباں پر ۔ ہے فن شعر اس کا ادنیٰ جوہر
سخن کے سقم کا ہے وہ فلاطوں ۔ کہ اسکے ہاتھ میں ہے نبض مضموں

نواب محبت خاں روہیلہ قوم میں نہایت وجیہہ و شکیل ، بالیاقت و باصلاحیت

---

[1] اردو دیوان کی فوٹو اسٹیٹ راقم نے اردو لغت بورڈ سے حاصل کی ہے پشتو دیوان ، آکسفورڈ یونیورسٹی کی بوڈلین لائبریری میں موجود ہے ۔ پشتو فارسی کا لغت کا نمونہ جو ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے راقم نے انڈیا آفس لائبریری لندن سے فوٹو اسٹیٹ حاصل کیا ہے ۔

انسان تھے، جہاندار شاہ جب دہلی سے لکھنؤ آئے اور ایک موقع پر جب نواب محبت خاں کو دیکھا تو انکی وجاہت دیکھ کر دنگ رہ گئے، انکی نشست و برخاست اور انداز گفتگو سے بہت محظوظ ہوئے اور محبت خاں کو نواب مظفر الدولہ شہباز جنگ کا خطاب عطا کیا۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے نواب محبت خاں کی سیرت وصورت اور حکومت و سرداری کا اہل قرار دیا ہے۔

نواب محبت خاں فن حرب و سپہ گری کے بھی ماہر تھے۔ وہ موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ آپکو درد گردہ کی شکایت تھی اسی تکلیف کے دوران انکے پیر و مرشد نے انکا درد گردہ اپنے لیے قبول کر لیا تھا اور اسی مرض میں محبت خاں کے پیر و مرشد کا انتقال ہوا۔ جبکہ محبت خاں کو تخمہ کی شکایت ہوئی، مرض بڑھ کر استسقا ہوا۔ بالآخر ۶۳ برس کی عمر میں ۱۲۲۳ھ میں۔ ۱۸ محرم بروز جمعہ بعہد نواب سعادت علی خاں آپ کا انتقال ہوا۔

محبت خاں ایک شاعر

محبت خاں کی شاعری کا آغاز تو روہیل کھنڈ سے ہوا۔ لیکن قیام لکھنؤ کے دوران فن شعر و شاعری کو جلا ملی۔ محبت نے اردو شاعری میں نہ صرف کمال حاصل کیا بلکہ اپنے معاصرین اور اس دور کے مشہور اساتذہ، جعفر علی حسرت، قلندر بخش جرأت، مصحفی اور فاخر مکین جیسے شعراء میں رہ کر اپنا منفرد مقام بنایا۔ موصوف نے اپنے کلام پر لکھنؤ کی چھاپ نہیں آنے دی، جبکہ اس دور میں درباری شاعری کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ آپکے اردو دیوان میں ساڑھے تین ہزار اشعار سے زیادہ ہیں لیکن ان میں آپکو چند اشعار ایسے ملیں گے جو معاملہ بندی کے زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

محبت کی غزل میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو غزل کے عناصر ترکیبی میں شامل ہوتے ہیں، قلب کی پاکیزگی، تجربے کی سچائی، خلوص کی گرمی، فنی ریاضت، زبان و بیان کی حلاوت، لہجے کی نرمی سبھی کچھ ہے۔ محبت کا کلام دیگر اس دور کے شعراء کے مقابلے میں سقم سے پاک ہے۔ معنی آفرینی اور سادگی انکے کلام کی جان ہے۔

سہ دامن جھٹک جھٹک نہ گذر اس گلی سے تو۔
آخر تو تیری راہ کا میں اک غبار ہوں

محبت نے جو غزلیات، میر، درد، حسرت اور غالب کی زمینوں میں کہی ہیں وہ ان شعراء کی غزلیات سے کسی درجہ کم نہیں ہیں بلکہ غزلیات تو یہ ثابت کرتی ہیں کہ محبت کا ذوق سخن انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ دیوان محبت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انکے اشعار میں غریب الوطنی اور لکھنؤ میں انکی نظر بندی کی زندگی کی جھلک ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ نواب آصف الدولہ کا انکے ساتھ بظاہر اچھا برتاؤ کرتا تھا لیکن جب وہ مملکت سے باہر جاتا تو محبت خاں کو ساتھ رکھتا تھا تاکہ اسکی غیر موجودگی میں دیگر پٹھانوں کے ساتھ ملکر کوئی منصوبہ بندی نہ کر سکیں۔ اس طرح محبت کی لکھنؤ کی زندگی قید قفس سے کم نہ تھی جسکا نفسیاتی اثر ان کی شاعری پر ہونا ایک فطری امر تھا لہذا ان کی غزلیات میں یہ الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔

صیاد۔ قفس۔ اشک۔ لخت دل۔ لخت جگر۔ طفل اشک۔ دیدۂ گریاں۔

گل۔ بلبل۔ جنوں۔ ستم ایجاد۔ آشیاں۔ خون دل، خون جگر۔ چشم تر۔

چاک گریباں۔ بوالہوس۔ خار۔ دل وحشی۔ نالہ و فغاں، آبلہ پا۔ نالۂ صبح۔

نالے۔ سنگدل۔ شب تار۔ پیرہن چاک۔ دشت جنوں۔ عصائے آہ۔

سیل اشک۔ گرد و غبار۔ وحشت و عریانی۔ برہنہ پائی۔ آہ و نالہ۔

شدت گریہ۔ خس و خاشاک۔ دل ناشاد۔ چشم گریاں۔ رقیب۔

چمن۔ عندلیب۔ فصل گل۔ غم فراق۔ درد ہجر۔ شیشہ و جام۔ واعظ۔ ناصح۔

ے کرتا ہے بند مجھ پہ خاک قفس بھی ظالم
مجھ کو ملا ہے بلبل صیاد اس طرح کا

جہاں کہیں گل و گلزار کا تذکرہ ہے تو بھی وہ بہار سے لطف اندوز نہیں ہوتے یہی وہ پہلو ہے جو نفسیاتی طور پر محبت کو نظر بندی و قید قفس کی زندگی سے قریب ظاہر کرتا ہے۔ وہ والئ روہیل کھنڈ کے بیٹے ہیں اور اس شخص کے دست نگر ہیں جس پر انکے اہل خاندان کے بھاری احسانات ہیں۔ ایک مرتبہ لکھنؤ سے وہ جب اپنے مولد روہیل کھنڈ جاتے ہیں تو انہیں انگریز سرکار اور وزیر اودھ آصف الدولہ سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے جو واضح ہے وہ کسی کا قصیدہ نہیں لکھتے وہ صیاد کو نجات دہندہ کیوں کر لکھتے:-

ے جب کبھی آہ مجھے یاد قفس آتی ہے۔ پھر اسیری کی میرے دل میں ہوس آتی ہے

محبت اپنے دور کے ممتاز نمائندہ شاعر تھے۔ کوئی چھوٹا شاعر اپنے دور کا ممتاز نمائندہ نہیں بن سکتا۔ نمائندہ شاعر بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تخلیقی صلاحیتیں اعلیٰ درجے کی ہوں اور وہ اپنے دور کی تہذیب میں پوری طرح رچا ہوا ہو (ہو گیا ہو)۔ محبت کس بڑے شاعر سے متاثر ہوئے، یا دوسرے ہمعصر شعرائے ان سے کس حد کسب فیض کیا یہ بات ان غزلیات سے واضح ہوتی ہے جو ایک ہی دور کے شعراء نے ایک زمین میں کہی ہیں۔ محبت کا رنگ سخن سب سے جدا ہے۔ کہیں میر کی زبان اور درد کی سادگی و دردمندی نظر آتی ہے لیکن انکی انفرادیت ظاہر کرتی ہے کہ انہوں نے اپنا رنگ سخن خود بنایا اور تمام امکانات کو اپنی منشا کے مطابق تصرف میں لاتے ہیں۔ انہوں نے امکانات کا وسیع راستہ کھولا اور یہی ایک بڑے شاعر کی نشانی بھی ہے۔ انہوں نے لکھنؤ کی عام محافل و مجالس شعر و سخن میں شرکت نہیں کی اسی سبب سے انکی شاعری عام نہ ہو سکی اور نہ ہی وہ درباری شاعر تھے اور نہ ہی انہوں نے دربار سے اس سلسلہ میں مدد مانگی ورنہ :-

۔ محبت شعر سب کہتے ہیں لیکن ۔ سخن تیرا بہ انداز دگر ہے

محبت نے رباعیات، مخمس وغیرہ بھی لکھے لیکن انکے جوہر صحیح معنوں میں غزل ہی میں کھلے۔ ان کی غزل زبان و فکر دونوں سطح پر متوطن، صاف و شفاف ہو کر ریختہ کے پودے کو تر و تازہ کرتی ہے بقول ڈاکٹر جمیل جالبی :-[1]

> ہمارے یہاں یہ غلط فہمی عام ہے کہ صرف دل کی شاعری بڑی شاعری ہوتی ہے۔ الگ الگ دل کی شاعری اور دماغ کی شاعری کا نتیجہ بہت معمولی ہوتا ہے اعلیٰ ترین شاعری وہ ہے جس میں دل و دماغ دونوں ملکر ایک ہو جائیں۔ سراج، میر، سودا، درد، غالب اور اقبال سب کے سب بیک وقت دل و دماغ دونوں کے شاعر ہیں۔ ان شعوری عنصر لاشعور میں ایسا پیوست ہے کہ وہ الہام کے درجے پر پہنچ گیا ہے۔ کالرج نے شاعری کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ بڑی شاعری میں شعور و لاشعور دونوں کا اہم حصہ ہوتا ہے۔

محبت ایسے شعراء ہی کی صف میں شامل ہیں جن کی شاعری دل و دماغ دونوں کی شاعری ہے۔

۔ دامن جھٹک جھٹک نہ گذر اس گلی سے تو
آخر تو تیری راہ کا میں اک غبار ہوں

۔ مجھ کو اس شب میں تنگ اے ابر تو مت آ تھو ۔ رات کٹتی ہے ذرا اختر شماری کے سبب

---

۱ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو" لاہور، حصہ اول، جلد دوم ۱۹۸۲ ۔ ص ۔ ۲۸۲

محبت میر کی طرح لکھنوٴ شاعری کی خارجیت سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ میر کے دل میں تو یہ خواہش ابھری تھی کہ وہ آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو جائیں غالباً انہوں نے آصف الدولہ کی شادی پر اسی لئے قصیدہ لکھا تھا۔ لیکن محبت کے کلام میں ایک بھی قصیدہ نہیں ملتا۔ محبت کے کلام میں دل آویز تراکیب اور بندشوں کا ذخیرہ ہے جو اردو شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ غزلیات کے مطالعہ سے محبت کی جذبات نگاری اور اسلوب کا قائل ہونا پڑتا ہے، واقعات وجذبات کے اظہار میں انہیں قدرت حاصل تھی۔ سوز وگداز کے ساتھ آس و نراس کے بین بین فکر انگیز بات کہہ جاتے ہیں:۔

دامن جھٹک جھٹک نہ گذر اس گلی سے تو۔ آخر تو تیری راہ کا میں اک غبار ہوں

بسکہ روتا ہوا جو موا ہے محبت ہر سال۔ خاک پر اس کی گھٹا جاکے برس آتی ہے

ہمکو جلا نہ غیر سے مل مل کے ورنہ ہم۔ کچھ کر رہیں گے آہ شرربار کھینچ ..... کر

انکے کلام میں سہل ممتنع کی بہترین مثالیں موجود ہیں، جہاں کہیں مشکل ردیف میں اشعار کہے ہیں وہ ان کے ذہن رسا کی خبر دیتے ہیں۔

محبت کی غزل اور شاعری کا ہم نے تقابلی جائزہ ہم نے گذشتہ ابواب میں پیش کیا ہے۔ غالب، میر تقی میر، میر درد، مصحفی، اور جرائت کی وہ غزلیں جو نواب محبت خاں نے بھی ان ہی بحور اور قافیہ ردیف کے ساتھ تحریر کیں ہیں اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ محبت خاں ایک صاحب طرز مشاق اور پرگو شاعر تھے۔ وہ سستی شہرت کے قائل نہیں تھے، اسلئے عام مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے اور دربار سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے لہذا وہ عوامی اور درباری شاعری سے بھی دور رہے محبت، میر تقی میر۔ میر درد۔ غالب اور دیگر شعراء کے چند اشعار پیش خدمت ہیں تاکہ محبت کے طرز بیان کا دوسرے استاد شعراء کا تقابل ہو سکے۔

۱؎ جبکہ محبت کے قصیدے، مصحفی حسرت اور عوض علی مدعانے لکھے ہیں۔

ـــ فتنہ گر تونے جو ٹک ہم سے ملائیں آنکھیں ۔ ایسے ہم روئے کہ آشوب کر آئیں آنکھیں — محبت

ـــ جاں بخشی کو نہ آیا وہ دم نزع حسن ۔ اس نے اس وقت بھی ہم سے چھپائیں آنکھیں — حسن

ـــ ہو غضبناک جو قاتل نے دکھائیں آنکھیں ۔ اور تو بس نہ چلا میری بھر آئیں آنکھیں — جرأت

ـــ نبھ جائے عیش و عشرت اب خاک بھی نہیں ہے ۔ کوئی نگر کرے گا برباد اس طرح کا — جرأت

ـــ دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ یہ صبا یہ ۔ میرا غبار کیجو برباد اس طرح کا — محبت

ـــ کیا کہوں اے ماہ تجھ بن شغل کیا رہتا ہے آہ ۔ دن کٹے نالوں سے شب اختر شماری کے سبب — جرأت

ـــ ہجر کی اس شب میں ٹک اے ابر تو مت آئیو ۔ رات کٹتی ہے ذرا اختر شماری کے سبب — محبت

ـــ ہم کیا کریں گے سیر چمن کرکے ہم نشیں ۔ بھولا ہوا ہے چشم میں گلزار لخت دل — جرأت

ـــ جھولی میں بھر کے گل میں چمن سے نہ لاؤں گا ۔ دامن میں میرے پھولا ہے گلزار لخت دل — محبت

ـــ کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں ۔ رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا — میر

ـــ اب محبت کی غزل سنکر خجالت سے بہت ۔ رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا — محبت

ـــ میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبہ دل ۔ اس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے — غالب

ـــ ہجر آیا آہ اور جاتا رہا صبر و قرار ۔ آ بنی ہے جان پہ اب دیکھیے کیسے بنے — محبت

ـــ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا ۔ اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا!! — غالب

ـــ ظالم یہاں کوئی بھی آپ سا پیدا نہ ہوا تھا ۔ اور خلق میں مظلوم بھی مجھ سا نہ ہوا تھا!! — محبت

ـــ نازک دلوں کے زخم کا مرہم کبھو نہ ہو ۔ پیرہن حباب پھٹے تو رفو نہ ..... ہو!! — حسرت

ـــ الفت میں جس کو اشک بہانے کی خو نہ ہو ۔ اس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو!! — محبت

ـــ کیا فرق داغ و گل میں ہے کہ جس گل میں بو نہ ہو ۔ کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو — درد

ـــ کرتی ہے خوں وہ ابروئے خمدار ایک دو ۔ کھینچی ہے اس کے حسن پہ تلوار ایک دو — میر

ـــ ٹک چشم میں بھی سرمہ کا دنبالہ کھینچیے ۔ اس مست کے بھی ہاتھ میں تلوار ایک دو — محبت

ـــ اب کے تیرے در سے گر گئے ہم ۔ جیتے ہی سمجھ کے مر گئے ہم — درد

ـــ دنیا سے تو کر گئے سفر ہم ۔ افسوس پہ کچھ نہ کر گئے ہم — محبت

ـــ بے دیدہ تر جدھر گئے ہم ۔ ڈیرے تھے جو خشک بھر گئے ہم — سودا

ـــ کٹ نہیں چکتی غم میں مر گئے ہم ۔ بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم — حسرت

ــ زاہد کیا کرے ہے وضو گو نہ روز و شب ـ چاہے کہ دل سے دھووے کدورت سو دھو چکا — دردؔ
ــ لے کر کتاب شیخ تو کعبہ تلک گیا ـ لیکن وہ دل سے حرف دوئی کا نہ دھو سکا — محبتؔ
ــ زلفوں میں کسو کی جو گرفتار نہ ہوتا ـ کچھ کام مجھے تجھ سے شب تار نہ ہوتا — دردؔ
ــ گر دام تیری زلف کا دل کو نہ پھنساتا ـ تو کوئی محبت میں گرفتار نہ ہوتا — محبتؔ
ــ اٹھتا ہے بعد مرگ بھی مانندِ گرد باد ـ اے دردؔ خاک سے مری اب تک غبار دل — دردؔ
ــ لالہ کی تو بہار گلستاں میں ہے ولے ـ تیرا عجب رنگ ہے محبتؔ بہار دل — محبتؔ
ــ نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو ـ الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضی الٰہی ہو — دردؔ
ــ جنوں ہے میں ہوں اور رونا اگرچہ جگ ہنسائی ہو ـ ہوا ہیں اک طرف کو اک طرف ساری خدائی ہو — محبتؔ

ــ فتنے رہتے ہیں اسکے سائے میں ـ قد و قامت ترا قیامت ہے — میرؔ
ــ وصل کے روز پاؤں میں مہندی ـ یہ بہانا ترا قیامت ہے — محبتؔ
ــ طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا ـ اسد اللہ خاں قیامت ہے — غالبؔ

ــ روبرو تھی اس کی جو تھی شب فندق گلرنگ و شمع ـ تا سحر کرتا تھا میں سیر گل اور رنگ و شمع — مصحفیؔ
ــ وہ تو ہوا اس پر تصدق یہ کرے اس سے گریز ـ دیدنی ہے صحبت پروانۂ بے ننگ و شمع — ″
ــ جانتا گر میں کہ بانی تیری کھینچے گا شبیہ ـ متصل ہونے نہ دیتا کاغذ بے رنگ و شمع — ″

ــ رخ نگار سے ہے سوز جاودانی شمع ـ ہوئی ہے آتش گل آب زندگانی شمع — غالبؔ
ــ غم اس کو حسرت پروانہ کا ہے اے شعلہ ـ تیرے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع — ″ ″
ــ کرے ہے حرف بایمائے شعلہ قصہ تمام ـ بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع — ″ ″

ــ ٹھہرے حضور اس کے کہاں ہے مجالِ شمع ـ گرمی ہے حسنِ شمع کی ہووے وبالِ شمع — محبتؔ
ــ جس نے کسی کو سوخت کیا وہ بھی جل گیا ـ پروانہ جوں جلا ہوا ویسا ہی حالِ شمع — ″ ″
ــ عاشق تو ثبت ہے سنیو محبت کہ جس گھڑی ـ ہووے گداز جسم ترا سب مثالِ شمع — ″ ″

محبت نے مشکل اور آسان دونوں زمینوں میں غزلیں کہی ہیں لیکن زیادہ غزلیات سہل ممتنع میں ہیں انکے بیاں طرزِ فکر بدلتا اور آگے بڑھتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے ـ مضمون اور خیال میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے تخلیقی قوت رکھنے والے شعرا کے لیے ان کا کلام قابلِ تقلید رہا ـ شعری رویوں میں تبدیلیوں کا احساس ہمیں یہ بتاتا ہے کہ محبت خاں خیال و طرز کی سطح پر کسی معمولی دل و دماغ کے شاعر نہ تھے ـ وہ اوّل درجہ کے شاعر تھے ـ

تصانیف[1]

دیوان اردو :- محبت خاں کا اردو دیوان دو سو نوے صفحات پر مشتمل ہے جسمیں تقریباً دو ہزار چھ سو پچپاس اشعار ہیں۔ غزلیات۔ رباعیات۔ مخمس۔ منقبت در شان حضرت علیؓ۔ دو شجرے اس دیوان میں موجود ہیں۔ اس دیوان کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ اسکی نقل اردو ڈکشنری بورڈ کراچی میں ہے اس سے راقم نے فوٹو اسٹیٹ حاصل کی ہے۔ آخری صفحہ پر اسکی تاریخ تکمیل ۱۱۹۷ھ تحریر ہے۔

اسرار محبت مثنوی :- سستی پنوں کے قصے پر مشتمل یہ مثنوی اس موضوع پر اردو میں پہلی مثنوی ہے ۵۹۴ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی مسٹر جانسن کی فرمائش پر ۱۱۹۷ھ میں تحریر کی گئی لیکن میر حسن کی سحر البیان سے بھی ایک سال قبل۔ ۵۶ صفحات پر مشتمل اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ قومی عجائب گھر کراچی میں محفوظ ہے۔

ریاض المحبت :- نواب موصوف نے پشتو فارسی لغت "ریاض المحبت" کے نام سے ۱۲۲۱ھ میں تالیف کی یہ ضخیم لغت ۱۷۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ جسمیں ۱۲۱۰ پشتو الفاظ کے معنی فارسی میں تحریر کئے گئے ہیں۔ مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ راقم نے چالیس صفحات فوٹو اسٹیٹ حاصل کیے ہیں۔ اس لغت کے تین نسخے انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ ایک نسخہ کا حوالہ رضا لائبریری رام پور کے بارے میں بھی ملتا ہے۔

دیوان محبت پشتو :- نواب محبت کا پشتو دیوان ۳۹۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ سر جارج کوبرلی کی خدمت میں ۱۸۰۱ء میں نواب موصوف نے اپنے دستخطوں کے ساتھ پیش کیا تھا۔
اس دیوان میں پشتو غزلیات اور چار بیتی ہیں اور صنف شاعری اردو اور پشتو میں ہی پائی جاتی ہے۔

---

[1] نواب محبت خاں کی تصانیف کا "تعارف" کے عنوان سے گذشتہ ابواب میں ان تصانیف و تالیفات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ضمیمہ

نمونہ لغت (ریاض المحبت)

پشتو کا نمونۂ کلام

نواب محبت خاں کی پشتو فارسی لغت موسومہ ریاض المحبت کا نمونہ

باب اوّل در مشتقات روضۃ الالف فصل الالف مع الجیم العجمی

اچول ۔ بالف ممدودہ وجیم عجمی مفتوح و واو مفتوح و لام ساکن بمعنی انداختن مصدر متعدی است۔

ناچول ۔ بزیادتی نون نفی مفتوح بر سر کلمہ وباقی بدستور بمعنی نیند اختن مصدر منفی است۔

بحث فعل ماضی معروف مثبت و منفی

اچولی وو ۔ بالف ممدودہ وجیم عجمی و واو و لام ہر سہ مفتوح و یای تحتانی ساکن و دو واو اول مضموم و ثانی مجہول بمعنی انداختہ بود چیزیرا کہ بجای مفرد مذکر است صیغہ مذکر مفرد مونث غائب است۔

اچولی نوو ۔ بالف ممدودہ وجیم عجمی و واو و لام ہر سہ مفتوح و یای تحتانی ساکن ولون منونہ مفتوح و دو واو اول مضموم و ثانی مجہول بمعنی نینداختہ بود مردرا یا چیزیرا کہ بجائے مفرد مذکر است صیغۂ مفرد مذکر منفی غائب است و در اینماضی منفی گاہی نون نفی را با علامت ماضی مقدم بر کلمہ می آرند وگویند۔

نو اچولی ۔ بحروف وحرکات مذکورہ۔

اچولی وو ۔ بالف ممدودہ وجیم و واو ہر دو مفتوح ولام مکسور و یای تحتانی معروف و دو واو اول مضموم و ثانی معروف بمعنی انداختہ بود مرداں را یا چیز ہارا کہ بجائے جمع مذکر اند۔

اچولی نوو ۔ بزیادتی نون نفی و باقی بدستور بمعنی نینداختہ بود مردانرا یا چیز ہارا کہ بجای جمع مذکر اند صیغہ جمع مذکر منفی غائب است و در اینجا نیز نون نفی را اکر مقدم گاہی با علامت ماضی آرند۔

اچولبی وہ ۔ بالف ممدودہ وجیم عجمی و واو ہر دو مفتوح ولام مکسور ویاے تحتانی مجہول و واو مفتوح و ہای مختفی بمعنی انداختہ بود زن را یا چیز را کہ بجای مفرد مونث است صیغہ مفرد مونث مثبت غائب است ۔

اچولبی نوہ ۔ بالف ممدودہ وجیم و واو ہر دو مفتوح ولام مکسور ویای تحتانی مجہول ونون مغنونہ و واو ہر دو مفتوح و ہای مختفی بمعنی ننیداختہ بود زن را یا چیز را کہ بجای مفرد مونث است صیغہ مفرد مونث منفی غائب است ودر اینجا نیز نون نفی را گاہی با علامت ماضی مقدم می آرند ۔

اچولبی وی ۔ بالف ممدودہ وجیم عجمی و واو ہر دو مفتوح ولام مکسور ویای تحتانی مجہول بمعنی انداختہ بود در زماں را یا چیز ہا را کہ بجای جمع مونث اند صیغہ جمع مونث مثبت غائب است ۔

اچولبی نوی ۔ بالف ممدودہ وجیم و واو ہر دو مفتوح ولام مکسور ویای تحتانی مجہول ونون منونہ مفتوح و واو مکسور ویاء مجہول بمعنی ننیداختہ بود زنان را یا چیز ہا کہ بجای جمع مونث اند صیغہ جمع مونث منفی غائب است ودر اینجا نیز گاہی نون نفی را با علامت ماضی مقدم می آرند ۔

اچولبی دی وو ۔ بالف ممدودہ وجیم و واو ولام ہر سہ مفتوح ویاء تحتانی ساکن ودال مہملہ مکسور ویاء مجہول ودو واو مضموم ومجہول بمعنی انداختہ بودی مرد را یا چیز را کہ بجای مفرد مذکر است صیغہ مفرد مذکر مثبت مخاطب است وبایں معنی ۔

تا اچولی وو ۔ بتاء فوقانی مفتوح والف والف ممدودہ وجیم و واو ہر دو مفتوح و

لام مفتوح و یاء تحتانی ساکن و دو واو اول مضموم و ثانی مجهول نیز آمده -

اجولبی دی لنوو - بالف ممدوده و جیم و واو و لام هر سه مفتوح و یاء تحتانی ساکن و دال مهمله مکسور و یای تحتانی مجهول و نون منونه مفتوح و دو واو اول مضموم و ثانی مجهول بمعنی نینداخته بودی مرد را یا چیز یرا که بجای مذکر است و در اینجا کاهی لفظ تا را تبادر فوقانی و الف مقدم میکنند و لفظ دی را بدال مهمله مکسور و یای تحتانی مجهول ساقط می کنند و باقی حروف و حرکات را بدستور می گذارند -

اجولبی دی وو - بالف ممدوده و جیم و واو هر دو مفتوح و لام مکسور و یاء معروف و دال مهمله مکسور و یاء تحتانی مجهول و دو واو اول مضموم و ثانی معروف بمعنی انداخته بودی مردانرا یا چیزها را که بجای جمع مذکر اند و در اینجا نیز کاهی لفظ تا را مقدم کنند و لفظ دی را ساقط می نمایند چنانچه گذشت -

اجولبی دی لنوو - بالف ممدوده و جیم عجمی و واو هر دو مفتوح و لام مکسور و یاء تحتانی معروف و دال مهمله مکسور و یاء مجهول و نون منونه مفتوح و دو واو اول مضموم و ثانی معروف بمعنی نینداخته بودی مردانرا یا چیزها را که بجای جمع مذکر اند و در اینجا نیز قاعده همانست که گذشت -

اجولبی دی وه - بالف ممدوده و جیم و واو هر دو مفتوح و لام مکسور و یای مجهول و دال مهمله مکسور و یاء مجهول و واو مفتوح و هاء مختفی بمعنی انداخته بودی زن را یا چیز یرا که بجای مؤنث است و در اینجا نیز همان قاعده است -

اچولبی دی لوه - بزیادتی نون منونہ مفتوح بر علامت ماضی و باقی حروف و حرکات مذکوره بمعنی ایضیده انداخته بودی زن را یا چیزیرا که بجای مفرد مونث است و قاعده همانست -

اچولبی دی وی - بالف ممدوده وجیم عجمی و واو هر دو مفتوح ولام مکسور و یاء مجهول و دال مهمله مکسور و یاء تحتانی مجهول و واو مکسور و یاء تحتانی مجهول بمعنی انداخته بودی زنانرا یا چیزهارا که بجای جمع مونث است و قاعده تقدیم تا و اسقاط لفظ دی همانست که گذشت

اچولبی دی لوی - بزیادتی نون نفی مفتوح بر علامت ماضی و باقی بدستور بمعنی ننیداخته بودی زنان را یا چیزهارا که بجای جمع مونث اند و قاعده همانست واگر خطاب بجمع یا تعظیم مخاطب منظور باشد لفظ تاسی بتاء فوقانی مفتوح والف وسین مهمله مکسور و یاء مجهول که بمعنی شما است بجای لفظ تا یا بجای لفظ دی می آرند در مثبت و منفی و درینوقت صیغه جمع مخاطب میشود

اچولبی می وو - بالف ممدوده وجیم عجمی و واو هر دو مفتوح ولام نیز و یاء تحتانی ساکن و میم مکسور و یاء تحتانی مجهول و دو واو مضموم و مجهول بمعنی انداخته بودم مرد را یا چیزیرا که بجای مفرد مذکر است صیغه مفرد مذکر متکلم مثبت است -

اچولبی می لوو - بزیادتی نون منفی مفتوح بر علامت ماضی و باقی بدستور صیغه مفرد مذکر متکلم منفی است -

اچولبی می وو - بالف ممدوده وجیم و واو هر دو مفتوح ولام مکسور و یاء معروف و

میم مکسور و یاء مجہول و واو اول مضموم و ثانی معروف بمعنی انداختہ بودم
مرد را یا چیزے را کہ بجاء جمع مذکر اند صیغہ جمع مذکر متکلم مثبت است۔
اجولہی مے تو و ۔ بزیادتی نون نفی بر علامت ماضی و باقی بدستور بمعنی ننیداختہ بودم
مردان را یا چیزہا را کہ بجاء جمع مذکر اند صیغۂ جمع مذکر متکلم منفی است۔
اجولہی می وہ ۔ بالف ممدودہ و جیم و واو ہر دو مفتوح و لام مکسور و یاے مجہول و میم
مکسور و یاء مجہول و واو مفتوح و یاء مختفی بمعنی انداختہ بودم زن را
یا چیزے را کہ بجای مفرد مونث است صیغہ مفرد مونث متکلم مثبت است
اجولہی ہی لوہ ۔ بزیادتی نون نفی با علامت ماضی و باقی بدستور بمعنی ننیداختہ بودم زن
را یا چیزے را کہ بجاء مفرد مونث است صیغہ مفرد مونث متکلم منفی است
و اگر لفظ مونکہ بمیم مضموم و واو معروف و نون منونہ و کاف عجمی
مفتوح و ہاء مختفی کہ بمعنی ما است بجاء لفظ می کہ علامت مفرد متکلم است
در صیغہا آرند الخیر میکرد یعنی ما انداختہ بودیم و ہمچنان در منفی کہ ما
ننیداختہ بودیم و این لفظ مونکہ کہ بمعنی ما است گاہی بر سر کلمہ نیز می
آید بخلاف لفظ می کہ بر سر کلمہ نمی آید و اگر لفظ ہغہ بہاء ظاہر و غین
منقوطہ ہر دو مفتوح و ہاء مختفی بر سر کلمات آرند و گویند ۔ ہغہ اجولہی وو
اشارت بطرف مفرد مذکر میشود یعنی آنمرد انداختہ بود و اگر غین منقوطہ را
مکسور ساختہ با یاء مجہول آرند و گویند ہغہ اجولہی وو اشارت بطرف
مفرد مونث میکرد یعنی آنزن انداختہ بود و اگر غین منقوطہ را مضموم
کردہ با واو مجہول آرند و گویند ہغو اجولہی وو اشارت بطرف جمع میکرد

مردان باشند یا زنان یعنی آنمردان یا آن زنان انداخته بودند این قاعده که گفته شد در متعدی است که تذکیر و تانیث و افراد و جمع باعتبار مفعول است یعنی انداخته شده و فاعل مذکر باشد یا مونث و مفرد باشد یا جمع و قاعده لازمی در فصل لازمی خواهد آمد چنانچه در متعدی مجهول که لازمی میشود در همین فصل گفته خواهد شد

بحث فعل ماضی مجهول مثبت و منفی ۔

اچولی شوی وو ۔ بالف ممدوده و جیم عجمی و واو و لام هر سه مفتوح و یاء تحتانی ساکن و شین منقوط مکسور و واو مفتوح و یاء تحتانی ساکن و دو واو اول مضموم و ثانی مجهول بمعنی انداخته شده بود مرد یا چیزیکه بجای مفرد مذکر است ۔

اچولی شوی نوی ۔ بزیادتی نون نفی بر علامت ماضی و باقی بدستور بمعنی ننیداخته شده بود مرد یا چیزیکه بجاء مفرد مذکر است و در اینجا نیز نون نفی گاهی با علامت ماضی مقدم می آرند و گفته می شود نو واچولی شوی بحروف و حرکات مذکوره ۔

اچولی شوی وو ۔ بالف ممدوده و جیم و واو هر دو مفتوح و لام مکسور و یاء تحتانی معروف و شین منقوط و واو هر دو مکسور و یاء تحتانی معروف و دو واو اول مضموم و ثانی معروف بمعنی انداخته شده بودند مردان یا چیزها که بجاء مردان اند ۔

اچولبی شوی نوو - بزیادتی نون نفی بر علامت ماضی و باقی بدستور بمعنی ننیند اخته شده بودند مردان یا چیزها که بجای مرداں اند در اینجا نیز نون ــــ با علامت ماضی گاہی مقدم می آید -

اچولبی شوی وه - بالف ممدوده و جیم و واو ہر دو منتوح ولام مکسور و یاء تحتانی مجہول و شین منقوطه و واو ہر دو مکسور و یاء مجہول و واو مفتوح و ہاء مختفی بمعنی انداخته شده بود زن یا چیزیکه بجای مفرد مونث است -

اچولبی شوی نوه - بزیادتی نون بر علامت ماضی و باقی بدستور بمعنی ننیند اخته شده بود زن یا چیزیکه بجاء مفرد مونث است و در اینجا نیز نون را مکسور کرده یا یاء مجہول آرند و ورکی گویند جمع مونث میشود یعنی زنان یا چیزہا که بجای زنان خوانده می شود کم شده ورکه بواو ساکن و راء مہمله و کاف عجمی ہر دو مفتوح و ہاء مختفی برغوث را گویند که در ہندی پیشو خوانند جانور خورد است گزنده که بوقت خواب در جامهاء خواب میباشد مفرد مونث است وچون کاف عجمی را مکسور کرده با یای مجہول آرند و ورکی خوانند جمع مونث میشود ورا بواو ساکن و راء مہمله مفتوح والف جمع زنان را گویند که از طرف عروس در شادی بخانه زوج روند وریت بواو ساکن وراء مہمله مکسور و یای معروف و تاء فوقانی موقوف بمعنی برشته باتش بجاء مفرد مذکر و جمع مذکر میخوانند وچون تاء فوقانی را مفتوح کرده با ہاء مختفی آرند و وریته گویند بجاء مفرد مونث مستعمل میشود و ہرگاه که تاء فوقانی را مکسور کرده با یاء مجہول آرند و وریتی گویند بجای جمع مونث مستعمل میگردد ورلبوز بواو مضموم وراء مہمله ساکن و باء موحده مضموم و واو معروف و زاء منقوطه موقوف ہیت کلر و جبره را گویند که بہندی کہونیر خوانند مفرد مذکر است وچون

زای منقوطہ را مضموم کردہ با واو معروف و نون منونہ مفتوح و ہای مختفی آرند و ربوزونہ گویند جمع مذکر میشود -

فصل الواو مع الراء ثقیلہ -

وڑوکی - بواو ساکن و رای ثقیلہ مضموم و واو معروف و کاف تازی مفتوح و یای تحتانی ساکن خورد را گویند متابل کلان مفرد مذکر است و چون کاف تازی را مکسور نمودہ با یای معروف آرند جمع مذکر میشود و یک نام جمع آن در فصل واو مع الالف گذشت وڑہ بواو و رای ثقیلہ ہر دو مفتوح و ہای ظاہر بمعنی زن خورد یا چیزیکہ مونث خواندہ میشود مفرد است و چون رای ثقیلہ را مکسور کردہ با یای مجہول آرند وڑی گویند جمع مونث میشود وڑاندی بواو ساکن و رای ثقیلہ مفتوح و الف و نون مغنونہ و دال مہملہ مکسور و یای مجہول بمعنی پیش متابل پس وڑنبی بواو ساکن و رای ثقیلہ مفتوح و نون مغنونہ ساکن و بای موحدہ مفتوح و یای تحتانی ساکن شخصی یا چیزیکہ پیش باشد مفرد مذکر است و چون بای موحدہ را مکسور کردہ با یای تحتانی معروف آرند جمع مذکر میشود و ہرگاہ لبعد بای موحدہ مفتوح ہمزہ ملینہ مکسور و یای تحتانی معروف آرند و وڑنبئی گویند مونث میشود مفرد و جمع یعنی زنانیکہ پیش باشند یا چیزہائیکہ مونث خواندہ میشود -

فصل الواو مع الزاء المنقوطہ -

وزر - بواو و زای منقوطہ ہر دو مفتوح و رای مہملہ ساکن پر مرغ را گویند لفظ مذکر است بر مفرد و جمع مستعمل -

فصل الواو مع الزاء العجمی ۔

وژلل ۔ بواو مفتوح و زای عجمی ساکن و دو لام مفتوح و ساکن بمعنی کشتن و قتل کردن مصدر است ۔

فصل الواو مع السین المهمله ۔

وسله ۔ بواو مفتوح و سین مهمله ساکن و لام مفتوح و ہاء ظاہر بمعنی سلاح مفرد مونث است و چون لام را مکسور کرده با یاء مجہول آرند و وسلی گویند جمع مونث میشود ۔

فصل الواو مع الشین المنقوطه ۔

وشته ۔ بواو مفتوح و شین منقوطه ساکن و تاء فوقانی مفتوح و ہاء مختفی خوش طبعی را گویند مفرد مونث است و چون تاء فوقانی را مکسور کرده با یای مجہول آرند و وشتی خوانند جمع مونث میشود یعنی خوطبعہا ۔

فصل الواو مع الکاف العجمی ۔

وگی ۔ بواو مفتوح و کاف عجمی مفتوح و تحتانی ساکن خوشه پر غله را گویند از قسم ہر غله که باشد مفرد مذکر است و چون کاف عجمی را مکسور کرده با یای معروف آرند جمع مذکر میشود، وگی بواو مضموم و کاف عجمی مفتوح و یاء تحتانی ساکن گرسنه را گویند مفرد مذکر است و چون کاف عجمی را مکسور کرده با یاء معروف آرند جمع مذکر میشود و ہرگاه کاف عجمی را مکسور کرده با یای مجہول آرند مونث میشود مفرد و جمع ۔

وگڑی ۔ بواو و کاف عجمی ہر دو مفتوح و راء ثقیله مفتوح و یاء ساکن مخلوق و خلق را گویند ۔

مفرد مذکر است وچون رای ثقیله را مکسور کرده با یای تحتانی معروف آرند
جمع مذکر میشود یعنی مخلوقات -

فصل الواو مع لام -

ولی - بواو مفتوح ولام مکسور ویای مجهول بمعنی لیکن وچیرا بهردو معنی مستعمل -
ولی بواو مضموم ولام مکسور و یای تحتانی مجهول بمعنی گداز کی مانند گداختن
برف ومثل آن -

ولل - بواو ساکن ولام مضموم ولام ساکن بمعنی شوئیدن که بهندی وہونا خوانند
مصدر است -

ولاڑ - بواو ولام هردو مفتوح والف وراء ثقیله موقوف بمعنی استاده بجای مذکر
میخوانند مفرد وجمع وچون رای ثقیله را مفتوح کرده باهای مختفی آرند و
ولاڑہ گویند جمع مونث میگردد -

ولاڑیدل - بواو لام هردو مفتوح والف وراء ثقیله مکسور ویاء تحتانی مجهول ودال
مهمله مفتوح ولام ساکن بمعنی استادن مصدر است -

فصل الواو مع النون

ونه - بواو مضموم ونون منونه مفتوح وهاء مختفی درخت را گویند مفرد مونث است
چون نون را مکسور کرده با یای مجهول آرند وونی گویند جمع مونث میشود
یعنی درخت ها -

1

Diwan Mahabat
in the Pashto Language

The Gift of the Author Nawáb Mahabat Khán (Eldest Legitimate son of the celebrated Háfiz Rehmat Khán Ruhelah) to Gore Ouseley –

Lucknow 1st October 1801 –

دیوان محبت در زبان پشتو

تصنیف نواب صاحب مشفقی کرم فرما نواب محبت خان پسر نواب حافظ رحمت خان مرحوم از دست مصنف باینجانب مرحمت شد

رقیمه گور اوزلی

نمونه غزلیات (پشتو)

ردیف الالف

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الهي آه و ناله دَ محبت را
اور دَ میني پر کاله دَ محبت را

لکه گل نعیم دَ عشق یې ځگر خون کړه
داغ پرزړه لکه لاله دَ محبت را

تشنه لب دَ مي دَ میني هر نفس یم
په کرم یو پیاله دَ محبت را

په تعلیم دَ میني زړه مي معلم کړه
ولوستن ته رساله دَ محبت را

صید دَ عشق پد امي را وله له فضله
پکمند کښې غزاله دَ محبت را

په نعمت دَ عاشقي مي بهره ياب کړه
له احسانه نواله دَ محبته را

په شلو طرف مي کړه مينه محيطه
دَ قمر پښتان هاله دَ محبتِ را

سر تر پايه دَ هوس له زمستانه
سره ريږدم دوشاله دَ محبت را

بي له عشقه په بل حرف مي گويا مکړه
تل په ژبه مقاله دَ محبته را

چه قبول مي محبت کړ خداونده
نور پلاس کښيږي قباله دَ محبت را

وله

توده په کونين کښي دي بازار دَ محبت ستا
څکه ثقلين ديے خريدار دَ محبت ستا

غوارم نه جنت نه ي ميويے نه ي گلونه
شي که مي روزيے ښکلي گلزار دَ محبت ستا

شغل دَ خپل عشق دَ کار عطا کړیے خما خدایه
هر ساعت مشغول وسم په کار دَ محبت ستا
زړه مے کړو دَ کاره دَ خپل عشق په نشه مست کړه
مے غواړم له تا نه په تلوار دَ محبت ستا

دم پدم طلب کوم ساعت په ساعت غواړم
زه چه په هر آن یم طلبکار دَ محبت ستا
هسي بیماري دَ خپلي مینې را عطا کړه
روغ نه شم هیچري زه بیمار دَ محبت ستا
پرانزه دَ عشق دروازه خپله چه باریاب شم
زه هم درباري یم دَ دربار دَ محبت ستا
رسم به منزل ته دَ مقصود په یو قدم کښیے
خو چه سنبهي مي کینبوي په لار دَ محبت ستا
رنځ دَ محبت چه نه دارو نه ي دواشته
غواړي محبت هم دا آزار دَ محبت ستا

په کرم د محمد دي په هر حال نګاه خما

زه ګدای د محمد یم محمد دي شاه خما

چه امت د محمد یم که هر څو یم تباه حال

محمد به کله و کوري احوال تباه خما

بي بارانه د رحمت مي که هر څو شو وچ واښه

محمد به بیا سرسبز کاندا وچ ګیاه خما

که شیطان و نفس بیا کړه لکه شرخ غابښ تیره

په لمن د محمد دي په هر آن پناه خما

ګمراه نه یم چه بیلي لاري واچوا قدم خما

چه شاه راه د محمد دي هم هغه دي راه

که لښکري تولئی د غم هر وخت راباندي هر

دي فضلونه په هر دم د محمد سپاه خما

زه اول له خدایه غواړم په زړه عشق د محمد

محمد به کا د خدای له عشقه زړه اګاه خما

چه ملاح يې دَ اولادېم بر طرف به شي عصيان

چه دوستدارې دَ اصحاب يم دور به شي گناه ځما

چه لرمه دَ نامه يې محبت محبت

محمد محمد وِرد دَې هر سبا بېګاه ځما

ضمیمہ دوم

سلسلۂ نسل نواب محبت خاں محبتؔ

سلسلۂ نسل نواب محبت خاں
علی اکبر خاں
حیدر علی خاں
منصور خاں
شمس الدین خاں
محمد یوسف خاں
خضر خاں
خدا یار خاں
لطف اللہ خاں
غیرت خاں
سعادت خاں
کاظم علی خاں
عابد علی خاں
قمر الدین خاں
احمد حسن خاں
نیاز علی خاں
جعفر علی خاں
نظام علی خاں
علی احمد خاں
سعید الدین خاں
امداد اللہ خاں
سعد اللہ خاں
عنایت اللہ خاں
علی محمد خاں
مظفر علی خاں
سلیمان خاں
مستقیم خاں
سلطان محمد خاں
نواب بہادر خاں
حبیب اللہ خاں
خلیل اللہ خاں

کتابیات

کتابیات

(۱) آزاد محمد حسین، مولانا: "آبِ حیات"، لاہور، ۱۹۵۷ء۔

(۲) آغا مہدی، سید: "تاریخ لکھنؤ"، کراچی، جمعیت خدام عزا، ۱۹۷۶ء۔

(۳) آفتاب احمد خاں: "آنولہ کی مختصر تاریخ"، بریلی، الیکٹرک پریس، سنہ (ندارد)

(۴) ادیب، ڈاکٹر لطیف حسین: "چند شعرائے بریلی"، طبع اول، لکھنؤ، تنویر پریس، ۱۹۷۶ء۔

(۵) اسد، سلیمان خاں: "نقش سلیمانی"، مطبوعہ ٹونک، ۱۹۰۷ء۔

(۶) افسر صدیقی امروہوی: "مصحفی حیات و کلام"، طبع اول، کراچی، مکتبۂ نیا دور، ۱۹۵۷ء۔

(۷) الطاف علی بریلوی، سید: "حیات حافظ رحمت خاں"، طبع ثالث، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۸۰

(۸) ایاز، شیخ (مترجم): "رسالہ شاہ لطیف"، اشاعت دوم، جام شورو، انسٹی ٹیوٹ آف سندھالاجی، ۱۹۷۷ء

(۹) جمیل جالبی، ڈاکٹر: "تاریخ ادب اردو"، جلد دوم، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۲ء۔

(۱۰) حسرت موہانی: "دیوان حسرت"، طبع اول، علی گڑھ، مطبع احمدی، سنہ ندارد

(۱۱) حسن دہلوی، میر: "تذکرہ شعرائے اردو"، طبع اول، مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۰ء۔

(۱۲) حیدر بخش حیدری: "گلشن ہند"، مرتبہ مختار الدین احمد، دہلی، علمی مجلس، ۱۹۶۷ء۔

(۱۳) خان رشید، ڈاکٹر: "اردو کی تین مثنویاں"، طبع دوم، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء۔

(۱۴) درد، خواجہ میر: "دیوانِ اردو"، لاہور،

(۱۵) سکسینہ، رام بابو: "تاریخ ادب اردو"، مترجمہ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، نولکشور پریس، ۱۹۲۹ء۔

(۱۶) سودا، محمد رفیع: "کلیات سودا"، کانپور، نولکشور پریس، ۱۹۱۶ء۔

(۱۷) شبلی نعمانی: "شعر العجم"، حصہ پنجم، لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۷۲ء۔

(۱۸) شوق، قدرت اللہ: "طبقات الشعراء"، نثار احمد فاروقی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء۔

(۱۹) شیخ چاند: "سودا"، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۳ء۔

(۲۰) شیفتہ، نواب مصطفیٰ خاں: "گلشنِ بے خار"، مترجمہ محمد احسان فاروقی، طبع اول، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۲ء۔
(۲۱) شیو لال: "لولوئے از غیب"، اشاعت اول، مرتبہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۳ء
(۲۲) صفا، عبد الحئی بدایونی: "تذکرہ شمیم سخن"، جلد اول و دوم، مراد آباد، الہند پریس، ۱۸۹۱ء۔
(۲۳) عامر فاروقی: "اصغر گونڈوی: ایک جائزہ"، حیدر آباد، رفیق گھر، سنہ (ندارد)
(۲۴) عبد القادر رامپوری: "وقائع عبد القادر خانی" جلد اول و دوم، (اردو ترجمہ موسومہ "علم و عمل") مترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی، مرتبہ محمد ایوب قادری، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۰ء۔
(۲۵) عبد القادر سروری: "اردو مثنوی کا ارتقا"، حیدر آباد دکن، ادارۂ ادبیاتِ اردو، ۱۹۴۰ء۔
(۲۶) عبد اللہ، ڈاکٹر سید: "طیفِ غزل"، طبع ثانی، لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۵ء۔
(۲۷) عروج، عبد الرؤف: "تذکرہ فارسی گو شعرائے اردو"، کراچی انجمن پریس، ۱۹۷۱ء۔
(۲۸) علی لطف، مرزا: "گلشنِ ہند"، مرتبہ شبلی نعمانی و عبد اللہ خان، حیدر آباد دکن، کتب خانہ آصفیہ، ۱۹۰۶ء
(۲۹) غالب، اسد اللہ خاں: "دیوانِ غالب اردو"، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۵ء۔
(۳۰) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: "اردو کی منظوم داستانیں"، طبع اول، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۱ء۔
(۳۱) فرینکلن: "تاریخ شاہ عالم"، مترجمہ ثناء الحق صدیقی، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۷ء۔
(۳۲) قاسم، میر قدرت اللہ: "مجموعۂ نغز"، مرتبہ محمود شیرانی، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۳۳ء۔
(۳۳) قانع ٹھٹوی، میر علی شیر: "تحفۃ الکرام"، مترجمہ اختر رضوی، طبع اول، کراچی، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۵۹ء
(۳۴) کمال الدین حیدر حسینی: "قیصر التواریخ"، جلد اول، لکھنؤ، نولکشور پریس، ۱۹۰۷ء۔
(۳۵) مجنوں گورکھپوری: "نکاتِ مجنوں"، الہ آباد، اسرار کریمی پریس، ۱۹۵۷ء۔
(۳۶) محمد احد علی: "مرقع اودھ"، لکھنؤ، نولکشور الناظر پریس، سنہ (ندارد)
(۳۷) محسن لکھنوی: "سراپا سخن"، لکھنؤ، نولکشور پریس، ۱۸۶۰ء۔

(۳۸) مصحفی، غلام ہمدانی: "تذکرہ ہندی"، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء۔

(۳۹) مصطفیٰ علی بریلوی: "ہندوستان کے بنگش پٹھان"، کراچی، انجمن احباب فرخ آباد، سنہ (ندارد)

(۴۰) میر تقی میر: "کلیاتِ میر"، مرتبہ عبدالباری آسی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء۔

(۴۱) نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر: "سسی پنوں"، (بزبان سندھی) اشاعت اوّل، حیدرآباد، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۱ء

(۴۲) نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر: "سندھی ٻولیءَ ادب جی مختصر تاریخ"، طبع دوم، حیدرآباد، زیب ادبی مرکز ۱۹۸۰ء۔

(۴۳) نجم الغنی رامپوری: "اخبار الصنادید"، جلد اوّل، لکھنؤ، نولکشور پریس، ۱۹۱۸ء۔

(۴۴) نساخ، عبدالغفور: "سخن شعراء"، لکھنؤ، نولکشور پریس، ۱۸۷۴ء۔

(۴۵) نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر: "دلی کا دبستان شاعری"، طبع دوم، کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۶ء۔

(۴۶) ولی اللہ فرخ آبادی، مفتی: "عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ"، مترجمہ حکیم شریف الزماں شریف اکبرآبادی، مرتبہ محمد ایوب قادری، کراچی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۵ء۔

(۴۷) وحید الدین سلیم: "افاداتِ سلیم"، لاہور، ناشر، فرمان علی، سنہ (ندارد)۔

(۴۸) ہندی بھگوان داس: "سفینۂ ہندی"، مرتبہ عطا کاکوی، پٹنہ، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، ۱۹۵۸ء

(۴۹) ہوش، نواب نیاز احمد خاں: "تاریخ روہیل کھنڈ"، بریلی، ۱۸۶۶ء۔

قلمی کتب

(۵۰) جرأت، قلندر بخش: "کلیاتِ جرأت" (قلمی)، کراچی، مخزونہ قومی عجائب گھر۔

(۵۱) حسرت، جعفر علی: "دیوانِ حسرت"، اول، (قلمی)، کراچی " " " ۔

(۵۲) خلیل، علی ابراہیم خاں: "تذکرہ گلزارِ ابراہیم" (قلمی)، کراچی " " " ۔

(۵۳) محبت خاں، نواب: "دیوانِ اردو" (قلمی)، لندن، مخزونہ انڈیا آفس لائبریری، (عکسی نقل مخزونہ اردو لغت بورڈ کراچی)۔

(۵۵) محبت خاں، نواب: "مثنوی اسرارِ محبت"، (قلمی)، کراچی، مخزونہ قومی عجائب گھر۔
(۵۵) محبت خاں، نواب: "ریاض المحبت"، (قلمی)، "پشتو فارسی لغت"، لندن برٹش میوزیم۔
(۵۶) محبت خاں، نواب: "دیوانِ محبت پشتو"، (قلمی)، آکسفورڈ، بوڈلین لائبریری۔

رسائل

(۵۷) رسالہ "العلم کراچی"، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۶ء (مقالہ سید لطیف حسین ادیب بعنوان "نواب محبت خاں محبت اور مثنوی اسرارِ محبت")
(۵۸) رسالہ "رہنمائے تعلیم لاہور"، جوبلی نمبر ۱۹۳۱ء۔ (مقالہ قاضی فضل حق بعنوان "سسی پنوں")۔
(۵۹) رسالہ " " ، ستمبر ۱۹۶۷ء (مقالہ نادم سیتاپوری بعنوان "لکھنؤ کے چند مشاعرے")۔
(۶۰) " "مجلہ عثمانیہ"، شمارہ، سوم وچہارم، جلد ہشتم۔ (مقالہ محمد اعظم خاں، اودھ میں اردو شاعری کی ابتدا
(۶۱) " مجلہ "معارف اعظم گڑھ"، شمارہ ۲-۳-۴، جلد نمبر ۹۶، بابت فروری، مارچ، اپریل۔
(مقالہ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب بریلوی بعنوان "روہیلوں کے دور میں اردو شاعری کا فروغ")۔
(۶۲) " "نگارِ پاکستان"، کراچی، بابت اگست، ستمبر، ۱۹۵۸ء۔
(۶۳) "نگارِ پاکستان"، کراچی، بابت اگست ۱۹۶۷ء (مقالہ سید محمد باقر شمس لکھنوی بعنوان، "آصف الدولہ کا عہد اور لکھنؤ کی زبان و شاعری")
(۶۴) " "نگار پاکستان"، کراچی، شمارہ بابت جولائی، ۱۹۶۹ء۔ (مقالہ بعنوان "سرزمین سندھ کی ایک تاریخی کہانی سسی پنوں")
(۶۵) "نگارِ پاکستان"، کراچی، شمارہ ۵ بابت نومبر ۱۹۶۹ء۔
(مقالہ سید باقر شمس لکھنوی بعنوان "غازی الدین حیدر کا عہد اور لکھنؤ کی زبان و شاعری"
(۶۶) "نگار پاکستان"، شمارہ جنوری ۱۹۳۵ء۔ (مقالہ علامہ نیاز فتح پوری بعنوان وہ مشہور شعراء جو اودھ یا لکھنؤ میں پیدا ہوئے")۔

(۶۷) "نگار پاکستان" ، جنوری ۱۹۳۵ء - (مقالہ علامہ نیاز فتح پوری بعنوان ("لکھنؤ کی شاعری ، لکھنؤ اسکول کے قیام سے قبل یعنی اودھ کا سب سے پہلا جذبات نگار شاعر نواب آصف الدولہ")

(۶۸) رسالہ "نگار پاکستان" ، غالب نمبر ، شمارہ ۱-۲ - ۱۹۶۹ء -
(مقالہ نیاز فتح پوری بعنوان "فارسی گو شعراء میں غالب کا مرتبہ")